دوشیزہ

April 2016

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

افسانے

رنگِ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا' افریقہ' یورپ......5000 روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی
Phone : 021-35893121 - 35893122
Email : pearlpublications@hotmail.com
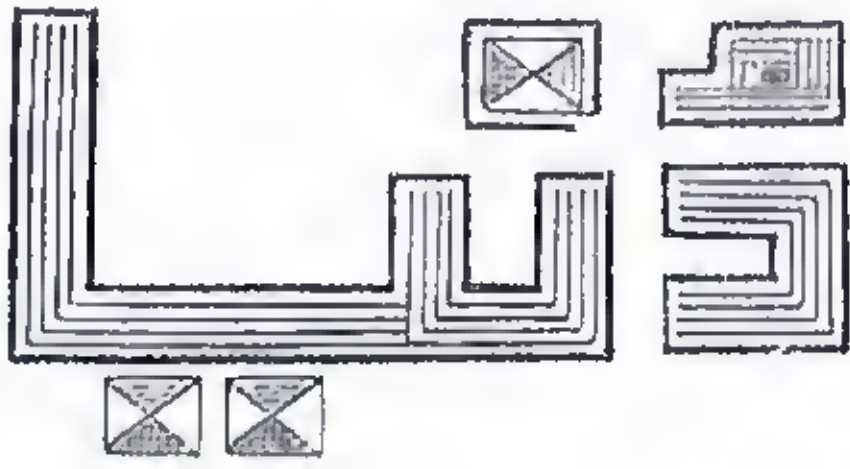
اس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز: 88-C II، فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز-7، کراچی

فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

گلشن پھر اُجڑ گیا

آتی بہار اس بار پھر پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، مٹی کی سوندھی مہک اور تازگی بخشتی بادِ نسیم کے علاوہ سب کچھ لے آئی۔ فضا میں بارود کی بُو، لہولہو میرا لاہور اور جابجا بکھرے جگر کے ٹکڑے۔

دشمن پھر بازی لے گیا۔ ابھی آرمی پبلک اسکول کا زخم ہی نہیں بھرا تھا کہ ایک اور زخم ...... بدن تو عرصے سے چُور چُور ہے ہر زخم سے لہو کے ساتھ حکمرانوں اور ذمہ داروں کی بے حسی پیپ بن کر بہہ رہی ہے۔ ان لوگوں سے کسی اچھائی کی امید کرنا بے کار ہے جو خود تو محافظوں کے جھرمٹ میں چلتے ہیں اور بے چارے عوام کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ بلکہ اب تو ایک نیا چلن دیکھنے میں آرہا ہے کہ پارٹی لیڈر خواتین کمانڈوز کی حفاظت میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ جن سیاست دانوں کی حفاظت صنفِ نازک کرے ایسے ملک میں پھر مائیں اپنی اولاد کو اپنے بطن میں ہی چھپالیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ دنیا میں آنے کے بعد تو وہ جلد یا بدیر گوشت کے لوتھڑے میں ہی تبدیل کردیے جائیں گے یا پھر اللہ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ اللہ ہماری اولادوں کو حکمرانوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

منزہ سہام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت

رابطوں کی دلفریب محفل

دوشیزہ کی محفل میں شرکت کرنے والی اور محفل پڑھنے والی تمام پیاری پیاری لڑکیوں کو سیرا محبت اور مان بھرا اسلام...... اور حضرات کو دعائیں، آپ لوگوں کی آراء خطوط کی شکل میں موصول ہو رہی ہے اور انہیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے محنت ٹھکانے لگی۔ میں آپ سب کی توجہ کی دل سے ممنون ہوں۔ میری یہاں اپنے نئے لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ آسان اور عام فہم الفاظ استعمال کریں۔ مشکل الفاظ سے انداز و بیاں پر اثر نہیں پڑتا مگر پڑھنے والوں کو ضرور اُلجھن ہوتی ہے۔ خاص طور سے میں بیٹے منعم تمہیں کہوں گی کہ متروک الفاظ استعمال مت کرو۔ اچھی اور سلیس زبان میں لکھا گیا افسانہ زیادہ پسند کیا جاتا ہے ہماری بھی یہی کوشش ہے کہ نئی پود جس کی اردو کافی کمزور ہے اردو زبان سے دور نہ بھاگے لہٰذا مشکل اور متروک الفاظ سے گریز ضروری ہے۔ آیئے اب چلتے ہیں پہلے خط کی جانب لاہور سے بہت دنوں بعد تشریف لائی ہیں شاہدہ ناز قاضی صاحبہ لکھتی ہیں پیاری منزہ سہام السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ بہت عرصہ ہوگیا رسالہ پچر آپ کے دفتر سے موصول نہیں ہو رہا۔ میں نے تین ماہ انتظار کے بعد یہ خط لکھا ہے۔ میں اپنی کتاب 'رگ جاں سے بھی زیادہ قریب تر' آپ کو بھجوا رہی ہوں۔ یہ پہلی کتاب کا والیم 'II' ہے۔ یہ سچے واقعات پر مشتمل ہے اور آپ کو انشاء اللہ بہت پسند آئے گی۔ افسانہ لکھا پڑا ہے۔ مصروفیت اور سماجی مصروفیت نے زندگی کے شب روز کو جکڑ رکھا ہے۔ دوشیزہ سے پیار کا رشتہ ہے۔ جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ بھلے کچھ عرصہ ہوگیا ہو۔ لیکن ذہن کے ایک گوشے میں ایک نام گونجتا رہتا ہے۔ دوشیزہ' رخسانہ بہن' منزہ سہام' یہ تکون' ہمیں باندھے رکھتی ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد ضرور رائے سے آگاہ کیجیے گا۔ آپ کی رائے میرے لیے بہت قیمتی ہوگی۔ سب خوبصورت دل والے اور والیوں کو جو دوشیزہ کے ہمرکاب ہیں میرا اسلام پہنچے۔

✍: شاہدہ جی! کئی بار آپ کو فون کیا مگر رابطہ نہ ہوسکا۔ پرچہ آپ کے ایڈریس پر پابندی سے ارسال کیا جائے گا کتاب مل گئی۔ بہت شکریہ، مگر مجھے آپ کے افسانے کا انتظار ہے۔

✉: اور یہ ہیں کراچی سے ہماری اور آپ سب کی رفعت سراج لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! یہ وہ خط ہے

جس کی پلاننگ یا تصور گزشتہ چودہ ماہ سے اعصاب پر حاوی ہے۔ مگر منیر تو ہمیشہ دیر کر دیتا ہے۔ آپ کہیں گی خط آپ نے لکھنا تھا یا منیر صاحب نے؟ بھئی میں بھی تو آخر منیر کی نصف بہتر ہوں۔ صحبت کا اثر نہیں ہوتا کیا؟ بہرطور پرچہ ملتا ہے مطالعہ کرتی ہوں۔ سب سے پہلے تو ظاہر ہے محفل ہی پڑھتی ہوں اور بہت لطف اندوز ہوتی ہوں۔ اس مرتبہ خط لکھنے کا سہرا دردانہ نوشین خان کے سر جاتا ہے۔ دردانہ ہمعصر رائٹرز میں وہ رائٹر یا مصنفہ ہیں جن کی تحریر پڑھنے میں، میں نے کبھی تساہل نہیں برتا۔ دردانہ کی قابلیت' خداداد صلاحیت کی میں بہت بڑی قدر دان ہوں۔ اس مرتبہ دردانہ نے نو آموز قلمکاروں کو جن گراں مایہ مشوروں سے نوازا وہ مشورے دینے کے لیے میں کب سے مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی کہ ذرا آرام سے خط لکھوں گی مگر آرام نے کہ مل کر نہ دیا۔ میں دردانہ کے مشوروں سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں اور سمجھتی ہوں ان مشوروں پر عمل پیرا ہو کر نئے قلمکار بہت معتبر قلمکاروں میں شمار ہونے لگیں گے۔ انشاء اللہ..... دوسری اہم بات کمپوزنگ کی خوفناک غلطیاں.....

میں خدا لکھتی رہی وہ جدا پڑھتے رہے
ایک نقطے نے محرم سے مجرم بنادیا

اس مرتبہ میری شامت آئی تھی میں نے ایک فقرہ انگریزی میں لکھ دیا۔ **Say Yes** ''**Boss And Command**'' جی سر کہتے رہو اور آگے آگے چلتے رہو۔ (نوکر شاہی) یا اپنی چلاتے رہو۔ کمپوزر نے **In Command** لکھ کر میری تدریسی حیثیت یکسر مشکوک بنادی ہے۔ مجھے کسی کی فکر نہیں فکر ہے تو دردانہ کی جن کو اس جملے سے کتنی ذہنی اذیت پہنچی ہوگی۔ میں انگریزی فقرے استعمال کرنے سے حتیٰ الامکان احتراز کرتی ہوں کیونکہ ان کے بغیر بھی اچھا خاصا کام چلتا ہے۔ کمپوزنگ کی بے شمار غلطیاں ہر ماہ اپنے ناول کی قسط میں دیکھتی ہوں۔ کمپوزر کی استعداد سے بڑھ کر کچھ لکھا ہے تو وہ ایڈیٹر سے رابطہ کر کے اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔ خدا کے لیے اس طرف توجہ دیجیے۔ بہت قیمتی جملے ذبح ہو جاتے ہیں۔ یا تو معنی بدل جاتے ہیں یا جملہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ شہناز انور شفاء کی زہریلی کو ایوارڈ مل گیا۔ شہناز کو دلی مبارکباد مگر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ شہناز نے ایک مشکل موضوع کو کمال مہارت سے کہانی کے قالب میں ڈھالا۔ حسد کو لفظوں میں اس طرح بیان کرنا کہ ہر 'متاثرہ' کو اپنی ہی کوئی روحانی اذیت یاد آجائے بڑی بات ہے۔ میں امید کرتی ہوں شہناز بہت جلد کوئی اور موثر کہانی لے کر ہمارے درمیان ہوں گی۔ انشاء اللہ..... باقی یہ کہ پھر کسی خاص بات کی وجہ سے حاضری لگاؤں گی۔ بچوں کو پیار بڑوں کو سلام۔

☜: سوئٹ سی رفعت! آپ کا شکوہ سر آنکھوں پر مگر یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ ایک غلطی آپ کی تدریسی حیثیت مشکوک کر دے گی۔ کمپوزر صاحب بھی شاید اب کچھ مجھ پر رحم کھالیں۔ محفل میں آتی رہا کریں۔ چراغاں سا ہو جاتا ہے۔

✉: راولپنڈی سے خالد نذیر صاحب تشریف لائے ہیں، لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! کافی عرصے کے بعد دوشیزہ کی محفل میں شامل ہو رہا ہوں۔ فروری کے شمارے کو ہی کسی حد تک پڑھ پایا ہوں۔ مارچ کا

شمارہ شاید ابھی اپ لوڈ نہیں کیا۔ خیر دوشیزہ کی محفل میں بہت سارے نئے پرانے چہرے نظر آ رہے ہیں۔ اللہ پاک اِن سب کو ہر قسم کی آفات و بلیات سے بچائے۔ میری دوشیزہ سے آشنائی غالباً اُس وقت سے ہے جب اس میں سہام مرزا 'ہلکے پھلکے، سب کے پھلکے' لکھا کرتے تھے اور یہ غالباً 1979ء کی بات ہے اُس وقت جو پرانے لکھنے والوں میں تواتر سے چھپ رہے ہیں اُن میں نگہت سیما' شمیم فضل خالق اور وردانہ نوشین خان ہیں۔ اللہ پاک اِن کے قلم کی جولہ نیاں قائم و دائم رکھے۔ باقی افراد سید علی ارسلان' طارق رشید بوبی' نسرین قریشی' زاہد پروین (ڈگری سندھ) حمیرا راحت' فرحت ظفر' شہاب ظفر' محمد شعیب رحمانی' لکھنے لگوں تو ایک فہرست مرتب ہوجائے۔ نجانے کہاں ہیں اگرچہ دوشیزہ میں ہمارا رابطہ کبھی تسلسل سے نہ رہا لہٰذا پرانے لکھاریوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ آئیں اور لکھیں، ہم اُن کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ عابدہ رؤف کے افسانے 'تیری بھوک' نیلا دوپٹہ' ڈھیل' جو یاد آ رہے ہیں۔ ان افسانوں کی کیا بات تھی۔ ذہن میں نقش ہوکر رہ گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے 1999-2000ء کی بات ہے جب 'رائٹرز ایوارڈ' تقریب میں لیفٹیننٹ جنرل معین الدین حیدر کے دست شفقت سے اپنے افسانے 'تہی داماں' پر ایوارڈ وصول کیا تھا۔ سہام مرزا اس محفل کے کیسے روح رواں بنے ہوئے تھے۔ یقین کریں پرل کانٹی نینٹل میں جس طرح وہ اِدھر سے اُدھر ہر ایک کا دھیان' خیال رکھ رہے تھے وہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے۔ نہایت نفیس' رکھ رکھاؤ والے اور دھیرے دھیرے بولنے والے' کیا کچھ نہیں تھا اس شخص میں۔ اللہ پاک اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ محترمہ گل صاحبہ اِس دنیا سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ بہت اچھی افسانہ نگار اور شاعرہ تھیں۔ باقی آپ کی ہمتوں کو ڈھیروں سلام کہ اپنے والدین کے لگائے ہوئے ننھے سے پودے کو (جو کہ اب ایک تناور درخت کی حیثیت اختیار کرگیا ہے) جس طرح آندھیوں اور طوفانوں کو جو کہ وقت کی چاپ کے ساتھ دوشیزہ کے راستے میں آئے اور اس پودے کو بچا کے رکھا یہ آپ کی ہمت ہے۔ مجھے محسن بھوپالی صاحب یاد آ رہے ہیں۔ جو میری غزلوں اور نظموں کو دوشیزہ کی محفل میں سجاتے رہے ہیں۔ میری طرف سے ادارے کے تمام اراکین کو سلام و دعا۔ خط مختصر کررہا ہوں اور آفس میں بیٹھا لکھ رہا ہوں انشاء اللہ زندگی رہی تو دوبارہ بھی اتنی اچھی محفل میں آئیں گے۔ نظم ارسال خدمت ہے اچھی لگے تو کسی کونے میں لگا دیجیے گا۔

ھ: خالد صاحب میں تو چاہتی ہوں کہ پرانے لکھنے والے پابندی سے دوشیزہ میں چھپتے رہیں۔ آپ اپنی قیمتی رائے سے مجھے ضرور نوازیئے گا۔ نئے لوگوں کو ہمیشہ پرانے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تبھی اُن کی تحریروں میں بھی نکھار آتا ہے اور زندگیوں میں بھی، میں آپ کا دوشیزہ کی محفل میں انتظار کروں گی۔

✉: کراچی سے ہی عائشہ صدیقہ صاحبہ تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں۔ کاشی چوہان صاحب، السلام علیکم! گزارش ہے کہ میں اپنا ایک افسانہ 'مجھے آپ پسند نہیں' ارسال کررہی ہوں امید ہے آپ کو پسند آئے گا اور آپ جلد شائع کرکے شکریہ کا موقع فراہم کرینگے۔ یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں سچی کہانیاں ڈائجسٹ کی پرانی لکھاری ہوں گو جلدی جلدی نہیں بھیجتی مگر جیسے 'انسان بکتے ہیں' کے بعد بھیج

شمارہ شاید ابھی اپ لوڈ نہیں کیا۔ خیر دوشیزہ کی محفل میں بہت سارے نئے پرانے چہرے نظر آرہے ہیں۔ اللہ پاک اِن سب کو ہر قسم کی آفات و بلیات سے بچائے۔ میری دوشیزہ سے آشنائی غالباً اُس وقت سے ہے جب اس میں سہام مرزا 'ہلکے پھلکے، سب کے پھلکے' لکھا کرتے تھے اور یہ غالباً 1979ء کی بات ہے اُس وقت جو پرانے لکھنے والوں میں تواتر سے چھپ رہے ہیں اُن میں نگہت سیما' شمیم فضل خالق اور دردانہ نوشین خان ہیں۔ اللہ پاک اِن کے قلم کی جولہ نیاں قائم و دائم رکھے۔ باقی افراد سید علی ارسلان' طارق رشید بولی' نسرین قریشی' زاہد پروین (ڈگری سندھ) حمیرا راحت' فرحت ظفر' شہاب ظفر محمد شعیب رحمانی' لکھنے لگوں تو ایک فہرست مرتب ہوجائے۔ نجانے کہاں ہیں اگرچہ دوشیزہ میں ہمارا رابطہ کبھی تسلسل سے نہ رہا لہٰذا پرانے لکھاریوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ آئیں اور لکھیں، ہم اُن کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ عابدہ رؤف کے افسانے 'تیری بھوک' نیلا دوپٹہ' ڈھیل' جو یاد آرہے ہیں۔ ان افسانوں کی کیا بات تھی۔ ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے 1999-2000ء کی بات ہے جب 'رائٹرز ایوارڈ' تقریب میں لیفٹیننٹ جنرل معین الدین حیدر کے دست شفقت سے اپنے افسانے 'تہی داماں' پر ایوارڈ وصول کیا تھا۔ سہام مرزا اس محفل کے کیسے روح رواں بنے ہوئے تھے۔ یقین کریں پرل کانٹی نینٹل میں جس طرح وہ اِدھر سے اُدھر ہر ایک کا دھیان' خیال رکھ رہے تھے وہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے آرہا ہے۔ نہایت نفیس' رکھ رکھاؤ والے اور دھیرے دھیرے بولنے والے' کیا کچھ نہیں تھا اس شخص میں۔ اللہ پاک اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ محترمہ گل صاحبہ اِس دنیا سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ بہت اچھی افسانہ نگار اور شاعرہ تھیں۔ باقی آپ کی ہمتوں کو ڈھیروں سلام کہ اپنے والدین کے لگائے ہوئے ننھے سے پودے کو (جو کہ اب ایک تناور درخت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے) جس طرح آندھیوں اور طوفانوں کو جو کہ وقت کی چاپ کے ساتھ دوشیزہ کے راستے میں آئے اور اس پودے کو بچا کے رکھا یہ آپ کی ہمت ہے۔ مجھے محسن بھوپالی صاحب یاد آرہے ہیں۔ جو میری غزلوں اور نظموں کو دوشیزہ کی محفل میں سجاتے رہے ہیں۔ میری طرف سے ادارے کے تمام اراکین کو سلام و دعا۔ خط مختصر کررہا ہوں اور آفس میں بیٹھا لکھ رہا ہوں انشاء اللہ زندگی رہی تو دوبارہ بھی اتنی اچھی محفل میں آئیں گے۔ نظم ارسال خدمت ہے اچھی لگے تو کسی کونے میں لگا دیجیے گا۔

✍: خالد صاحب میں تو چاہتی ہوں کہ پرانے لکھنے والے پابندی سے دوشیزہ میں چھپتے رہیں۔ آپ اپنی قیمتی رائے سے مجھے ضرور نوازیئے گا۔ نئے لوگوں کو ہمیشہ پرانے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تبھی اُن کی تحریروں میں بھی نکھار آتا ہے اور زندگیوں میں بھی، میں آپ کا دوشیزہ کی محفل میں انتظار کروں گی۔

✉: کراچی سے ہی عائشہ صدیقہ صاحبہ تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں۔ کاشی چوہان صاحب، السلام علیکم! گزارش ہے کہ میں اپنا ایک افسانہ 'مجھے آپ پسند نہیں' ارسال کررہی ہوں امید ہے آپ کو پسند آئے گا اور آپ جلد شائع کرکے شکریہ کا موقع فراہم کریں گے۔ یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں سچی کہانیاں ڈائجسٹ کی پرانی لکھاری ہوں گو جلدی جلدی نہیں بھیجتی مگر جیسے 'انسان بکتے ہیں' کے بعد بھیج

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

مارچ2016 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

بس ایک دعا اقبال بانو

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ اپریل2016

عنوان: ____________________

قلم کار: ____________________

نام: ____________________

پتا: ____________________

طویل کہانی نمبر II

طویل کہانی نمبر کی شاندار پذیرائی کے بعد انشاء اللہ ''سچی کہانیاں'' کا ماہِ مئی کا شمارہ ''طویل کہانی نمبر II'' ہوگا۔

امید ہے ''طویل کہانی نمبر I '' کی طرح ''طویل کہانی نمبر II'' بھی قارئین کی امیدوں پر پورا اترے گا۔

پلیٹ فارم نمبر

یہ زندگی ریل کی دو پٹریوں کی طرح ہے۔ جس پر حق اور باطل ایک ساتھ محوِ سفر رہتے ہیں۔ زندگی ہر موڑ پر ایک پلیٹ فارم پر رُکتی ہے اور پھر...... زندگی کی منزل آ جاتی ہے۔

حق اور باطل کبھی مل نہیں پاتے۔

ایک ایسا یادگار شمارہ جسے قارئین کبھی نہ بھول پائیں گے۔

تلخ و شیریں، عبرت و سبق آموز کہانیوں سے سجا ''سچی کہانیاں'' کا پلیٹ فارم نمبر بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

سچی کہانیاں ماہِ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ہوگا۔

سانحہ ارتحال

ہمارے بہت عزیز لکھاری اور شاعر ساتھی عبدالعزیز جی آ کی والدہ گزشتہ ماہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں عبدالعزیز جی آ کے ساتھ ہے۔اور مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

رہی ہوں۔اس افسانے کا مرکزی کردار عورت کی عزت ہے۔ ہمارے معاشرے میں یوں ہوتا ہے کہ لوگ لڑکی کے گھر رشتے سے پہلے اسے پسند ناپسند کرنے آتے ہیں۔لڑکی والے اُن کی تواضع کرتے ہیں مگر اکثر یوں ہوتا ہے وہ لڑکی میں نقص نکال کر چلے جاتے ہیں۔یہ ایک بہت خراب رویہ ہے۔ورنہ لڑکی کو تو وہ کسی تقریب یا اور کسی ذریعہ سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔اسی طرح وہ کئی کئی گھروں میں جاتے ہیں اور نہ صرف لڑکی بلکہ گھرانے کی بھی توہین کا سبب بنتے ہیں۔میں نے اس میں اس خیال کو پیش کیا ہے کہ لڑکے کو بھی ناپسند کیا جاسکتا ہے۔لڑکے کی طرح لڑکی کو بھی پسند ناپسند کا اختیار ہے۔میں یقین کرتی ہوں آپ بھی میرے خیال سے اتفاق کرینگے۔بہن منزہ سہام اور دوسرے سب کو سلام۔

✍: ڈیئر عائشہ! آپ کا افسانہ مل گیا ہے جلد ہی پڑھ کر آپ کو آگاہ کروں گی۔

✉: یہ آمد ہے کراچی سے ماریا یاسر کی، لکھتی ہیں۔آداب عرض ہے امید ہے منزہ آپی اور باقی سارا اسٹاف خیر خیریت سے ہوگا۔کاشی سر آپ کیسے ہیں؟ آپ کے ایکسیڈنٹ کا مجھے ابھی علم ہوا بہت دکھ ہوا۔اللہ آپ کو اور تمام مسلمانوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے (آمین) اب تو کافی لیٹ ہے لیکن پھر بھی اب آپ کیسے ہیں؟ آج 11 مارچ ہے میں دوشیزہ اور سچی کہانیاں کے لیے یاسر کو دوڑانے ہی والی تھی جب پوسٹ مین نے بیل بجا کے دونوں رسالے میرے حوالے کیے تو خوشی کے مارے جھوم ہی اٹھی۔ آپ کی طرف سے جب رسالہ ملتا ہے تو ایک سہانی سی خوشی مجھے مست کر دیتی ہے۔عجیب سرشاری کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو جس کے انعام میں رسالے بھیجے گئے (حالانکہ اِس ماہ میری کوئی کہانی نہیں چھپی اس کے باوجود آپ نے رسالے بھیجے) اِس کے لیے میں منزہ آپی اور کاشی سر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے بھی یاد رکھا۔اللہ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے آمین۔منزہ آپی سے فون پر بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ رضوانہ آپی آپ کی بُک لانچ ہوئی میری طرف سے بہت مبارکباد۔آپ کا ٹی وی ڈرامہ کہاں تک پہنچا جس کے لیے آپ دوشیزہ سے غیر حاضر ہیں۔جلدی سے واپس آئیں ناں۔ایک بہت ہی ضروری تھینکس کرنا ہے مجھے شگفتہ آپی کا۔انہوں نے جنوری میں چھپنے والی میری کہانی کی تعریف کرکے میرا سیروں خون بڑھایا۔اللہ آپ کو خوش رکھے (آمین) مجھے بہت خوشی ہوئی آپ کا تبصرہ پڑھ کے بے شک نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے۔اب آتے ہیں مارچ کے دوشیزہ کی طرف تو ہمیشہ کی طرح بہت فریش سا لگا۔اس بار سرورق بھی بہت خوبصورت ہے۔ماڈل بہت معصوم لگی۔ ہلکے پھلکے میک اپ نے خوبصورتی کو مزید بڑھا دیا۔افسانوں میں اقبال بانو اور ڈاکٹر الماس روحی کو ہی پڑھ پائی بہت خوبصورت افسانے تحریر کیے آپ دونوں نے۔ابھی اور کچھ نہیں پڑھا اس لیے باقی کے لیے معذرت۔اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ

دنیا میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں

آپ دوشیزہ کے خریدار بن کر ملک کو

زرِ مبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/890 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے 88-C II ۔فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

مبارک باد

ہمارے دیرینہ رفیق ہر دل عزیز، سدا بہار لکھاری محمد سلیم اختر صاحب کی چھوٹی بیٹی جویریہ سلیم کی شادی خانہ آبادی گزشتہ ماہ 18 مارچ کو انجام پائی۔ ادارہ اس پُر مسرت موقع پر سلیم اختر اور ان کے اہلِ خانہ کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

آؤں گی انشاء اللہ تب تک اللہ حافظ۔

ج: ماریہ! رضوانہ کا ڈرامہ کہاں تک پہنچا مجھے اب کچھ کچھ سمجھ آ رہا ہے بہر حال آپ کی مبارکباد اُن تک پہنچا دی گئی ہے۔ شمارے پر بھرپور تبصرہ کیا کرو۔

✉: یہ ہیں ریما نور اور تشریف لائی ہیں شہر قائد سے، لکھتی ہیں۔ ڈیئر ایڈیٹر صاحبان! دوشیزہ کی باادب و بارونق سی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ دوشیزہ سے جڑے تمام ہی لوگوں کو دوشیزہ قارئین، دوشیزہ لکھاری دوشیزہ کو ترتیب دینے والے دوشیزہ کو ہم تک پہنچانے والے بڑا ہی محترم قابل ستائش و قابلِ احترام دوشیزہ اسٹاف آپ سبھی کو ریما نور رضوان کا دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ پیار و خلوص بھرا اسلام، بلاشبہ منفرد لفظوں اور منفرد انداز کے ساتھ منفرد ہوتے ہوئے منفرد پہچان کے ساتھ دوشیزہ فیملی مزاج کیسے ہیں؟ بہت ہی آس، امید، خلوص، چاہت، اعتبار، اعتماد کے ساتھ پیارے دوشیزہ کے دروازے پر دستک دی ہے۔ اپنے پیارے پروردگار سے امید ہے دوشیزہ میرا خلوص، چاہت بھرا ہاتھ تھام لے گا۔ انشاء اللہ دوشیزہ اور میرا ساتھ مثالی ہوگا۔ میں گزشتہ دس سال سے 'ردا ڈائجسٹ' میں لکھ رہی ہوں۔ 'ردا' نے ہی رائٹر کے لقب سے نوازا ہے۔ ردا نے ماشاء اللہ بہت نام، عزت، پہچان دی ہے۔ وہی نام، عزت، پہچان دوشیزہ میں بنانا چاہتی ہوں۔ آگے اللہ کی مرضے بہت ہی چاہت و خلوص، امید، اعتبار کے ساتھ دوشیزہ کی مدیرِ اعلیٰ منزہ سہام صاحبہ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ جس کا جواب انشاء اللہ رضوانہ پرنس دیں گی۔ حق باری تعالیٰ سے قوی امید ہے کہ ناکامی نہیں ہوگی۔ مایوس نہیں کیا جائے گا۔ چاہت اور خلوص بھرا ہاتھ تھام لیا جائے گا۔ آپ کو افسانے بھیج رہی ہوں۔ دوشیزہ کے لیے بہت خوشی ہوگی اگر جواب کے بجائے دوشیزہ کے اگلے شمارے میں مجھ ناچیز کا افسانہ شائع کر کے میرا حوصلہ بڑھایا جائے گا تو۔ میرے خیال میں لکھاری بننا' یہ لکھت پڑھت کا سفر کا یقین کرنا۔ پھر اُس پر چلنا۔ بڑا ہی صبر آزما کام ہے۔ خود کی تخلیق کو کسی ادارے میں بھیجنا۔ بھیجنے کے بعد نماز کی مستقل پابندی اور دعاؤں کا اہتمام کرنا کہ دل بے قرار کو قرار صرف میرا رب العزت ہی دے سکتا ہے۔ دل مضطرب کو سمجھانا اور انگلیوں پر دن گنتے رہنا۔ اِس بات سے بے خبر کہ کسی کے لیے ہمارا لکھا گیا مسودہ قابلِ اہمیت قابلِ غور بھی ہوگا کہ نہیں۔ بالفرض اللہ تعالیٰ نے مسودہ پاس بھی کرا دیا تو شمارے میں کب آئے گا۔ ایسا تو نہیں کہ آج بھیجا اور اگلے ماہ کے شمارے میں کہانی لگی ہو۔ پھر مزید امتحانات مزید آزمائش کا آغاز ہوتا ہے کہ تبصرہ' تنقید' دل چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے دل بڑا کرتے ہوئے بڑی ہی آس امید کے ساتھ دوشیزہ میں آئی ہوں۔ بس شوق لیے جنوں ہے پکی لگن ہے۔ آگے بڑھنے کا حوصلہ ہے۔ انشاء اللہ کامیابی کا سفر بھی طے ہو ہی جائے گا۔ سب سے پہلے میرے مولا کریم کی مرضی ہے کہ کیا میرے

حق میں بہتر ہے میں نہیں جانتیں۔ دوشیزہ میں فقط اک خط ہی لکھنے تک ساتھ رہے گا۔ یا یہ ساتھ مزید آگے بڑھے گا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ میں لکھنے کا ہنر جانتی ہوں تو کیا ہوا کیا پتہ میرے لکھنے کا انداز آپ کو پسند نہ آئے پسند آنا نہ آنا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ کو افسانہ بھیج رہی ہوں۔ اب باری تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے شکر گزار ہوں اپنے رب کریم کی اس کے مرضی کی بغیر یہ قلم کو حرکت دینا تو دور کی بات ہے۔ تھامنا ہی مشکل تھا۔ اپنے خداوند کریم کی رحمت کی طلب گار ہوتے ہوئے کامل یقین ہے کہ میرا مسودہ دوشیزہ کے صفحات پر انشاء اللہ ضرور جگہ بنا پائے گا۔ انشاء اللہ عزوجل۔ ماہنامہ دوشیزہ میں ریما نور رضوان کا نام انشاء اللہ عزوجل ضرور جگمگائے گا۔ بہت ساری دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ انشاء اللہ عزوجل دوشیزہ میں پھر شرکت کروں گی۔ مزید تحریروں کے ساتھ ابھی تو مختصر مسودہ ہے۔ اللہ کے بعد ایڈیٹر صاحبہ نے چاہا تو۔ اس اپنے پن کے ساتھ کہ اپنا اور اپنے سے جڑے ہر فرد واحد کا خاص الخاص خیال رکھیے گا۔ مجھے ریما نور رضوان کو دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ محبت' چاہت، امن کا پیغام ساری دنیا کے لیے۔ ان سطور کے ذریعے پہنچے۔ میڈیا خواہ کوئی بھی ہو۔ سوشل میڈیا یا پرنٹ میڈیا' کتاب سب پڑھتے ہیں۔ کتاب کلچر کو فروغ دیں۔ تعلیم میں ہی بقا ہے۔ کتاب پڑھیے اور باشعور قوم بنیے۔ بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ اللہ نے چاہا تو پھر ملیں گے۔

✍: ڈیئر ریما! آپ نے خط میرے نام لکھا اور دیکھیے جواب بھی میں ہی دے رہی ہوں۔ بالکل آپ بھی دوشیزہ کے قلم قبیلے میں شامل ہوسکتی ہیں۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ افسانہ ارسال کریں اب تک آپ کی کوئی تحریر مجھے نہیں ملی۔

✉: راولپنڈی سے پہلی بار محفل کا حصہ بن رہی ہیں مومنہ صدف، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم محترمہ مدیرہ صاحبہ! امید ہے بخیریت ہوں گی۔ کچھ تعارف اپنے بارے میں کراتی چلوں۔ میمونہ صدف، 2013ء سے خواتین ڈائجسٹ میں لکھ رہی ہوں۔ بہت سے افسانے اور چند ناولٹ، مکمل ناول لکھے ہیں۔ شعاع، خواتین اور کرن کے لیے۔ اپنی دو عام سی تحریروں کے ساتھ دوشیزہ کی خدمت میں پہلی بار حاضری دے رہی ہوں۔ شاید یہ ہمت بھی نہ کر پاتی اگر آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں۔ نظر سے نہ گزرتا تو لکھاری تو میں ہوں۔ دوشیزہ کے لیے بھی اب لکھنا چاہتی ہوں۔ چند گزارشات ہیں میری...... اگر ہوسکے تو مدِ نظر رکھیے گا۔ اگر آپ تحاریر کے بدلے مصنفین کو معاوضہ دیتے ہوں تو مجھے مت بھجوایئے گا۔ میں بلا معاوضہ اپنی صلاحیت مخلوقِ خدا کے لیے پیش کر رہی ہوں۔ ہاں ہر ماہ ڈائجسٹ بھجوا دیجیے تو مہربانی ہوگی۔ جب تک دوشیزہ کے لیے لکھوں گی اس طرح لکھوں گی۔ کہانی قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں جلد لگا دیجیے گا تا کہ میں اگلی تحاریر بھجوا سکوں۔ جو یقیناً مکمل ناول ہی ہوگا۔ آپ کی جانب سے پذیرائی کی منتظر رہوں گی۔ دوشیزہ کے لیے نیک تمنائیں۔

✍: مومنہ صدف آپ کو میں دوشیزہ کی محفل میں خوش آمدید کہتی ہوں۔ اپنی تحریر ضرور ارسال کیجیے۔ یقین ہے کہ آپ کا اور ہمارا ساتھ ہمیشہ بنا رہے گا۔

✉: کراچی سے آئی ہیں خولہ عرفان، لکھتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح نیک خواہشات اور دعاؤں کے

ہم شکل جیسے عظیم ناول کے بعد
ایم اے راحت کا ایک اور معرکتہ الآرا شاہ کار
"زرد لومڑی"
دہکتے ہوئے رخسار، چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں،
دلکش تراش کے بولتے ہوئے خاموش ہونٹ کچھ کہتے ہوئے،
شاخ نازک جیسے لچکتے ہوئے بدن والی حسینہ لیکن لومڑی سے زیادہ چالاک
جس کے نشانے پر آئے ہوئے دشمن اپنی موت یقین کر لیتے تھے
"زرد لومڑی"
جس کے نام سے بڑے بڑے جیالے کانپ اُٹھتے تھے
ایک انوکھے انتقام کی کہانی جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا
انتقام کی ایک ایسی لازوال داستان' جسے قارئین کبھی نہ بھلا پائیں گے
ماہ مئی سے "سچی کہانیاں" کے صفحات پر ملاحظہ فرمایئے

ساتھ حاضرِ محفل ہوں۔ ماہِ مارچ کا شمارہ خوش قسمتی سے اس دفعہ بارہ تاریخ کو دستیاب ہو کر حیران کن خوشی میں مبتلا کر گیا۔ سرورق پر موجود معصوم سی ماڈل دوشیزہ نے ہی دوشیزہ کے اندر کے حال بتا دیے۔ لیکن جب اداریہ زیرِ نظر آیا تو دل میں بجیا کے جانے کا دکھ تازہ ہو گیا۔ آپ کے اداریے کی ہر سطر نہ صرف آپ کی بجو سے بے پناہ محبت کی گواہ ہے بلکہ تمام قارئین و صنفِ ادب سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کے جذبوں کی عکاس ہے۔ اُن کا خلا یقیناً کوئی پُر نہیں کر سکے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بجیا کی مغفرت فرمائے اور ہم سب کو اس عظیم قومی اثاثے سے محرومی پر صبر عطا فرمائے آمین۔ اب کچھ تبصرے کی طرف آتی ہوں۔ منزہ جی خط کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے میرے خط کو قابلِ تعریف سمجھا ورنہ ناچیز فی الحال خود کو کسی زمرے میں نہیں رکھتی اور جناب آپ کہاں اور ہم کہاں ۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ اہلِ زبان و ادب کا موازنہ اہلِ [illegible] سے ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں۔ امید ہے آپ [illegible] ہوں گی۔ منزہ آپ کی محفل میں [illegible] زندگی [illegible] حاضری میں تاخیر ہو سکتی ہے [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

قارئین بہت خوبی سے [illegible] کے افسانے [illegible] [illegible] [illegible] سمجھا گیا ہو اور اس خط کے [illegible] سنبھل کر یہ بھی بتا دوں کہ وہ جتنی اچھی [illegible] تعمیری تنقید نگار بھی۔ اس بات کی میں دل سے معترف ہوں۔ اقبال بانو کا افسانہ بس ایک دعا انداز تحریر انہمار کا لیکن واقعہ کہیں سنا سنا لگا۔ نفیسہ سعید کے ناولٹ جنت حوا کا پہلا حصہ جاندار ہے۔ کہانی اور انداز تحریر دونوں عمدہ ہیں۔ شمع حفیظ نے پیٹ جھڑ سے پہلے میں ایک بے انتہا حساس موضوع کو پوری حساسیت کے ساتھ لفظوں میں سمو دیا ہے۔ غربت کے ہاتھوں انسانیت کس طرح تڑپ تڑپ کر جان دیتی ہے وہ بیٹی کو رحمت کی بجائے زحمت سمجھنے والے کہاں جانتے اور مانتے ہیں۔ ڈاکٹر الماس روحی کا خط کہانی ازدواجی زندگی کے لیے اچھی اصلاحی تحریر تھی۔ شمیم فضل خالق کا افسانہ یہ جو محبت ہے اپنے منفرد انداز تحریر کے ساتھ سب سے نمایاں نظر آیا۔ وہ کردار کی جزئیات اور ماحول کے اثرات کو نظر انداز نہیں کرتیں بلکہ لفظوں میں جذب کر دیتی ہیں۔ دردانہ نوشین کا فاصلوں کو نبیلہ نازش راؤ کا دل جھیل اور خواب اور صائمہ نصیر احمد کا پہانس جذباتی بھی تھے اور نصیحت آموز بھی۔ ڈاکٹر اقبال ہاشمانی کا جانو جرمن کمال تحریر تھی۔ معاشرتی کرداروں کے ساتھ جانو جرمن کا تقابلی جائزہ شاندار تھا۔ ہر جملہ حقیقت سے قریب تر اور ہمارے دل کی ترجمانی کرتا محسوس ہوا لیکن سچ بتائیں تو کبھی کبھی ہم خود بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کے لیے

پراسرار کہانی نمبر 2

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کردیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواح خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کردیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں۔

سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پراسرار نمبر 2 ہوگا۔

نوٹ: پراسرار نمبر 2 کے لیے کہانیاں بھیجنے کی آخری تاریخ 5 جون ہے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

جان وجر من بن جاتے ہیں کہ فطرتِ انسانی میں ضد کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور جہاں ضد کا عنصر پایا جاتا ہے وہیں جانو جر من بھی موجود ہوتا ہے وہ اپنی ضد منوانے کے لیے حیلے بہانے ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں سب ہی نظمیں اور غزلیں معیاری تھیں۔ سلسلے وار ناولیٹ اور ناولٹوں میں اُم مریم کا رحمٰن رحیم سدا سائیں رفتار کے لحاظ سے دھیما لگا لیکن امن اور دائم نے پھر تجسس میں مبتلا کر دیا۔ میرا فسانہ بس ایک تو سا س گل کا اور پلکوں پہ ٹھہرے خواب، حبیبہ عمر کا دونوں میں کہانی کا اختتامی عنصر جھلکنے لگا ہے دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے؟ المختصر عمدہ تحریروں سے مرصع ماہِ مارچ کے خوبصورت دوشیزہ کی ادارت قابلِ تحسین ہے۔ منزہ جی یہ بندی آپ کی تہہ دل سے مشکور ہے اُس افسانے کی اشاعت پر جو گزشتہ سال اسی مہینے پوسٹ کیا تھا۔ آپ سوچ نہیں سکتیں۔ مجھے افسانہ دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ پچھلے سارے افسانے سپردِ ردی ہو گئے۔ لیکن اب کچھ امید سی بندھ گئی ہے کہ ابھی ارسال کیے گئے افسانوں کے علاوہ پچھلے دو افسانے بھی شائع ہو ہی جائیں گے۔ مگر ان شاء اللہ اُن کی اشاعت جلد عمل میں لے آیئے گا تاکہ قلم کو حوصلہ افزائی کی دوات فراہم ہوتی رہے اور یہ رواں رہے آمین۔ منزہ تبصرہ کافی طوالت اختیار کر چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ آپ سمجھیں کہ خولہ کو تعریفی جواب اوورڈوز ہو گیا ہے۔ ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ ایک نظم ارسال کی ہوئی ہے امید ہے دوشیزہ میں جگہ بنا لے گی۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی پر ممنون، دوشیزہ، اہلیانِ دوشیزہ اور آپ کی روز افزوں ترقی اور صحت کے لیے دعا گو۔

ج: پیاری سی خولہ تمہارا بھرپور تبصرہ بہت اچھا لگا اور یقین رکھو وقتاً فوقتاً تمہارے افسانے چھپتے رہیں گے۔ نظم کے بارے میں بس یہی کہوں گی کہ امید پر دنیا قائم ہے۔

✉ اور جناب یہ ہیں ہماری اور آپ سب کی صبیحہ شاہ جو کراچی سے طویل عرصے کے بعد تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں۔ اچھی منزہ! بہت عرصہ بعد مخاطب ہوں۔ ہم محبتوں اور وضع داریوں کے مارے لوگ ہیں۔ جب جب کوئی محبت و عزت سے پکارتا ہے، لبیک کہتے ہیں نیلوفر علیم عباسی کے اعزاز میں تقریب بہر ملاقات تو تھی اور ایسی ملاقاتیں ہمیشہ ہی حبس میں آکسیجن کا کام کرتی ہیں (خوش رہو) مگر یہ تقریب یقیناً ایک آرٹسٹ کے اعزاز میں نہیں بلکہ سہام صاحب سے تعلق خاطر کے حوالے سے تھی اور والدین کے احباب کی عزت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بھی کبھی بے توقیر نہیں کرتا۔ زین اور دانیال کو میزبانی کی ذمہ داریاں نبھاتے دیکھ کر اچھا لگا اور یقین ہوا کہ یہ سلسلہ ہے جو یقیناً جاری رہے گا۔ اللہ تمہیں بچوں کی خوشیوں سے مالا مال کرے (آمین) بہت شکریہ۔ میری طویل غیر حاضری کے باوجود پرچہ مجھے ملتا رہا۔ لیکن معاف کرنا منزہ! (حق کہنے سے میں باز نہیں آؤں گی) پرچے کا معیار بہت خوش کن نہیں رہا۔ (ایک بار پھر) معاف کرنا، یوں لگتا ہے کہ میٹر موصول ہوتے ہی بغیر جانچ کے کمپوزر کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور پھر پروف دیکھے بغیر پرنٹنگ کو دے دیا جاتا ہے۔ اتنی فاش غلطیاں دیکھ کر افسوس اور ذمہ داروں پر غصہ آتا اور مطالعہ اور کہانی کے تاثر کا مزہ و لطف کرکرا ہو جاتا ہے۔ محبت میں کسی کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کر دینا یقیناً محبت ہے لیکن جب کوئی امیج اور ریپوٹیشن متاثر ہو رہی ہو تب غلطیوں سے

صرف نظر کرنا اور نشاندہی کرنا دشمنی ہے۔ سو یقین کرنا دشمنی میرا شیوہ نہیں، حسبِ وعدہ ایک کہانی ارسال ہے۔

✍: حبیبہ! یہ آپ نے کیسے سوچا کہ میں ایسا سوچوں گی۔ اب اتنی عقل آ گئی ہے کہ دوست اور دشمن کا فرق سمجھ گئی ہوں۔ آپ لوگوں سے تو دوشیزہ کی پہچان ہے۔ میں پوری کوشش کر رہی ہوں کہ معیار کو برقرار رکھ سکوں۔ اس میں آپ کو بھی اپنا حصہ ڈالنا ہوگا۔ مجھے اسی طرح میری خامیوں سے آگاہ کرتی رہیے گا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس شمارے کو بھی بہت تنقیدی نظر سے دیکھیے گا اور پھر مجھے آگاہ کریں۔

✉: اور یہ ہیں ہماری نیرّ شفقت جو تشریف لائی ہیں ساہیوال سے، لکھتی ہیں۔ پیاری سی منزہ جی! السلام علیکم! امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ محفل کی ذمہ داری آپ نے سنبھال لی۔ بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے تو بجیا کے بارے میں کچھ باتیں۔ چھوٹی سی بجیا بہت قدآور شخصیت کی مالک تھیں اور اتنی ہی پُرشفقت بھی، مجھے وہ لمحے یاد آ رہے ہیں جب ایوارڈ کی تقریب میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے انہیں سلام کر کے اپنا نام بتایا تو مجھے گلے لگا کر بہت دعائیں دیں۔ یانو اس وقت تو میں آسمان پر تھی۔ میں نے اور شفقت نے ان کے ساتھ تصویریں بھی بنائیں تھیں مگر بدقسمتی سے وہ موبائل سے غائب ہو گئیں۔ جن کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ غالباً ہم نے فوٹو گرافر سے بھی تصویر بنوائی تھی جو شاید آپ کے ریکارڈ میں ہو...... اگر ہو تو...... پلیز...... اللہ پاک سے دعا ہے کہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر جگہ دے (آمین) آپ کے حکم کے مطابق افسانہ حاضر ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ بدلے میں مجھے افسانے اور پرچے پر تبصرہ چاہیے۔ تو منزہ جی یہ بدلے کی بیخ آپ نے کہاں سے لگا دی۔ آپ حکم کیا کریں محبتوں کے ساتھ، ہم تو آپ کو جان بھی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ افسانہ اور تبصرہ کی کیا بات ہے۔ آپ ہمیں شمارے بھیجیں یا نہ بھیجیں ہم تو آپ کو افسانے اور تبصرے بھیجتے رہیں گے۔ دو تین دن تک بچی کہانیاں کی طرف بھی اپنی اور عائشہ کی کہانیاں ارسال کروں گی کہ ابھی زیرِ تحریر ہیں۔ رسالہ مکمل طور پر نہیں پڑھ سکی۔ جتنا بھی پڑھا ہے بہترین ہے۔ سلسلے وار سلسلوں کو کچھ کم کر دیں تا کہ افسانے زیادہ تعداد میں لگ سکیں۔ عائشہ اپنی نظم پڑھ کر بہت خوش ہوئی اور شکریہ ادا کر رہی ہے۔ ساتھ ہی دوا اور لکھ کر دے دیں کہ یہ بھی بھیج دو ما۔ رخسانہ آنٹی کیسی ہیں؟ انہیں میری طرف سے بہت بہت سلام کہیے گا۔ اب میں اجازت چاہوں گی کہ گھر کے کام مجھے بلا رہے ہیں اور ابھی میں نے افسانہ پوسٹ کرنے بھی جانا ہے۔ اللہ پاک آپ سب کو اپنی امن میں رکھے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ ملیں گے بشرطِ زندگی۔ اللہ حافظ

✍: عزیز از جان نیرّ! تمہارے خط نے تو خوش کر دیا۔ جیو، افسانہ مل گیا ہے جلد شمارے کی زینت بنے گا۔ عائشہ کی ایک نظم تو اس شمارے میں شامل ہے۔ اسی طرح محفل میں آتی رہنا مجھے بہت اچھا لگے گا۔

اس آخری خط کے ساتھ آپ لوگ مجھے اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ انہی صفحات پر پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

میکال حسن

ماڈل، ایکٹر

مونی خان

میکال حسن 5 ستمبر 1981ء کو برطانیہ میں پیدا ہوئے۔ کیریئر کی ابتدا 2001ء میں کمرشلز سے کی اس کے بعد ابرار الحق کے میوزک البم میں نظر آئے۔ میکال کی والدہ انگریز اور والد پاکستانی ہیں۔

وہ سات بہن بھائیوں میں درمیان میں ہیں۔ ابتدائی تعلیم لاہور Lyceum سے حاصل کی۔ مزاجاً بہت سیریس ہیں۔ انٹرویوز دینا پسند نہیں کرتے۔ مختلف چینلز سے کئی مشہور ڈرامے کیے۔ تکبینیں، صبح کا ستارہ، پر ہم ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 3 بھارتی فلمیں بھی کیں۔ مگر انہیں کچھ خاص پذیرائی حاصل نہ ہوسکی۔

میکال کا نام زارا شیخ اور مدیحہ افتخار کے ساتھ لیا جاتا رہا مگر تمام افواہوں نے دم توڑ دیا۔ جب 2010ء میں میکال نے سارہ بھٹی سے شادی کرلی۔ وہ دو

بہت ہی پیاری بیٹیوں کے والد ہیں اور نہایت مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ پاکستانی فلم "ابھی تو میں جوان ہوں" پر بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ ہمارے اس گڈلکنگ ہیرو کو ورزش کرنے کا بہت شوق ہے۔ غذا صرف متوازن لیتے ہیں۔ میکال کو یوفون کے اشتہار سے بہت شہرت حاصل ہوئی۔ لوگ نئے آنے والے ہر اشتہار کو بہت پسند کرتے ہیں۔ میکال ٹی وی ڈراموں میں کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ مگر اسکرپٹ اچھا ہو اس بات پر خاص توجہ دیتے ہیں۔

ماورا حسین

VJ، ماڈل، ایکٹرس

ذیشان فراز

ہم: ماورا بہت کم عمری میں آپ نے بہت شہرت پائی کیا بچپن سے ہی فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا؟

ماورا: (ہنستے ہوئے) بچپن میں تو مجھے مس یونیورس بننے کا شوق تھا اور اس شوق کی وجہ سے بہت مذاق بھی اڑا۔

ہم: بتائیں بچپن کہاں گزارا؟

ماورا: میں 28 دسمبر کو کراچی میں پیدا ہوئی مگر پھر اسلام آباد چلے گئے۔ بحریہ اسکول سے پڑھائی کی اور LLB اسلام آباد یونیورسٹی سے۔

ہم: کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟

ماورا: ہم دو بہن اور ایک بھائی ہیں۔ ڈیڈی آرمی میں تھے۔ مگر سخت بالکل نہیں ہیں انہوں نے ہمیں وہ سب کرنے دیا جو ہم چاہتے تھے۔

ہم: آپ نے ڈراموں سے شوبزنس میں قدم رکھا؟

ماورا: نہیں میں نے پہلے تھیٹر کیا پھر ARY میوزک پر بطور VJ اس کے بعد ڈرامہ کیا تھا۔

ہم: آپ کا پہلا ڈرامہ ''میرے حضور'' تھا جس سے آپ کو شہرت ملی مگر کیا اب آپ ٹی وی ڈرامے نہیں کریں گی؟

ماورا: جی سوچا تو یہی ہے کہ میں اب ڈراموں میں کام نہیں کروں گی۔

ہم: آپ کی پہلی فلم ''صنم تیری قسم'' تو باکس آفس پر بری طرح فلاپ ہوگئی اس کے بعد بھی آپ یہی کہیں گی؟

ماورا: جی بالکل ناکامی اور کامیابی تو ہر فیلڈ میں ہوتی ہے اور پھر یہ تو میری پہلی فلم تھی مجھ سے بھی بہت غلطیاں ہوئیں۔

ہم: آپ کے پاس مزید فلمیں ہیں؟

ماورا: جی دو فلمیں اور سائن کی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ ہٹ ہوں گی۔

ہم: آپ اپنا فیملی نام حسین S کے بجائے C سے لکھتی ہیں کوئی خاص وجہ؟

ماورا: (مسکراتے ہوئے) اصل میں نام کے Spelling بھی میں نے Change کیے تھے جب میں کلاس 7 میں تھی۔ مجھے ہمیشہ سے سب سے الگ لگنا اچھا لگتا ہے۔

ہم: اچھا تو پھر اسی لیے آپ نے انڈیا کی فلم ''فلم'' کی خوب تعریف کی جو دراصل پاکستان کے خلاف تھی؟

ماورا: (بہت سنجیدگی سے) دیکھیے میں اس بارے میں بہت تفصیل میں تو نہیں بات کروں گی مگر میں نے اس فلم میں دہشت گردی کے خلاف Content کو سپورٹ کیا تھا۔ کیونکہ میرا ماننا ہے کہ دہشت گرد کا نہ تو کوئی مذہب ہوتا ہے نہ ہی سرحدیں مگر شاید لوگوں کو یہ باتیں سمجھ نہیں آتیں۔

ہم: اداکار شان نے تو آپ پر پابندی کا مطالبہ کیا ہے، کیا کہیں گی اس بارے میں؟

ماورا: جی

میں اس پر کوئی کمنٹ نہیں دینا چاہتی مگر کچھ لوگ شاید اس طرح خبروں میں رہنا چاہتے ہیں اور بس......

ہم: آپ نے 2014ء میں منگنی کی تھی شادی کب کر رہی ہیں؟

ماورا: ارے خدا کو مانیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی تو کیریئر کی شروعات ہے۔

ہم: تو [illegible] کون تھے؟

ماورا: بہت سے دوسرے دوستوں کی طرح [illegible] دوست۔

[illegible]

ہم: [illegible] پسند کرتی ہیں؟

ماورا: ویسے تو Events کے حساب سے ہی کپڑے پہنتی ہوں۔ مگر جب ریلیکس رہنا ہوتو جینز اور ٹاپ پسند کرتی ہوں۔

ہم: اور خوشبو کون سی اچھی لگتی ہے؟

ماورا: گوچی کا رش میرا پسندیدہ پرفیوم ہے۔

ہم: ویسے تو آپ کے پاس فارغ وقت کہاں ہوتا ہوگا مگر پھر بھی اگر فرصت مل جائے تو کیا کرتی ہیں۔

ماورا: جی یہ تو آپ نے صحیح کہا مگر مجھے فری ٹائم میں کوکنگ کرنا اچھا لگتا ہے۔ دنیا گھومنے کا بھی بہت شوق ہے۔

ہم: کون سے رنگ کے کپڑے زیادہ پسند کرتی ہیں؟

ماورا: مجھے بے بی پنک اور سوفٹ بلو بہت پسند ہیں۔

ہم: آپ کی بہن اروی کا تعلق بھی شوبزنس سے ہے تو ایک دوسرے سے پروفیشنل جیلسی تو نہیں ہوتی۔

ماورا: بالکل نہیں بلکہ انہیں تو ایک دوسرے کی بہت سپورٹ ہے۔

ہم: آپ کا قد ماشاءاللہ 5.7 ہے تو کہیں یہ قد تو انڈین فلموں میں جانے کی وجہ نہیں۔

ماورا: (مسکراتے ہوئے) ہوسکتا ہے کہ قد کی بھی [illegible] Acting Skills [illegible] نظر انداز نہیں [illegible] فلم [illegible]

[illegible]

ہم: [illegible] پڑھنے والے یہ [illegible] کہ آپ اب انڈیا شفٹ ہو جائیں گی۔

ماورا: اگر ضرورت محسوس کروں گی تو ضرور، اس میں کوئی حرج نہیں انسان جتنا قریب رہتا ہے تو کام پر پوری توجہ رہتی ہے۔

ہم: ہماری اور ہمارے سب پڑھنے والوں کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی؟

ماورا: میں بس یہی کہوں گی کہ مجھے آپ سب کی سپورٹ کی ضرورت ہے۔ میں ان لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے میرے کام کو پسند کیا اور جن کے معیار پر پوری نہیں اتری ان سے صرف یہ کہوں گی کہ میری آنے والی فلمیں ضرور دیکھیں وہ بھی مجھے ضرور پسند کریں گے۔

☆☆......☆☆

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت
سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

زندگی میں بہت ساری چیزیں انسان خود بخود شامل کر لیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ مجھے ہر اینٹک چیز اپنی جانب اٹریکٹ کرتی ہے۔ کیا کروں؟ سمجھ ہی نہیں آتا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ خوبصورتی خود بھی سب سے بڑا میگنیٹ ہوتا ہے۔ بہت دور نہ جائیں، ابھی لاسٹ ویک اینڈ کی ہی تو بات ہے۔ مسز صدیقی کے ہاں پارٹی میں کچھ مہمان سرحد پار سے بھی آئے ہوئے تھے۔

میرے لیے صرف مسز مہتا ہی کی ذات قابلِ رشک تھی۔ مجھے ان میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے سیاہ گھنے بال اور ان کی کمر پر ناگن کی طرح بل کھاتے محسوس ہوتے تھے اور وہ آبنوسی رنگ کی ساڑی پر کیا جچ رہے تھے۔ مسز صدیقی کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں جس قدر دل خراب کیے ہوئے تھی، مسز مہتا کو دیکھ کر میں نہال ہو گئی۔

ہر چیز کا سمے ہوتا ہے۔ خوشی اور غمی کا بھی سو یہ میرے لیے خوشی کا سمے تھا۔ مجھے مسز مہتا ایک اینٹک ہی لگ رہی تھیں، ایسا شاہکار جس کے لیے لوگ ملین ڈالرز کی بولی لگا دیں۔ دیکھیے ذہنی رو کس طرف بھٹک گئی۔ ان کا نمکین چہرہ میری آنکھوں میں جیسے جم سا گیا تھا۔ شاید وہ بھی میری دلچسپی بھانپ گئی تھیں۔ وہ خود ہی میری طرف آ گئیں۔ اور میری طرف دوستانہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔

''ہیلو! آئی ایم مسز مہتا، پاروتی مہتا! آپ شاید مجھ میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔''

''گڈ ایوننگ! آئی ایم روبینہ امان! میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔''

''واٹ ڈیو یو مین؟'' انہوں نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''مجھ میں مجھ ہی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ویری نائس۔ کافی دلچسپ ہیں آپ۔''

''مجھے ہر......'' یکدم میں کہتے کہتے رک گئی کہ مجھے ہر اینٹک چیز پسند ہے۔ مبادا وہ برا ہی نہ

مان جائیں۔

عورت عمر کے آخری حصے میں بھی خود کو بوڑھا اور ادھیڑ عمر کہنے کی اجازت کبھی کسی کو نہیں دے سکتی۔ عورت کی عمر ہمیشہ 16 سے شروع ہوتی ہے اور 25 پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے۔ ظاہر ہے میں خود عورت ہوں لہٰذا میں کس طرح اس تجزیے کے منافی بات کر سکتی ہوں۔

''میں سمجھی نہیں۔'' وہ تھوڑا سنجیدہ ہوگئیں۔

''آپ کھل کر بات کریں۔''

''مجھے ہر حسین چہرہ اپنی جانب کشش کرتا محسوس ہوتا ہے۔ آپ میں ایک بہت خاص اٹریکشن سی فیل ہوئی تھی مجھے...... اور مجھے یہ امید نہیں یقین ہے کہ آپ میں کچھ تو اسپیشل ہے۔''

آخر میں نے دل کی بات لبوں سے آزاد کر دی اور اب میں مسز مہتا کا ردِعمل دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ میری بات کا کہیں برا تو نہیں مان گئی ہیں۔

''سنا تھا پاکستانی بہت گہری نگاہ رکھتے ہیں مگر آج یہ یقین بھی ہو گیا۔'' وہ مسکراتی چلی گئیں۔

''اِس کا مطلب ہے جو بات میں نے محسوس کی وہ سچ ہے۔'' میں نے فوراً کہا تھا۔

''جی بالکل! اور ہاں میں چار دن اور یہاں کراچی میں موجود ہیں۔ مجھے امید ہے ہم پھر سے ایک بار ضرور ایک دوسرے سے ملیں گے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے ایک کارڈ میری جانب بڑھایا۔

کارڈ کی بیک پر ایک فون نمبر جو یقیناً ان کے موجودہ استعمال میں تھا، درج تھا۔ میں نے ان کو گلے لگالیا اور پھر ہم دونوں ہی اُس تقریب کا حصہ بن گئیں۔

میں نے گھر آتے ہی مسز مہتا کو فون کیا اس طرح ان کے پاس میرا رابطہ نمبر بھی منتقل ہو گیا۔

☆......☆......☆

''کراچی سے بہت اہم ترین امور کے سلسلے میں کس بندے کو بھیجا جا سکتا ہے۔ جو اِن ڈاکومنٹس کو فائل کرا کر لے آئے۔''

روبینہ بہت پریشان تھیں۔ امان مرزا کی کمپنی نے بہت اہم ڈیل کی تھی اور وہ اس وقت چونکہ خود لندن میں تھے۔ ڈیل پراپر طریقے سے سائن کرانے کی ذمہ داری روبینہ پر آن پڑی تھی۔ مگر وہ کچھ دنوں سے میگرین کا شکار تھیں۔

اب کیا کیا جائے۔

وہ پریشان ہوگئیں۔ ان کے ذہن میں اچانک ہی صبح کی کال آگئی۔ ان کا چھوٹا بیٹا آج ہی ایگزامز سے فارغ ہو کر اپنی اسپورٹس پریکٹس کے لیے پندرہ دن کے لیے لاہور جا رہا تھا۔

تھا تو لاابالی ہی لیکن دو بیٹوں کے بیرونِ ملک شفٹ ہو جانے کے باعث بڑا ذمہ دار ثابت ہو گیا تھا۔

اب یہ ذمہ داری اگر وہ ٹھیک سے نبھا لیتا تو اُسے رائٹ چوائس کا ٹیگ دیا جا سکتا تھا۔ روبینہ نے فوراً ہی اُسے کال ملائی اور پھر شام تک وہ لاہور جانے کے لیے راضی ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

''مما میں آپ کو ہاسپٹل لے چلتا ہوں۔'' بازل نے محبت سے کہا۔

''نو مائی سوئٹو! آئی ایم فائن ڈارلنگ!''

''ڈیئر! سچ پوچھو تو اگر میری طبیعت خراب نہ ہوتی تو میں کبھی اپنے سوئٹو کو یہ بودر (تکلیف) نہ دیتی۔''

''مما کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ...... یہ تو اپنا کام ہے۔ اِٹس آ پارٹ آف بزنس...... میں بھلا کس طرح اس بات کو بودر (تکلیف) سمجھ سکتا

ہوں۔"

"لو یو مائی سن! میرا بیٹا تو سچ مچ بہت ذمہ دار ثابت ہو گیا ہے۔"

"مما آپ کی ہمیشہ ایک بات مجھے یاد رہتی ہے کہ تم تینوں اپنے فادر کا رائٹ ہینڈ ہو۔ کبھی میں یہ نہ دیکھوں کہ تم تینوں میں کوئی کلیش ہو اور تمہارے فادر ڈسٹرب ہوں۔"

مما ہمیشہ سے میں نے دونوں بڑے بھائیوں کو پاپا کے بزنس میں ہاتھ بٹاتے دیکھا ہے۔ اب اگر یہ تھوڑا سا کام میرے ذمہ آپ نے لگا دیا ہے تو کیا میں اس سے منہ موڑ لوں۔ نیور مما۔ آئی لو مائی پیرنٹس۔ آئی لو یو۔"

میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ یہ تربیت کا اثر ہوتا ہے جو ہمیں انعام کی صورت ملتا ہے۔

"مما آپ ایزی فیل کر رہی ہیں نا۔"

بازل نے اپنے بازو میرے گرد حمائل کر دیے۔

"او کے جانو! اب تو لگتا ہے سب ٹھیک ہے۔"

مجھے پھر سے میگرین محسوس ہو رہا تھا مگر میں بازل کو اس وقت ڈسٹرب کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

"مما آپ ہمیشہ مجھے اپنے دیے گئے حکم پر اوبیڈنٹ پائیں گی۔ لیکن ایک وعدہ کریں کہ آپ ڈاکٹر کے پاس لازمی جائیں گی۔"

"او کے جانو! میں چلی جاؤں گی۔ ڈونٹ وری۔"

بیٹے کی محبت سے سرشار میں اپنی طبیعت میں بہت بہتری پا رہی تھی۔ اولاد کا سکھ تو آپ ہی ایک فرحت بخش احساس ہوتا ہے۔ میں اسی سرشاری میں گم تھی کہ موبائل پر بیپ ہونے لگی۔

"ہیلو! کیسی ہیں آپ مسز امان!" فون پر مسز مہتا تھیں۔

"بس کچھ میگرین کی شکایت ہے۔"

"اوہ! اب تو مجھے آپ کے پاس آنا ہی پڑے گا۔ آئی وڈ لائک ٹو میٹ وِد یو!"

"آپ کس جگہ پر قیام پذیر ہیں مسز مہتا؟"

میرے اس سوال پر انہوں نے مجھے اپنی ریذیڈنس کے بارے میں مطلع کیا۔

"میں ابھی ڈرائیور بھیج دیتی ہوں۔ یقین کریں اگر کچھ بہتر فیل کرتی تو خود لینے آتی مگر......"

"اِٹس او کے! اِٹس ناٹ آ میٹر۔" یہ کہہ کر فون بند ہوا اور میں نے فوراً ہی ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا کر مسز مہتا کی طرف روانہ کر دیا۔

☆......☆......☆

"سو نائس آف یو مسز امان! واٹ آ پیلس!"

مسز مہتا مسلسل ہمارے آشیانے کو سراہ رہی تھیں۔ میرے لیے اب یہ باتیں قطعاً معنی نہیں رکھتی تھیں۔ گھر ایک خواب ہوتا ہے اور اگر خدا آپ کے خواب کو خوابوں جیسا ہی گھر دے تو پھر جنت کا نظارہ اِس دنیا ہی میں ہو جاتا ہے۔

"اب بتائیں کہ آپ کو میگرین کی شکایت کب سے ہے؟" مسز مہتا ڈاکٹر بن گئیں۔

"پہلے بتائیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔"

"ہوم ڈاکٹر کہہ سکتے ہیں۔"

"او کے...... بس مجھے دوسرے بیٹے کی پیدائش کے بعد سے یعنی بیس برس سے پرابلم ہے۔"

"اسٹریس کیوں لیتی ہیں ہر بات کا۔" انہوں نے جیسے میرے اندر جھانکا تھا۔

"میں...... میں تو کسی بات کا اسٹریس نہیں

لیتی ہوں۔'' میں بڑبڑائی۔

''ایک بات ہم دونوں ملکوں کے عوام میں بہت عام ہے۔ ہماری عورتیں برداشت کے سمندر اپنے اندر رکھتی ہیں۔ ہر زیادتی اور ظلم سہہ کر بھی..... سب کچھ OK ہے کا نعرہ لگاتی ہیں۔''

''ارے ارے مسز مہتا ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ خیال نہ کریں۔ آئی ایم فائن۔''

''گڈ!'' وہ استہزائیہ مسکرائی تھیں۔

''آپ بالوں کے لیے کیا استعمال کرتی ہیں۔ مطلب بالوں کو بھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور بال جاندار ترین شے ہیں۔ یہ تو آپ جانتی ہیں۔''

''جی بالکل! کچھ خاص نہیں۔ بس شروع سے ہی امپورٹڈ آئلز' شیمپو اور کنڈیشنز یوز کرتی رہی ہوں۔ اس عمر میں آ کر کیا قلابے ملاؤں۔''

میں مسکرائی' اچانک سے آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئیں۔

''آئی تھنک یو فیل میگرین ناؤ!''

''بس کچھ......'' میں نے ماتھے پر انگلیوں سے مساج کرتے ہوئے کہا۔

''آئی ہیو آ سولوشن!'' انہوں نے اپنے بیگ سے ایک بوتل نکالی۔ اُس بوتل سے کور ہٹا ہوا تھا یعنی بالکل وائٹ بوتل تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

''یہ آپ کے لیے ایک علاج ہے۔ آپ جائیں اور نیم گرم پانی سے شاور لیں۔ سر کو اس شیمپو سے دھو کر آئیں۔ تب تک میں آپ کے فیملی البم دیکھتی ہوں۔ یقیناً جس طرح تصویروں سے آپ کے کمرے کی Walls سجی ہیں تو آپ کے پاس یادوں کے خزانے بھی تصویروں کی البم میں بند پڑے ہوں گے۔'' وہ مسکرائیں اور پھر میں بھی مسکرا اٹھی۔

میں کچھ دیر بعد مسز مہتا کے آگے البمز کے ڈھیر لگا کر باتھ لینے چل پڑی تھی۔

ہم امپورٹڈ چیزیں استعمال کرنے والوں کا المیہ یہ ہے کہ ہمیں دیگر تمام چیزوں کے رنگ' خوشبو' ذائقے' استعمال سب بھول جاتے ہیں۔ بس ہمارا ایمان مہنگی سے مہنگی چیز پر ہی ہوتا ہے۔ ہمیں جتنی مہنگی چیز ملتی ہے ہم اس کی کوالٹی کو ہی نمبر ون سمجھ کر مطمئن ہوتے ہیں۔

میں نے جب بال شیمپو کیے تو ذہن میں یہی تھا کہ یہ بہت مہنگا شیمپو ہے۔ اور پھر جب میں شاور لے کر آئی تو کچھ دیر کے لیے بال ڈرائی کر کے ایزی چیئر پر بیٹھ گئی۔ میری آنکھ لگ گئی۔ کچھ دیر بعد جب اچانک میں ہڑبڑا کر اٹھی تو...... یہ تو چمتکار ہو گیا تھا۔ میں بہت پُرسکون تھی۔ میگرین غائب تھا۔

''اوہ! مسز مہتا!'' میں اچانک انہیں یاد کرتی کمرے میں آئی۔ وہ وہیں موجود میری یادوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔

''ہیلو! چارمنگ لیڈی...... آر یو فائن ناؤ!'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''میں بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں خود کو۔''

''میں چاہتی ہوں آپ اسی طرح ہلکا پھلکا اور ایزی فیل کریں ہمیشہ۔''

''انشاء اللہ! خدا نے چاہا تو!''

''آپ کا خدا تو چاہتا ہے مگر آپ لوگ نہیں چاہتے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ خدا نے عقل تو سب کو دی ہے نا۔ تو پھر اُس عقل کا فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے

ہم۔''
''پلیز کھل کر بتائیں۔'' میں جز بز ہوئی۔
''ہمارے پاس دماغی مسئلے کا سب سے آسان حل موجود ہے۔ دیکھیں مسز امان۔ میں بہت پریکٹیکل وومن ہوں۔
میں آج سے دس سال پہلے بہت سارے ہیئر پرابلمز اور اس سیکرین کا شکار تھی۔ سچ پوچھیں تو کوئی ویدڈاکٹر نہ چھوڑا تھا۔
مگر نتیجہ ٹھنے (زیرو) اور پھر اچانک سے میں نے [illegible]
[illegible]
[illegible]
اب بتا بھی دیں نا۔''
[illegible]
''بہت آنت [illegible]''
مسز مہتا نے اپنے بیگ سے شیمپو سے بنایا گیا ریپر نظروں کے آگے کر دیا۔
ریپر دیکھ کر مارے حیرت کے میری آنکھیں اُبلنے کو تیار تھیں۔
''یہ!! اوہ مائی گاڈ! مسز مہتا' لائف بوائے شیمپو!'' مارے حیرت کے میں گنگ تھی۔
''جی ہاں...... یہ ہے وہ چمتکار...... لائف بوائے شیمپو! اور پھر ہم لوگ ہیں ناعقل کے کچے جو کبھی اپنی اہم ترین پراڈکٹس پر بھی توجہ نہیں دیتے۔ لائف بوائے شیمپو میں ملک، پروٹین شامل ہے۔ بادام کے تیل کی خاصیت لیے اس میں اہم عرقیات ہمارے بالوں کو ہی نہیں بلکہ ہمارے دماغ کو بھی شانتی دیتے ہیں اور کئی بیماریاں ہمارے پاس نہیں آتی ہیں۔
اب بھلا بتائیں۔ لائف بوائے شیمپو بنانے والوں کو پتا ہے کہ ہم اس منفرد اور سستے شیمپو سے کتنی مہنگی بیماریوں سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ اگر پتا چل جائے انہیں تو یہ شیمپو ڈالرز میں فروخت ہو۔''
مسز مہتا اپنی بات کر کے خاموش ہوئیں تو مجھے لگا مجھے کچھ بولنا چاہیے۔
''لائف بوائے شیمپو تو بہت زمانے سے دیکھ [illegible]
[illegible]
''اس کی قیمت تو شروع سے بہت کم ہے لائف بوائے شیمپو [illegible] کے لیے ایک [illegible] نہیں معلوم ہی نہیں ہے۔ لائف بوائے شیمپو کی قیمت اتنی [illegible] ایک عام پاکستانی [illegible]''
''بالکل ٹھیک۔ تو پھر آج سے میں اور آپ بھی ہوئیں لائف بوائے شیمپو کی اسیر۔''
''بالکل...... کیوں نہیں۔ ہم دونوں بھی آج سے اس چمتکار کی ہیں شاہکار۔''
مسز مہتا جا چکی تھیں۔ اور میں آج کی رات سکون سے سوئی تھی۔

☆......☆......☆

بازل کا فون آیا تو میں اٹھی تھی۔
''مما! کیسی ہیں آپ؟''
''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سوئٹو تم بتاؤ بیٹا آرام سے پہنچ گئے تھے نا۔''
''بس مما! بس آپ کی طرف سے فکر تھی۔''
''ارے جانو! ٹیک اِٹ ایزی۔ میری فکر تو مسز مہتا نے چٹکیوں میں ختم کر دی تھی۔'' اور پھر

میں نے بازل کو جب ساری کل والی بات بتائی تو وہ بھی حیران ہو گیا۔

مگر اس میں حیرانی کی بات نہ تھی بلکہ ہماری کم فہمی ہمیں بعض اوقات صحیح فیصلوں سے دور کر دیتی ہے۔ ہمیشہ اپنی ذات کے لیے اپنی ہی دیسی چیز کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جیسے ہمارا لائف بوائے شیمپو ہمارے بالوں کے مسائل کا سچ مچ خاتمہ کرتا ہے مگر...... ہم کتنے کم فہم ہیں نا۔

☆......☆......☆

آج اِس واقعے کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ میں ایک پُرسکون زندگی گزار رہی ہوں۔ لائف بوائے شیمپو نے میری لائف میں بالوں کی اہمیت واضح کر دی ہے اور آج میں بھی اپنے بالوں پر جتنا فخر کروں کم ہے لیکن یہ سب ممکن تو صرف لائف بوائے شیمپو ہی سے ہوا نا۔ مسز مہتا کی طرف سے ایک میل آئی ہوئی ہے۔ میں بار بار اسے پڑھ رہی ہوں۔

تم نے سوچا تو ہوگا...... دیکھا نہیں
خشک صحرا یہ جب برس جائے
ایک چھلکا ہوا بھرا ساون
دیر تک ریت سنسناتی ہے
ایک موہوم امید ہے
شاداب کے کہیں کوئی کونپل
جنم لیتی ہوئی نظر آئے
بانجھ صحرا کی گود بھر جائے

''مسز امان! پتا نہیں کیوں میں اب تک پھر پاکستان نہ آسکی لیکن ایک چیز ہمیشہ تڑپاتی ہے۔''

پاکستان میں واقعی محبت اور محبت دینے والے لوگ موجود ہیں۔ یہ نظم بہت پسند آئی۔

آپ کی امید جس طرح لائف بوائے شیمپو بنا اُسی لائف بھر کے لیے میری اور آپ کی دوستی بھی مثالی بن گئی۔ کاش کوئی ایسا چمتکار ہو جائے کہ دلوں کی ساری بدگمانیاں بھی ڈھل جائیں۔ کاش انسان انسان سے پیار کرے' سرحدیں پھول برسائیں اور ہر طرف بہار ہی بہار ہو۔

اور ہاں مسز امان! اب یہ میری اپنی Poetry آپ کے لیے، امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

زندگی نام ہے
ملنے کا بچھڑ جانے کا
زندگی تو کبھی رُکتی ہی نہیں
چلتی رہتی ہے، چلتی رہتی ہے
ہم فقط سال گنتے رہتے ہیں
اور محبت کو لے کر اِس دل میں
پھر مہ و سال گنتے رہتے ہیں
اس برس جب ہو دن محبت کا
میں کروں گی تمہارے نام وہ دن
اور اِک اور دعا مانگوں گی
زندگی سہل ہو کبھی کی یہاں
ہم ہوں سرحد کے آر یا ہوں پار
بس محبت سے ہم ہمیشہ ملیں
آشا جیون کی بس محبت ہو
زندگی نام ہے محبت کا

مسز مہتا

☆......☆......☆

لائف بوائے شیمپو...... تم نے مسز مہتا کی صورت مجھے ایک ایسا گفٹ دیا ہے کہ میں لائف بھر تمہارا احسان مانتی رہوں گی...... سو لُو یُو...... میری بھی مسز مہتا کی امید بھری آس والی دعا کاش رنگ لے آئے۔

☆☆......☆☆

قسط 15

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کر دیں گی رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

جی نانا جان..... ندا حواس باختہ ہو کر آواز کی سمت دوڑی۔ ثمر نے آنکھوں کے اشارے سے ماں کو Follow کرنے کو کہا اور خود پیش قدمی کی۔ بانو آپا تعجب کو کنٹرول کرتی ثمر کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔
''ارے ہم کہہ رہے ہیں اس نالائق سے ہماری بات کراؤ۔ لاؤ ہمیں دو یہ باجا ابھی سناتے ہیں اسے.....''

''نانا جان...... ماسوں جان کا فون نہیں ہے۔ مہمان آئے ہیں۔'' ندا شرمندگی سے آواز نیچی کر کے بتا رہی تھی۔

''وہ سنائیں گے کہ...... ہیں...... کیا بولیں......؟ مہمان...... ارے ہمارے گھر مہمان کہاں سے آ گئے۔ ہماری تو اولاد مہمان بن کر نہیں آتی۔''

شبیر حسین اس Sprinter کی طرح دوڑ رہے تھے جو اپنے نشان پر نظر جما کر دوڑتا ہے ندا کی اطلاع دینے کے دوران بھی وہ اپنے ذہن میں آنے والا جملہ ادا کرنے کی جلدی میں تھے مگر لفظ مہمان پر یوں چونکے گویا گھڑ سوار گھوڑے سے گر پڑا ہو۔ اس اثناء میں ثمر اور بانو آپا کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

''السلام علیکم...... ثمر نے یوں جلدی سے سلام کیا مبادا نانا کو ایمرجنسی بریک لگا رہا ہو۔ کیونکہ وہ شبیر حسین اور ندا کا مکالمہ سن چکا تھا۔ خطرہ لاحق ہوا ماں اس طرح کے استقبالیہ سے کبیدہ خاطر نہ ہو جائیں۔

''وعلیکم السلام! ارے یہ تو تمہارا 'افسر' ہے۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے جو ثمر پر نظر پڑی تو بری طرح بدک گئے۔

''جی...... وہ تو میں نے دے دیا ہے۔'' ندا گھبرا کر بولی۔

''تو پھر یہ حضرت یہاں کس خوشی میں تشریف لائے ہیں اور یہ ان کے ساتھ 'بڑی بی' کون ہیں؟''

'بڑی بی' بانو آپا نے جھٹ اپنے سراپے پر نگاہ دوڑائی۔

ندا پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔

اتنے اہتمام سے سی گرین اور آف وہائٹ کے امتزاج سے تیار ملبوس زیب تن کیا تھا۔ بالوں میں جو بالشت بھر بچے تھے تازہ مہندی لگائی تھی کیونکہ ہیئر کلر سے انہیں الرجی ہو جاتی تھی۔ پھر جوڑا بنانے کے بجائے میچنگ کیچر سے سمیٹ لیا تھا۔ کیونکہ لیموں کے سائز کا جوڑا انہیں پسند نہیں تھا۔

دونوں ہاتھوں میں دو دو تولے کا ایک ایک کنگن پہنا تھا پاؤں میں دیدہ زیب گرگابی تھی۔ افشاں نے جو قیمتی فیس واش لا کر دیا تھا۔ اس سے رگڑ رگڑ کر چہرہ دھویا تھا۔ آنکھوں میں ہاشمی سرمے کی سلائی بھی چلائی تھی۔ ہونٹوں پر پیازی لپ اسٹک بھی لگائی۔ اپنے تئیں بھرپور امپریشن ڈالنے کی سعی کی تھی۔

اس سوکھے ہڈیوں کے پنجر بڈھے کو میں بڑی بی دکھائی دے رہی ہوں؟ خون کی کھولن سے چہرہ لالوں لال ہونے لگا۔

''آنٹی پلیز آپ بیٹھیے ناں......!'' ندا خجالت بھرے انداز میں مخاطب تھی۔ ثمر نے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بانو آپا نے نشست کی جانب دیکھا۔

پرانے زمانے کے حجاموں کے ہاں یہ کرسیاں پڑی ہوتی تھیں۔ اتنا بڑا گھر لیے بیٹھے ہیں۔ کباڑ سے کرسیاں خریدتے ہیں۔ وہ بادل نخواستہ تشریف فرما ہوتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

''کیا ہو گیا ہے ثمر کو...... سارے زمانے میں اسے یہی گھر سوجھا ہے ایک سے ایک لڑکی دفتروں میں کام کرتی ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا...... ایک نظر وجیہہ کا ڈرائنگ روم دیکھے۔ فرش پر پڑے Rugs سے پیسہ بولتا ہے۔ طبیعت ایسی مکدر ہوئی کہ کلام کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔

''ارے اتنی عمر ہو گئی تمہارے بیٹے کی...... بیاہ کیوں نہیں کیا؟ تب ہی تو پرائی بچیوں پر نگاہ رکھتا ہے۔''

''ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ لینا ایک نہ دینا دو...... خیلے بہانے سے آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ارے انسان میں کوئی شرم وحیا بھی ہوتی ہے۔ پتہ ہے جوان جہان بچی ہے۔ لوگ بڑی سی موٹر دیکھ کر کیا سوچیں گے؟ باتیں بنائیں گے۔''

شبیر حسین کوئلے کے انجن کی طرح فضا میں دھواں چھوڑتے آگے بڑھ رہے تھے کہ پھر کھانسی کا پھندا لگ گیا۔ کھانس کھانس کر دوہرے ہونے لگے...... غم وغصے کی شدت سے بانو آپا کی قوت گویائی سلب ہوگئی تھی۔ وگرنہ آج سے پہلے تو وہ سمجھتی تھیں شعلہ بیانی اُن پر ختم ہے۔

آنٹی پلیز آپ مائنڈ مت کیجیے گا۔ نانا جان پر چند دن پہلے فالج کا اٹیک ہوا تھا ان کے ذہن پر بہت زیادہ اثر پڑا ہے۔ ندا کھانسی کو مہلت سمجھ کر صفائیاں پیش کرنے لگی۔

''جی امی جان...... ندا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ بوڑھے بھی ہیں اور پیشنٹ بھی ہیں۔ نارمل انسان تو اس طرح کی باتیں نہیں کرتا ناں......'' ثمر نے بھی ندا کو ایک ذہنی اذیت سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ خود تو پہلے ہی 'بھگت' چکا تھا۔

بانو آپا نے ثمر کی طرف یوں دیکھا گویا کہہ رہی ہوں۔

''چلو گھر...... گن کر دس جوتے نہ لگائے تو بانو نام نہیں۔''

ندا نے پانی کا گلاس اُٹھا کر شبیر حسین کو پانی پلانے کی کوشش کی مگر انہوں نے بڑی بے زاری سے اس کا ہاتھ پرے کر دیا۔ ندا اب بے بسی کی کیفیت میں ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کھانسی کا زبردست دورہ تھا رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بانو آپا نے دوپٹہ ناک پر رکھ لیا۔

''ارے انہیں ٹی بی تو نہیں ہے۔ ٹیسٹ کرا لیے ہیں ان کے؟'' بانو آپا کے انداز میں تکلف یا مروت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

''اللہ نہ کرے......'' ندا بے ساختہ بولی تھی۔ ثمر نے آنکھ بچا کر بانو آپا کا ہاتھ دبایا۔

شبیر حسین نے لفظ ٹی بی سن لیا تھا۔ باقی جملہ کھانسی کے زور میں بہہ گیا تھا۔

بہت کچھ بولنے کو بے تاب ہو گئے۔ مگر کھانسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

بانو آپا ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور ایک کڑی نگاہ شبیر حسین پر دوڑا کر ندا سے بولیں۔

''تم اپنے نانا کو سنبھالو...... ہم نے ناحق تمہیں پریشان کیا۔'' پھر ثمر کی طرف توجہ کی۔

''اٹھو...... یہ بیٹھنے کا موقع ہے۔ ہاسپٹل کا پیشنٹ گھر میں لٹایا ہوا ہے۔ جوان جہان بچی کو بھی جراثیم لگ سکتے ہیں۔ بانو آپا گویا پھٹ پڑیں۔ ہمدردی کی آڑ میں دل کی بھڑاس نکال کر حساب برابر کیا۔ شبیر حسین سے کم تو نہ تھیں۔ فرشتوں کو 'اتھارٹی' مل جاتی تو بانو آپا کو شبیر حسین بنا کر ماں کی گود میں دیتے۔

بانو آپا تو یوں تیزی سے نکلیں جیسے کوئی پیچھے سے آ کر دبوچ لے گا۔

ثمر نے ندا کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہی نہ ہوا کہ شبیر حسین اس کے 'دیکھنے' کو دیکھ رہے ہیں۔

''او کے ندا...... تم پریشان مت ہونا...... میں کل آ جاؤں گا۔ تم نانا جان کو دیکھو...... اگر ہاسپٹل لے جانا چاہو تو مجھے فون کر کے بتا دینا۔''

شبیر حسین اب کھانس کر بے دم، نڈھال ہو کر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح پڑے ہوئے تھے۔

مگر احساسِ ذمہ داری اتنا شدید تھا کہ پوری آنکھیں کھولے دونوں کو گھور رہے تھے۔
سر میں بہت شرمندہ ہوں..... آئی ایم سوری..... آنٹی پہلی بار ہمارے گھر آئیں اور......''
''نو پرابلم ندا..... نانا جان بزرگ ہیں..... پیشنٹ ہیں۔ان کی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیے۔تم اچھی طرح ان کی دیکھ بھال کرو۔او کے؟''
''ثمر......'' بانو آپا کی خفا خفا آواز فضا میں اُبھری۔
انداز ایسا تھا جیسے وہیں سے کان پکڑ کر کھینچا ہو۔
ثمر نے ہاتھ ہلایا۔ایک نظر شبیر حسین پر ڈالی اور تیز رفتار باہر نکل گیا۔ندا اپنا سر پکڑ کر کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ثمر باہر نکلا تو بانو آپا گیٹ پار کر چکی تھیں۔
ثمر بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کے تعاقب میں دوڑا۔
غصہ دوزخ کے درجۂ حرارت سے قریب قریب پہنچ رہا ہو تو الفاظ اُڑ اُڑ کر اس آگ میں گر کر بھسم ہو جاتے ہیں۔منہ کھلتا ہے مگر بولا نہیں جاتا۔اس وقت بانو آپا ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھیں۔
ثمر نے گیٹ سے باہر آ کر ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے کار کے دروازے کھولے۔ٹوں ٹوں کی آواز سنتے ہی بانو آپا نے فرنٹ ڈور کھولا اور زوردار آواز کے ساتھ بیٹھنے کے بعد بند بھی کیا تھا۔انداز ایسا تھا گویا کار کا دروازہ اکھیڑ کر شبیر حسین کے سر پر دے کر مار رہی ہوں۔
ثمر کی حالت ایسے مجرم یا ملزم کی تھی جس کی غلط F.I.R کٹ گئی ہو۔خاموشی سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔اور کار اسٹارٹ کی۔
بانو آپا نے اپنی پانی کی بوتل کھولی اور غٹاغٹ پانی پینے لگیں۔ثمر نے سکون کا سانس لیا۔آگ کو بجھانے کے لیے پانی ہی استعمال کیا جاتا ہے۔
پانی پی کر واقعی بانو آپا کی حالت میں تغیر واقع ہوا۔بوتل بند کرتے ہوئے انہوں نے ثمر کی طرف دیکھا۔
یہ کہاں لے آئے تھے مجھے..... لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے یا سب بیاہی گئیں؟'' انہوں نے اب ثمر پر چڑھائی کی۔
''امی جان......آپ......''
''خاموش رہو..... ایسا خبطی بڈھا..... آئے گئے کا لحاظ نہیں..... سنبھال کر رکھے اپنی نواسی کو..... بلکہ سر پر رکھ کر ناچے......''
''امی جان..... ضعیف بیمار عمر رسیدہ انسان..... ہنس ہنس کر باتیں تو نہیں کر سکتا۔ایک ذرا سا سر میں درد ہو جائے تو والدین بچوں کو ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔اسی لیے تو کہتے ہیں Health Is Wealth۔'' ثمر نے کسی نامور قانون دان کی طرح نکتۂ استدلال پیش کیا۔انجانے میں ماں پر بھی چوٹ کر دی تھی جو سر درد کی وجہ سے اکثر کھانے کو دوڑتی تھیں۔
''کچھ بھی سہی..... خاندانی لوگوں کی اپنی ایک وضع داری ہوتی ہے۔کیسے بھی حالات ہوں آنے والوں کو عزت ضرور دیتے ہیں۔''
''وہ تو ٹھیک ہے امی جان..... ابھی کچھ دن پہلے ہی ان پر فالج کا اٹیک بھی ہوا تھا۔اور آپ جانتی ہیں فالج

کا اثر دماغ کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ جب بندے کا دماغ ہی متاثر ہو تو اس سے خانداٹی پن اور اخلاقیات نبھانے کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس پر رحم کھانا چاہیے۔ یہی انسانیت ہے۔ ثمر بہت تحمل اور دھیمے پن سے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ارے ہم تو ڈنگر مویشی ہی بھلے..... نہیں ہے انسانیت..... خبردار جو تم نے آئندہ مجھے اس دروازے کا منہ دکھایا۔ میرے بیٹے کے لیے ایک سے ایک عزت دار گھرانہ موجود ہے اس شہر میں.....''

ثمر کا پاؤں ایکسیلیٹر پر ذرا زور سے پڑ گیا۔ لگا کار قابو سے باہر ہو گئی گھبرا کر پاؤں ہی ہٹا لیا۔

''آئندہ.....؟ اوہ..... گاڈ..... یہ تو بڑا سیدھا سیدھا کام تھا۔ ایک دم ٹیڑھا کیسے ہو گیا۔ یوں لگا۔ ریشم اُلجھ گیا..... سرا گم ہو گیا۔

''ابھی آپ ریلیکس کریں امی جان..... ایسی بھی کوئی آفت نہیں آ رہی.....'' اس نے کمال چابکدستی سے موضوع سے ہٹنے کی کوشش کی۔

''ابھی نہ کبھی..... خبردار جو تم نے آئندہ میرے سامنے اس لڑکی کا نام لیا لڑکی اچھی ہے..... خوبصورت ہے..... پڑھی لکھی ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں لڑکی نہیں اس کا پورا خاندان دیکھا جاتا ہے۔''

ثمر خاموش رہا۔ کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ جتنی آگ بجھانے کی کوشش کرے گا آگ اتنی ہی بھڑکے گی۔

''سن رہے ہو ناں میری بات؟'' اس مرتبہ ثمر کی طرف سے جواب نہ آیا تو بانو آپا کو مغالطہ ہوا کہ شاید اس نے اتنی اہم بات سنی ہی نہیں۔

''جی..... جی..... سن لیا.....'' اب اتنا تو کہنا ہی تھا۔

بانو آپا نے اب نڈھال انداز میں بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر دبانے لگیں۔ اس وقت وہ ثمر کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ نہیں کر رہی تھیں واقعی ان کے سر میں درد ہو رہا تھا۔

شبیر حسین کا چہرہ گھڑیال کے پنڈولیم کی طرح آنکھوں کے سامنے متحرک تھا۔

☆......☆......☆

چمن نے بڑی بے اختیاری کیفیت میں ثمر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ کئی دن گزر چکے تھے عطیہ بیگم کے انداز بتا رہے تھے وہ کھٹک رہی ہیں۔ حلیے بہانے سے چمن کے پاس بیٹھ کر ثمر کی بات شروع کر دیتی ہیں۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ بات سنبھالنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ خوف کی تمام حدود توڑ کر ہمیشہ کے لیے بے خوف ہو جانا چاہتی تھی۔ ثمر کے منہ سے حتمی فیصلہ اپنے کانوں سے سن لینا چاہتی تھی۔ تاکہ وہ آگے کا سوچے اور اپنے والدین کو سلیقے سے مطلع کرے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واپس آ گئی ہے۔ تمام مروتیں مصلحتیں دامن جھٹک کر رخصت ہو چکی ہیں۔

رنگ پاس ہو رہی تھی۔ دھڑکنیں موجوں کی طرح متلاطم تھیں گویا سینے کی دیواریں توڑ کر حدود سے آگے بہنے کو بیتاب ہوں۔

کال ریسیو نہ ہوئی..... ریکارڈنگ چلنے لگی۔ مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا..... اس نے پھر ٹرائی کیا۔ ایک بار..... دوبار، تیسری، چوتھی پھر پانچویں مرتبہ..... مگر ہر مرتبہ Not Responding......

یہ Not-Responding ہی دراصل زبردست Response تھا۔ جواب تو مل گیا تھا۔
اس نے موبائل کان سے ہٹایا تو ہاتھ ٹوٹی شاخ کی طرح نیچے آیا۔
''ٹھیک ہے...... یہی ہونا چاہیے تھا۔''
مہینے میں تیس دن سورج طلوع ہوتا ہے۔ جب بھی سورج نے کھڑکیوں سے اس کے گھر میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں کی نمی کرنوں کو دھندلا دیتی تھی۔ رات گھمسان کے رن...... صبح محبت کا لاشہ......
معاشرہ' ماں باپ، ورنہ رفاقت' مروت' محبت' مصلحت' ایثار' صبر' برداشت' ان بیساکھیوں کے سہارے ہی تو یہ شادی چل رہی تھی۔ اور شاید چلتی رہتی۔ اگر لوگوں کے مکروعیاری کے پھندے کچھ ڈھیلے پڑتے۔
اس نے رخساروں پر آئے آنسوؤں کے قطروں کو پوروں سے صاف کر کے یوں جھٹکے...... جیسے ساری جمع پونجی خیرات کر کے دامن جھٹک رہی ہو۔ موبائل کی طرف دیکھا۔ آخری امید کا استعارہ...... ہزاروں کی شے جو ایک آن میں بے وقعت محسوس ہوئی۔
رابطے ٹوٹ گئے۔ رابطے کا ذریعہ بے معنی ہو گیا...... وہ اسے یوں پھینک کر آگے بڑھی۔ جیسے سابقہ تعلق کے ساتھ اسے بھی دفنا دیا ہو۔

☆......☆......☆

ایک فضول، ناکارہ انسان کو کیوں صدائیں دے رہی ہو؟ کچھ نہیں دیا میں نے تمہیں...... مگر اب میری آنے والی خوشیاں تمہیں زخم پر زخم دیں گی۔ ایسے زخم جن کا مرہم ہی نہیں ملتا...... ثمر کے ہونٹوں پر ایک تلخ و بے رحم مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جس کی کال آتی تو وہ سیل Silent پر کر دیتا...... اور آنکھوں پر بازو رکھ لیتا۔ ہر آنے والی کال کے ساتھ اس نے یہی سلوک کیا۔ جب خاموشی طاری ہو گئی اور پانچ منٹ تک کوئی کال نہ آئی تو اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ پانچ مس کال بتا رہا تھا۔
''پانچ ہزار سال بھی پکارتی رہو تو اب جواب نہیں ملے گا۔''
''تمہاری ان صداؤں کا جواب اب میرے بچے دیں گے۔''
''میری ماں کے سامنے دس مرتبہ ذلیل کیا...... ذلت کے یہ زخم اس وقت تک رستے رہیں گے جب تک میں ماں کو کھیلنے کے لیے ایک پوتا یا پوتی نہیں دوں گا۔''
''ہمیشہ کے لیے خدا حافظ...... ناشکری اور انتہائی ظالم عورت......''
ثمر نے سیل فون ایک طرف رکھ دیا اور بیڈ سے اُتر کر بڑی اضطرابی کیفیت میں اپنے بالوں پر ہاتھ چلائے۔
''اُدھر نانا...... اِدھر میری ماں......''
اگر امی جان نہیں مانیں...... تو میں خود ہی ندا سے نکاح کر لوں گا۔ اس کے بعد تو امی جان کو ہر صورت ندا کو قبول کرنا پڑے گا۔ کرنا پڑے گا...... ان کی مجبوری ہے...... مگر پہلے ندا کو تو لائن پر لائیں...... ایک نمبر کی بے وقوف لڑکی...... مگر یہ بے وقوف لڑکی ہی میرے سارے زخموں کا مرہم ہے۔
اس نے اسی اضطراری کیفیت میں آگے بڑھ کر دریچے کھول دیے۔ شام کی ٹھنڈی ہواؤں نے اس کے اعصاب پر خوشگوار اثر ڈالا اور ذہن آگے کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔
''تم خود کو بہت ہائی فائی کوالیفائیڈ سمجھتی ہو...... بہت زعم ہے اپنی ذہانت پر مگر میرے حساب سے ایک نمبر کی

احمق ہو۔"

جو عورت مرد کو ضد دلائے...... اس سے زیادہ احمق کون ہوگا؟ Stupid...... "

"کل ندا کو آفس بلا کر سکون سے بات کرتا ہوں۔" اس کی بے قراری و اضطرار کو قدرے قرار آیا۔

☆......☆......☆

"پاپا...... حالات فی الحال بہت اُلجھے ہوئے ہیں۔ مگر آپ پریشان نہ ہوں چند دنوں کی خاموشی اور دوری مناسب ہے تاکہ غصہ اترنے کے بعد ذرا ہوش و حواس کے ساتھ غور کیا جائے۔

"میرا تو دل ڈوب رہا ہے، چمن...... خدا کے لیے...... جو بولو...... سچ بولو......" عطیہ بیگم تھرا کر رہ گئیں۔

"امی...... آپ یقین کریں...... میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ آپ کو ثمر کی امی کا اچھی طرح پتہ ہے...... وہ ہر وقت مجھے بے اولادی کا طعنہ دیتی رہتی ہیں۔ ثمر کی دوسری شادی کی بات کرتی ہیں۔ سوچیں وہ مجھے گھر سے نکالنے کے لیے کیا کچھ نہ کرتی ہوں گی...... ثمر بھی انسان ہیں...... ماں سے خون کا رشتہ ہے اور مجھ سے کاغذ کا...... Extreme سچویشن میں ان کا جھکاؤ ماں کی طرف ہی ہوگا...... یہ نیچر ہے۔

"وہ روٹین میں میرا بہت خیال کرتے ہیں۔ زیادہ تر امی جان کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ چمن نے سمجھایا۔

"ابھی تو شادی کو پانچ سال ہی ہوئے ہیں۔ لوگوں کے ہاں تو دس دس سال بعد بھی اولاد ہوتے دیکھی ہے۔ اللہ پر بھروسہ نہیں اس ظالم عورت کو...... اگر اس کی اپنی بیٹی بے اولاد ہوتی تو پھر کیا کرتی۔ عطیہ بیگم رونے لگیں۔

بہت سخت آزمائش ہے عطیہ بیگم...... اور مقام بے بسی بھی...... انسان کو اپنی اوقات پتہ چل جاتی ہے کہ وہ کتنا زور آور اور با اختیار ہے اور کتنا بے اختیار...... خود کو سنبھالو...... وہ کہتے ہیں ناں کہ

تاب لاتے ہی بنے گی غالب

واقعہ سخت ہے اور جاں عزیز

قرآن کو بہت توجہ اور ذمہ داری سے پڑھنا چاہیے۔ لوگ تلاوت کر کے چوم کر اونچے طاق پر سجا دیتے ہیں۔

صاف صاف لکھا ہے۔ کہ تم نے کہہ دیا کہ ہم ایمان لائے...... اور ہم اس کے بعد تمہیں ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟ تم آزمائے جاؤ گے۔ پھر ایک اور جگہ رب العالمین فرماتا ہے۔

"تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہاری آزمائش ہیں۔"

مشکور احمد کو مقام بے بسی پر وہی واحد سہارا یاد آیا۔ جو سب سے مضبوط سہارا ہے۔ اولاد کے دکھوں نے انہیں قدرتی طور پر اللہ سے قریب کر دیا تھا۔ دل نے عین اس وقت دھوکہ دیا جب اس کی قوت کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ انجیو پلاسٹک کروا کر ہاسپٹل سے گھر لوٹے تو بار بار ایک ہی خیال ذہن پر ضربیں لگا تا رہا۔

اگر انجیو پلاسٹک کرانے کی مہلت نہ ملتی؟ دل پر دھرا ہاتھ دھرا ہی رہ جاتا؟

یہ زندگی ہے؟

سات پشتوں کے لیے پلاننگ...... اپنے اگلے پل کا پتہ نہیں......

اس کے بعد دن رات بدل گئے۔ انہیں خود یاد نہیں تھا کہ وہ قرآن کو ترجمے اور تفسیر کے ساتھ کتنی بار پڑھ چکے ہیں۔

اسی ذوقِ قرآن نہمی نے ان کے قلب کو صبر کی روح اور اس کی لذت سے ہمکنار کیا۔ یہ ذائقہ ہاتھ لگا تو سارے ذائقے پھیکے پڑ گئے۔ قدرت بڑی حکمت سے اپنے معاملات چلاتی ہے۔ اسی لیے کائنات کا نظام بہت توازن سے چلتا رہتا ہے۔

مشکور حسین کو صبر کی لذت سے ہمکنار کر کے نئے سرے سے بیٹیوں، بیوی اور معصوم بچوں کا سرپرست بنایا..... تاکہ یہ جانیں جیتی رہیں اور ان کے ذمے جو کام طے ہوئے ہیں وہ کرتی رہیں۔ موت سے پہلے کوئی مر جائے۔ اسے حرام موت کہا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نظامِ فطرت میں جاہلانہ جرأت و دخل اندازی ہے۔

ان کی ذہنی کیفیت اس مسافر جیسی ہو گئی تھی جس کا سامانِ سفر ہر وقت بندھا رہتا ہے۔ خیال میں اتنی لطافت آ گئی تھی کہ قلب کی ہر دھڑکن ''اللہ، اللہ'' پکارتی تھی۔

چمن کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ دل کے مریض باپ کا خیال شیر خوار بچے کی طرح رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور باپ کا دل حکمت کی کتاب بن چکا ہے۔ جو موت کے خوف کو شکست دے کر صبر و رابطے کی منزل پر پہنچ گیا ہے۔

مشکور حسین نے چمن کے سر پر دستِ شفقت رکھ دیا۔

''الحمدللہ، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ ذہن ٹھیک ٹھیک کام کر رہا ہے۔ اس نے اپنے سوا کسی کا محتاج نہیں بنایا۔

اِس مختصر سی زندگی میں اس کا شکر کیسے ادا کریں۔ بیٹا.....؟ وقت کم ہے اور کام بہت..... ہمت اور حوصلے سے کام لو..... اپنی طرف سے مزید کوئی بگاڑ پیدا نہ ہونے دو..... میں ثمر سے خود بھی بات کر سکتا ہوں مگر ابھی نہیں.....

باپ کی ہتھیلیوں سے نور پھوٹ رہا تھا جو نڈھال دماغ کو نئی زندگی دے رہا تھا۔

شوہر کا صبر و استقامت دیکھ کر عطیہ بیگم کو آنسو روکنا پڑے۔ اپنی کم ہمتی کا احساس کر کے خجالت و شرمساری کی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

سامنے ایک دلکش جامہ زیب خوش شکل باوقار سی لڑکی کو دیکھ کر یاور دم بخود رہ گیا تھا۔ اسے ''بر دکھوے'' کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ فردوس نے آگے بڑھ کر خود اس کا لباس منتخب کیا تھا۔ تیار ہونے کے بعد پرفیوم اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔

''بیٹا اچھی طرح چھڑک لو..... خوشبو کا اپنا ایک اثر ہوتا ہے۔''

یاور ایک ڈمی کی طرح بے چون و چرا ماں کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ چاروں اور پھیلی اُداسی جو کسی طرح جان نہیں چھوڑتی تھی، آج وہ اس کی گرفت سے نکل بھاگنے کو پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔

ہونے والی نئی نویلی سسرال پہنچا تو یوں خوش آمدید کہا گیا گویا کسی ریاست کا فرمانروا دورے پر نکلا ہو۔

چند رسمی تعارفی باتوں کے بعد ربیعہ کو بھی بلا لیا گیا وہ آتے ہی سلام کر کے اپنی ماں کو پہلو میں سلام کر کے بیٹھ گئی۔

اکیس بائیس سال کی لڑکی بہت اعتماد سے چلتی اندر آئی تھی۔ روایتی طور پر سر جھکا کر گھبرائی شرمائی نہیں تھی۔
یاور نے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا...... یہ...... یہ...... لڑکی...... اس کی منکوحہ بننے جارہی ہے؟ اسے تو اس عمر میں ایک سے ایک کنوارے کا رشتہ مل سکتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر جہاں خوش ہوا ساتھ ہی اُلجھ بھی گیا۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ فردوس کی چرب زبانی کے سامنے سب کے سکے کھوٹے ہوجاتے ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے کی فرمانبرداری، جائیداد، سادگی کی جو تصویر کشی کی تھی۔ اس میں اتنے رنگ تھے کہ تصویر دیکھنے والا رنگوں ہی میں کھو کر رہ جائے، اسے تو دیکھنے سے پہلے ہی قبول کرلیا گیا تھا۔
پورے بیس تولے سونا بری میں چڑھاؤں گی...... پہلی ملاقات میں ہی فردوس نے بیس تولے سونے کا ذکر کرکے سیکنڈ پارٹی کو مدہوش کردیا تھا۔ اب ان کو یہ تو نہیں بتایا جاسکتا تھا کہ یہ بیس تولے سونا تو ان کی مرحومہ بہو کا ہے۔ جس میں دس تولے تو ماں کے گھر کا ہے جس پر شادی کے بعد ان کا قبضہ ہوگیا تھا کہ حالات اچھے نہیں ہیں۔ یہ چیزیں گھر میں نہیں رکھنا چاہئیں۔ بینک لاکر لے کر اسے محفوظ کردیا تھا اور بینک لاکر کی چابی ان کی وارڈ روب میں کپڑوں کے نیچے دبی پڑی رہی۔
خوبصورت، برسرروزگار، ہزار گز کا اپنا بنگلہ...... اکلوتا...... ماں باپ کا جو کچھ سب اس کا......
ہاؤس بلڈنگ کے لون سے بنا ہوا گھر جس کی بیس سال سے اقساط بھری جارہی تھیں جو اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا...... ربیعہ کے ماں باپ تو صرف ہزار گز کے بنگلے ہی سے متاثر ہوسکتے تھے جو آزاد تھا ہاؤس بلڈنگ کے لون کا بارِ احسان نہیں تھا۔ جو 100% یاور کا تھا یعنی اس کی بیوی کا تھا۔
باکردار خوشحال مرد کی عمر بھی پھر میٹر نہیں کرتی۔
ربیعہ کے والدین آفس سے قرض لے کر بچیوں کی تعلیم اور شادیاں کرتے رہے تھے۔ دو بیٹیوں کی شادیاں ہوچکی تھیں، ربیعہ کی باری آئی تو باپ کی ریٹائرمنٹ کا زمانہ آگیا...... اب سارے قرضے منہا ہونے کے بعد جو کچھ ملنا تھا اسی نے نیندا اڑا دی تھیں کہ آگے کیا کرنا ہوگا؟ فردوس جیسی لالچی عورت نے جب یہ کہا کہ جہیز کے نام پر ایک جوڑا کپڑا بھی نہیں لوں گی تو ربیعہ کے والدین نے سکون کا سانس لیا۔
اور فردوس نے جہیز نہ لینے کا فیصلہ دل پر پتھر رکھ کر کہا تھا کیونکہ وہ آنے والی کو ہمیشہ کے لیے ممنونِ احسان کرنا چاہتی تھی۔
ذرا بھی زبان کھولی تو فوراً یہ کہہ کر دبا دیا کہ ہم نے کون سا تمہارے باپ سے جہیز لیا ہے۔
''آج سے یہ میرا نہیں آپ کا بیٹا ہے...... ایسا بیٹا آپ کو دے رہی ہوں کہ لوگ ایسے بیٹے کی تمنا کرتے ہیں۔ دعائیں مانگتے ہیں۔'' فردوس بڑے فخر و زعم سے یاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
''ماشاءاللہ......'' ربیعہ کی ماں کی کیفیت یہ تھی گویا سالوں سے خریدا ہوا لاٹری کا ٹکٹ اچانک کام آگیا ہو۔
اب آپ یہ بتائیں کہ نکاح کی کون سی تاریخ دے رہی ہیں۔ فردوس پر بہت ہی عجلت سوار تھی۔ 'لڑکا لڑکی' سامنے بیٹھے تھے اور وہ شادی کی تاریخ پر آگئی تھی۔
وہ میں صلح مشورہ کرکے فون پر بتادوں گی۔ ربیعہ کی ماں نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے بڑی وضع داری سے جواب دیا ساتھ ہی ربیعہ کو وہاں سے اٹھنے کا اشارہ بھی کردیا۔ ربیعہ اشارہ پاتے ہی اُٹھ کر چلی گئی۔
یاور کو یوں لگا جیسے روشن دن کو بادلوں نے سرِ شام کے منظر سے بدل دیا ہو۔

اُداس چہرہ، آنکھوں میں آنسو، ملگجے کپڑے..... سالوں سے ایسی ہی تصویر دیکھ رہا تھا۔
کبھی بھی مرحومہ نے شوہر کو مائل کرنے کے لیے پہل نہیں کی تھی۔
وہ فطری تقاضے سے مغلوب ہوکر پہلو میں دیکھتا تو مرحومہ مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑی نظر آتی۔
بہشتی زیور میں لکھا ہے جو عورت شوہر کے تقاضے پر نافرمانی کرے تو اس پر صبح تک فرشتے لعنت کرتے ہیں۔
مگر یاور کو اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے محسوس ہوتا تھا کہ اس تھکی ہاری عورت کو بے آرام کیا تو فرشتے اُس پر لعنت کریں گے۔
کیونکہ فطری طور پر وہ نرم طبع واقع ہوا تھا اس لیے اکثر اپنے جذبات قربان کر دیا کرتا تھا۔
مگر.....اب.....تو جنت عرضی کا نظارہ تھا۔
''فرلیش کنسائنمنٹ'' سامنے تھی کاروبار پھلتا پھولتا نظر آ رہا تھا۔ ربیعہ کے گھر سے نکلتے وقت، وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ رہ رہ کر ماں پر پیار آ رہا تھا۔
''ماں آخر ماں ہوتی ہے.....جیو ماں۔''

☆......☆......☆

علی الصبح سخت بھوک محسوس ہوئی تو بے تاب ہوکر کچن میں چلا آیا۔ بانو آپا فجر کی نماز اکثر اپنے بیڈروم ہی میں ادا کرتی تھیں۔
اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا کبھی اپنے ناشتے کے لیے سوئی ہوئی ماں کو نہیں جگایا..... بھوک لگی کچن میں آیا جہاں بہت کچھ ہوتا تھا۔ کبھی سینڈوچ بنا لیا..... کبھی بہت فرصت ہوئی تو آملیٹ بنا لیا ساتھ چائے یا کافی۔ افشاں کی شادی ہونے تک اکثر افشاں ہی اس کا ناشتہ بناتی تھی۔ اس کی دو دن کی چھٹی ہوتی تو بانو آپا اپنے بچوں کے لیے بہت اہتمام سے تہہ والے پراٹھے بنا لیا کرتی تھیں۔
اب تو وہ دائمی مریضہ تھیں۔ ثمر انہیں بے آرام کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔
چپ چاپ کچن میں آ کر توسٹ پر مارجرین لگایا کافی مکسر سے بڑا مگ کافی کا تیار کیا اور وہیں ایک چیئر پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔
بالکل خالی الذہن تھا۔ ایک تو بیدار ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی دوسرے رات کھانا نہ کھانے کی وجہ سے بھوک بہت شدت سے لگ رہی تھی۔
''ارے ساری رات نیند نہیں آئی..... بلڈ پریشر کی گولی کھانا پڑی۔''
بانو آپا کی آواز لاؤنج میں گونجی تو گویا ثمر اپنی جگہ سے اچھل ہی پڑا۔
''تم کیا بھنگ پی کر سو رہی تھیں..... دس مرتبہ تمہیں فون ملایا، تم نے ایک مرتبہ نہ اٹھایا۔''
اب خاموشی چھا گئی تھی یقیناً وہ اپنے مخاطب کا جواب سن رہی تھیں۔ ثمر سمجھ گیا..... صبح سویرے وہ افشاں ہی کو فون کر سکتی تھیں۔ اور رات دس مرتبہ اسے ہی ٹرائی کر سکتی تھیں۔
غالباً بانو آپا احتیاط کے ضمن میں اپنے بیڈروم سے باہر آ گئی تھیں۔ مبادا بند دروازے کے پیچھے ثمر ماں بیٹی کے راز و نیاز سن لے۔

''ارے ایسا خبطی بڑھا...... جسے عورت ذات سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں جب رشتے ناتے بناتے ہیں تو پہلے اپنی آنے والی نسل کا سوچتے ہیں۔ ایک بچہ بھی اپنے پرنانا پر چلا گیا تو خاندان کا نام روشن ہو جائے گا۔''

''توبہ توبہ......''

''اے ہے...... شکل دیکھو تو اتنی معصوم جیسے جنگل میں پروان چڑھی ہے دین دنیا کا کچھ پتہ ہی نہیں...... پتہ نہیں کب سے ثمر کو اپنے پیچھے لگا رہی ہوگی...... جب ہی تو بیوی کو فارخطی دیتے ہی مجھے اس کے دروازے پر لے کر پہنچ گیا...... لگتا کچھ دن پہلے سب کچھ طے ہو گیا تھا۔'' ثمر کے ہاتھ سے کافی مگ گرتے گرتے بچا۔

اب پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ بنافل اسٹاپ کا مہ بولی تھیں۔ ظاہر ہے اب افشاں نے بھی ایک پیراگراف تو پڑھنا ہی تھا۔ ثمر کے چہرے پر تفکرات کی لکیریں کھنچ گئیں۔

''ارے سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکل پڑے۔ میں تو نہیں کرتی میری طرف سے 'ناں' اور قیامت تک ناں...... ارے ہم نے اپنا تماشہ بنانا ہے۔''

''ثمر نے بہت کہا تو کہہ دوں گی جا کر خود ہی کر لو...... میں جگ ہنسائی نہیں کرواؤں گی۔''

''اپنی اولاد کو برا بھلا کہہ رہا تھا...... میرے سامنے میرے بیٹے کو بے بھاؤ سنائیں۔ کون ماں ہوگی جو یہ برداشت کرے گی۔ بڑے میاں شیشے کا باکس بنا کر اس میں سجا دیں اپنی نواسی کو......'' بانو آپا جی بھر کر بھڑاس نکال رہی تھیں۔

ثمر مشکل میں پھنس گیا تھا۔ باہر نہیں جا سکتا تھا کہ ماں کو شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ بیٹھے رہنے سے الگ پریشانی تھی کہ بانو آپا خود ہی کچن میں نہ آ جائیں۔

بہر حال اسے راستہ نظر آ گیا۔ وہ ڈرائی کچن کے راستے باہر لان میں چلا آیا اور یوں کھل کر سانس لیا گویا سرنگ کا سفر تمام کیا ہو تصویر واضح ہو گئی اب وہ بڑے کینوس پر کھیل سکتا تھا۔ کھل کر سوچ سکتا تھا۔ فیصلہ کن ہو کر یکسو ہو سکتا تھا۔

''اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ آخر 'ندا' پر کیوں اٹک گیا ہے؟ کہیں مجھے اس احمق لڑکی سے محبت تو نہیں ہو گئی؟'' اس نے گھبرا کر سوچا۔

''محبت بار بار کیسے ہو سکتی ہے؟'' وہ پھر الجھا۔

میں نے تو چمن کے ہوتے ہوئے کبھی ندا کے بارے میں الٹا یا سیدھا کبھی سوچا ہی نہیں۔

یہ سب چمن کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ناقدری کرنے والی عورتیں ہی اپنے شوہروں کو شٹل کاک بنا دیتی ہیں۔

انسان خود فریبی کی لذت کا محتاج نہ ہو تو پل بھر میں دنیا میں نظام عدل قائم ہو جائے۔

یہ خود فریبی چوٹ پر چوٹ دیتی ہوئی آخر اس مقام پر کھڑا کر دیتی ہے۔ جب سفید چاندنی بچھا کر حلقہ باندھ کر لوگ آیت کریمہ کا سوا لاکھ پڑھ کر ختم کراتے ہیں اور اپنے ظالم ہونے کو بہر حال تسلیم کر لیتے ہیں۔

یہ اُس عورت کا ہی قصور نکلا۔ جو مردانہ وار حقیقت پسند تھی فطرت سے محبت نے آگہی کے در وا کیے۔ آگہی، صبر و ٹھہراؤ کے سلیقے سکھاتی ہے۔

صابرہ، شاکرہ، پتھروں سے سر پھوڑنے والی نڈھال عورت...... بالآخر قصور اسی کا طے ہوا۔ اس نے اپنے شوہر کو 'شٹل کاک' بنا دیا اب وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ ایک کمزور محتاط عورت نے اس کو انسان کے

بجائے شٹل کاک جو بنا دیا تھا۔
اب وہ انتقاماً کسی بھی عورت کو شٹل کاک بنا سکتا تھا کیونکہ وہ مظلوم تھا...... اور یہ اس کا پیدائشی حق تھا۔ جب چاہے کسی بھی عورت کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دے۔
بانو آپا نے انجانے میں اپنے سعادتمند بیٹے کے بندھے ہوئے پَر کھول دیے تھے۔

☆......☆......☆

''دیکھو بیٹا...... گھر بنانے اور سنبھالنے کی ذمہ داری تو بہر حال عورت کے کندھوں پر ہی ہوتی ہے۔ تم خود چلی جاؤ...... وہ تمہارا گھر ہے۔ خدانخواستہ علیحدگی تو نہیں ہوئی...... تم اس کی بیوی ہو...... خود چلی جاؤ گی تو اس کے دل میں تمہاری قدر ہی بڑھے گی۔''
عطیہ بیگم منتشر ذہن کے ساتھ اسے اپنی طرف سے 'حکیمانہ مشورے' دے رہی تھیں۔ دنیا کیا کہے گی؟ ایک اوسط درجے کا ذہن بس یہیں تک سوچتا ہے۔ پھر ثمر نے ساس سُسر کا جو احترام آج تک کیا تھا اس کی وجہ سے بھی دل کو بہت امیدیں تھیں کہ وہ کوئی بگڑا ہوا شخص نہیں ہے۔
میاں بیوی کا رشتہ تو ہے ہی ایسا...... دشمنوں کی طرح لڑتے ہیں۔ دوستوں کی طرح نباہتے ہیں۔''
''بس کر دیں امی...... ذلت برداشت کرنے کی بھی حد ہوتی ہے۔''
چمن نے بڑے بے ساختہ اور برجستہ انداز میں ماں کو مزید کچھ کہنے سے روکا تھا۔ اور آنکھیں ایک دم ڈبڈبانے لگی تھیں۔
باندیوں کی طرح خدمت کرتی ہوں۔ شوہر کی بھی اور ساس کی بھی کہ وہ خوش رہیں۔ انہیں میری ذات سے ہر طرح کا آرام ملے۔
''امی...... کوئی مذاق ہے؟ ہر وقت کی ناقدری، جو کام میرے اختیار میں نہیں وہ تو میں نہیں کر سکتی۔''
''انسان کا بچہ ہوں۔ مجھے کسی نے دام چکا کر خریدا نہیں ہے۔ اتنی ناقدری اور ناشکری۔ انسان کا بچہ ہوں۔ کوئی پتھر نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے تمام رکے ہوئے آنسو بہانا شروع کر دیے۔
''اب جب تک ثمر مجھے نہیں لینے آئیں گے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ ہر دوسرے دن...... نکلو یہاں سے...... جاؤ یہاں سے......''
''آپ کو دنیا کا خیال ہے اپنی بیٹی کی اس تکلیف کا نہیں جو وہ چوبیس گھنٹے اٹھاتی ہے...... ہر وقت بے اولادی کا طعنہ، موڈ خراب...... بات بات پر تذلیل......'' وہ بری طرح روتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔
اس باہمت بیٹی کو تڑپ تڑپ کر روتے دیکھ کر جو فولادی اعصاب کی حاصل نظر آتی تھی، عطیہ بیگم کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔
''میرا یہ مطلب نہیں تھا بیٹا......'' وہ بے اختیار چمن کو گلے سے لگا کر خود بھی رو پڑیں۔
''آپ کی قسم امی...... روز مرتی ہوں، روز جیتی ہوں۔ نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی...... ثمر آئیں گے تو ہی جاؤں گی۔'' وہ ماں کے سینے سے لگی بلک بلک کر کہہ رہی تھی۔
''ماں صدقے جائے...... بیٹی نے ماں کی قسم کھائی تو دنیا سے خوفزدہ ماں، مامتا کے ہاتھوں پل بھر میں فیصلہ کن ہو گئی۔''

''میں آج کے بعد تم سے کبھی نہیں کہوں گی۔ تمہاری طرح ثمر کے آنے کا انتظار کروں گی۔''

''بس اب خاموش ہو جاؤ...... اتنا مت روؤ...... میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ تم عاقل، بالغ، شادی شدہ با اختیار ہو...... میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ امی...... ظلم پر سمجھوتہ کرنے سے ظالم کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔''

''جتنی بار واپس گئی ہوں اتنا ہی ظلم بڑھا ہے...... کم نہیں ہوا......''

چمن کا جملہ ایک اڑتا ہوا تیر تھا۔ جو سیدھا دل میں ترازو ہو گیا۔ عدلیہ بیگم کو یوں محسوس ہوا کہ ان کی بیٹی نے یہ سارے ظلم ان کی وجہ سے برداشت کیے ہیں۔ ماں کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے مسلسل تکلیف دہ زندگی گزاری ہے۔ احساسِ جرم سے لب بستہ ہو گئیں اسی وقت تہیہ کر لیا...... اب کچھ نہیں بولیں گی۔ مشوروں سے نہیں نوازیں گی۔

انہوں نے چمن کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی اور نم آنکھوں پر بوسے دیے۔

''ٹھیک ہے میرا بیٹا...... تم وہ کرو جس میں اپنی بہتری سمجھتی ہو۔ میں تو تمہاری آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتی۔''

☆......☆......☆

''سر...... آپ......؟'' ندا اچانک رات گئے ثمر کو سامنے پا کر حواس باختہ نظر آنے لگی۔ وہ شبیر حسین کو دوا کھلانے جا رہی تھی کہ کال بیل نے اس کے قدموں کا رخ موڑ دیا۔ پہلا خیال آیا کہ پڑوسن نرگس آنٹی ہوں گی۔ دوسرا خیال حکیم صاحب کی طرف گیا...... اور حکیم صاحب کا خیال آتے ہی اس نے فوری فیصلہ کیا تھا کہ وہ آج بے عزتی کر کے ہی ان کو اس گھر سے رخصت کرے گی۔ مگر جب محتاط انداز میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

اور جواب ملا۔ ''کیا گیٹ کھل سکتا ہے؟ اندر آ سکتا ہوں؟'' تو اس نے بے اختیاری کیفیت میں گیٹ کھول دیا تھا۔

''جی نانا جان سے ملنے آیا ہوں...... وہ سو تو نہیں گئے؟'' ثمر نے جلدی سے اپنی پوزیشن واضح کی۔ مبادا ندا کچھ اور سمجھے یا اُلجھ جائے۔

''نانا جان تو ابھی جاگ رہے ہیں...... ویسے تو ان کا سونے کا دل ہی نہیں چاہتا...... نیند کی گولی کھلا کر سلاتی ہوں۔''

''مگر وہ نیند میں بھی 'Busy' رہتے ہیں۔ شاید فرشتوں سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے حکیم صاحب ان کے خواب میں آتے ہوں کیونکہ گھر میں آنے پر تو میں نے پابندی لگائی ہوئی ہے۔

ندا گیٹ بند کر کے اس کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''لیکن سر...... ایک بات ہے...... پلیز آپ مائنڈ مت کیجیے گا؟''

''آپ بولیے...... یوں سمجھیں میں اپنا مائنڈ گاڑی کی سیٹ پر بھول آیا ہوں......'' ثمر نے اسے مکمل طور پر مطمئن کیا۔

''آپ نانا جان کے سامنے اس وقت مت جائیں۔ ان کا B.P شوٹ ہو سکتا ہے۔ اور پھر نیند کی ٹیبلیٹ بھی فوراً اثر نہیں کرے گی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں...... وہ قدرے شرمندہ انداز میں گویا ہوئی۔

''آخر.... کیا وجہ ہے..... ان کا B.P مجھے دیکھ کر کیوں شوٹ کر جاتا ہے۔ ثمر نے رُک کر ندا کی طرف دیکھا۔

''وہ کہتے ہیں آپ مجھے پٹا رہے ہیں۔ اب یہ ان کی اپنی سوچ ہے۔ مجھے تو پتہ ہے آپ ایسے نہیں ہیں...... آپ غلط قسم کے انسان ہوتے تو مجھے آفس میں پٹا لیتے۔ مگر وہاں تو آپ مجھے ڈانٹتے رہتے تھے۔

''Stop......'' ثمر نے اسے درمیان ہی میں روک لیا۔ حالانکہ وہ اسی ایک سانس میں مزید دو تین جملے بول سکتی تھی۔ ندا گھبرا کر ثمر کی شکل دیکھنے لگی۔

حکیم صاحب پوتے پوتیوں والے ہیں ایک کم عمر لڑکی سے شادی کا شرعی حق رکھتے ہیں۔

''میری تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔ میں کسی لڑکی کو پٹا نہیں سکتا مگر شادی تو کر سکتا ہوں۔''

''جی......؟'' ندا کے سر پر تو گویا چھت آ گری۔

''ہاں...... میں نانا جان سے یہی بات کرنے آیا ہوں۔''

''جی......؟'' ندا کے حواس جواب دے رہے تھے۔

''اصل میں مجھے ندا نام کی لڑکی سے شدید محبت ہوگئی ہے اور اس کی خاطر میں نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔''

''سر...... آپ ایسا مذاق نہ کریں کہ میں کھڑے کھڑے بے ہوش ہو جاؤں۔'' ندا اب روہانسی ہو کر کہہ رہی تھی۔

''ہاں ندا...... مجھے شادی کرنا ہے اور جلدی کرنا ہے۔ تمہیں انکار کرنے کا پورا حق ہے۔ یا تو انکار کر دو یا پھر مجھے نانا جان سے بات کرنے دو۔ میں اپنی والدہ کو اسی سلسلے میں لے کر آیا تھا۔''

''سر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...... اس دن ہاسپٹل میں آپ اپنی مسز کی اتنی تعریفیں کر رہے تھے۔''

''اس دن میرے ذہن میں تم سے شادی کرنے کا خیال نہیں تھا۔ پھر بھی میں اس لڑکی سے کبھی بھی اپنی بیوی یا X-Wife کی برائی نہیں کروں گا جس سے دوسری شادی کرنا چاہوں گا۔'' ثمر نے لاؤنج میں پڑے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے اب بہت سنجیدگی سے بات کی اور بیٹھنے کے لیے ندا کی طرف سے کسی تکلف آمیز فقرے کا انتظار نہیں کیا۔

''دوسری شادی......؟'' ندا آنکھیں پھاڑے ثمر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ظاہر ہے پہلے شادی کر چکا ہوں اور قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اب جو بھی شادی ہوگی وہ دوسری ہوگی۔ تیسری یا چوتھی نہیں۔'' ثمر 'گالی زدہ' تھا۔

'سازش زدہ' تھا۔

'نقصان زدہ' تھا۔

اس کا اعصابی نظام درہم برہم تھا۔

خالی کمرہ کھانے کو دوڑتا تھا۔

بستر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔

وارڈ روب، ڈریسنگ سے جانے والوں کی افسردہ سی مہک آتی تھی۔ ہیئر برش میں بالوں کے دو چار تار پھنسے ہوئے تھے وہ برش اٹھاتا تھا اور رکھ دیتا تھا...... مگر ٹوٹے ہوئے بالوں کو اس کی انگلیوں نے چھونے سے

انکار کر دیا تھا۔

پانچ سال میں کرائی گئی شاپنگز کا تخمینہ......

حق مہر معجل کی خطیر رقم......

ہر مہینے پاکٹ منی کے بیس ہزار......

پتھریلی زمین پر سبزہ اگانے کی مشقتیں......

ٹوٹل لاس (Total Loss) سو فیصد خسارہ......

جب انسان ہر وقت خسارے کا کھاتہ کھولے بیٹھا رہے تو اس کا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ زندگی بے رنگ و بے معنی نظر آتی ہے۔ مکمل خسارے کا یقین کرنے والے اپنا ذہنی توازن کھو دیتے ہیں۔ بظاہر وہ نارمل اور صاف ستھرے بھی نظر آتے ہیں۔

ثمر کی عقل و فراست کو ایک 'عورت کی گالی' کا کیڑا کھا رہا تھا۔ اس کی وحشتوں کا ادارک وہی کر سکتا تھا جو بالکل اسی طرح کے تجربے سے گزرا ہو۔

مظلوم عورت کو ننگی گالی دے کر گھر سے نکالنے والے کبھی عورت کے خسارے نہیں گنتے...... مگر اپنے کھلائے پلائے پر ضرور ہاتھ ملتے ہیں۔

عورت کی دن بھر کی بھاگ دوڑ اور راتوں کے رت جگے ان کی یادداشت میں نہیں ٹکتے...... کام کی زیادتی سے تھکی ہاری عورت کا ایک انکار مرد کا ہفتوں موڈ خراب رکھتا ہے۔ کبھی بحیثیت انسان عورت کو اپنی جگہ رکھ کر نہیں سوچتا...... نباہتی رہے، مسکراتی رہے، سہتی رہے...... تو سب اچھا...... اپنے جاندار اور انسان ہونے کا احساس دلانا ایک قیامت ہے۔ ہر طرف انتشار و ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی ہے۔

جس کی انتہا ہمیشہ کی علیحدگی پر بھی منتج ہو جاتی ہے۔

پھر سود و زیاں، نفع و خسارہ، حاصل و لا حاصل کا عذاب شروع ہوتا ہے ایک خلش ساری زندگی کا حاصل ہوتی ہے۔

خلش تو تھی...... اور اسی خلش نے اسے اپنے احسانات کی گنتی پر لگا رکھا تھا۔ اور جس دل میں خلش ہو وہ دماغ سے رابطہ کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ منطق کا تعلق دماغ سے ہے...... بے قرار دل منطق نہیں مانتا...... وہ ایک مکمل مرد ہے...... اسے ثابت کرنے کی جلدی تھی۔

ایک گالی چڑیل کی طرح اس کے تعاقب میں تھی۔

اِس چڑیل سے چھٹکارے کا منتر اسے مل رہا تھا۔ اسے ہر صورت یہ منتر قابو کرنا تھا۔

''سر...... سر...... ندا کے حلق سے بمشکل آواز نکل رہی تھی۔

''بہت ہو چکا سر سر...... اب خاموش ہو جاؤ۔ اس وقت میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں...... مجھ سے کچھ اچھی توقع مت کرو...... ثمر نڈھال لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''کک...... کیا مطلب...... آپ پی کر آئے ہیں...... Drunk ہیں۔ ندا خوفزدہ ہو کر چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔ یوں بھی ثمر اسے اس وقت ایب نارمل محسوس ہو رہا تھا۔

میرا دل چاہتا ہے کچھ لوگوں کا خون پی جاؤں...... مگر یہ میرے بس میں نہیں......'' ثمر نے آہستہ سے کہا اور

نگاہ اٹھا کر ندا کی طرف دیکھا۔

''میں ایک شریف آدمی ہوں ندا..... مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''سر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں..... آپ گھر جا کر ریسٹ کریں..... ندا ابھی تک بدحواس تھی۔ اتنی دیر میں خاک پلے نہیں پڑا تھا۔

''ندا..... میں سیریس ہوں..... تمہارے عشق میں مرا جا رہا ہوں۔ اپنی بیوی کو چھوڑ دیا ہے میں نے تمہاری خاطر.....''

''جی.....؟'' ندا کو یوں لگا گویا قریب ہی زوردار دھماکہ ہوا ہو۔

''مجھے بہرصورت تم سے شادی کرنا ہے..... اور تم کیسی فضول سی زندگی گزار رہی ہو..... کیا زندگی بھر اسی طرح اکیلی رہو گی؟''

''سر..... آپ نے میری..... میری..... میری وجہ سے اپنی مسز کو..... ندا کی سوئی تو اب ایک جگہ اٹک کر رہ گئی تھی۔ نہ اسے نانا کا ہوش رہا تھا نہ دوا کا..... کھڑا ہونا محال تھا..... ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

تم یقین کرو یا شک..... شادی تو مجھے تم سے کرنا ہے۔''

''اگر تمہارے نانا جاں میری ای سے اچھی طرح بات کرتے تو وہ شادی ہی کی بات کرنے آئی تھیں۔ I Swear۔''

''لو..... اب تو وہ قسم بھی کھا بیٹھا تھا۔ اب ندا نے قدرے پُرسکون ہو کر زندگی میں پہلی بار بڑی سنجیدگی سے ثمر کا جائزہ لیا۔

''کبھی اشارے میں کچھ نہیں کہا..... اب بلاسٹ کر دیا ہے۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں سوچ رہی تھی۔

''سر آپ نے یہ سب کچھ مجھ سے پہلے کیوں شیئر نہیں کیا.....؟ اور میری وجہ سے اپنی مسز کو کیوں چھوڑا؟ میں تو بہت گلٹی فیل کر رہی ہوں۔ آپ کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔

''تمہیں گلٹی فیل کرنے کی ضرورت نہیں..... وہ عورت Deserve ہی نہیں کرتی تھی۔'' ثمر نے تڑپ کر سلسلۂ کلام منقطع کر دیا۔

''بہت بے عزتی کرتی تھی۔ آخر میں کب تک برداشت کرتا؟'' ثمر یوں بول رہا تھا جیسے اس پر جن آ گیا ہو۔ جس نے اس کے حواس اپنے کنٹرول میں لے کر اپنی باتیں شروع کر دی ہوں۔ اب اس کا انداز ایسا تھا گویا خودکلامی کر رہا ہو۔

آپ نے تو اپنی مسز کی بہت تعریف کی تھی۔

جھوٹ بولا تھا..... وہ کسی لائق ہوتی تو میں بار بار تمہارے پاس کیوں آتا؟ ثمر نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

''جھوٹ بولا تھا..... لیکن کیوں؟'' ندا مزید حواس باختہ ہونے لگی۔

''اس لیے کہ اُس وقت تک میں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔'' ثمر نے اب آہستہ آواز میں سر جھکا کر کسی مجرم کی طرح جواب دیا۔

''سر ایسا کچھ تھا تو آپ کبھی تو ظاہر کرتے.....''

''اب کر رہا ہوں ناں......'' ثمر نے برجستہ کہا۔
''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔'' ندا نے بے بسی کے انداز میں کہا۔ وہ درحقیقت بہت زیادہ اُلجھی ہوئی تھی۔
ثمر کی وحشت......
پھر اس کے عشق میں پاگل ہونے کا اعتراف...... اس جیسی نازک اعصاب لڑکی کے لیے یہ سب کچھ اتنا آسان نہ تھا۔
''میں آپ کے لیے ٹھنڈا لاتی ہوں۔ مجھے آپ کی طبیعت اچھی دکھائی نہیں دے رہی۔''
''ہاں...... لے آؤ...... بالکل یخ ٹھنڈا پانی...... جو میرے اندر بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا کر دے...... پلیز......''
ندا تو اذن پاتے ہی کچن کی طرف دوڑی۔
وہ گالی کے شعلوں کی بات کر رہا تھا ندا عشق کی آنچ کے زمرے میں لے رہی تھی۔
ابھی ابھی اس نے عشق کا دعویٰ کیا تھا۔
بے چاری عورت...... مرد مذاق میں بھی عشق کی بات کر دے تو آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنی بلائیں لینے لگتی ہے۔

☆......☆......☆

بانو آپا کے وجود میں تشویش کی لہریں تواتر سے دورہ کر رہی تھیں۔
''میرا دل کہتا ہے...... وہیں گیا ہوگا۔ چمن کے پاس جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاہ جی پکا کام کرتے ہیں۔''
''ہزار مرتبہ جائے...... میں تو اس لڑکی کو بہو نہیں بنانے والی...... شکلیں دیکھو کتنی معصوم شادی شدہ مردوں کو پھنسا لیتی ہیں...... کیا فنکاری ہے...... بانو آپا مصمم اور حتمی فیصلے کے باوجود بہرحال بے قرار بہت تھیں۔ آخر رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ ثمر کچھ بتائے بغیر گھر سے باہر تھا۔
زیادہ ضد کی تو میں بھی دل پر ہاتھ رکھ کر ہاسپٹل میں جا کر لیٹ جاؤں گی۔'' اندیشے شدید ہوئے تو حالات سے نبرد آزما ہونے کی ترکیبیں جلدی جلدی ڈھونڈنے لگیں۔ دل تھا کہ پھڑک پھڑک کر ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔
افشاں کو فون کر کے کہتی ہوں کہ بالکل ہی نکمی ہو...... کم از کم دو تین لڑکیاں تو نظر میں رکھتیں۔ ایک پسند نہ آتی تو دوسری کی بات کرتے۔ دوسری پسند نہ آتی تو تیسری کے بارے میں غور کرتے...... ایک وجیہہ کو بیٹھی پیٹ رہی ہے۔ دنیا کی بہنیں ایک وقت میں دس چھانٹتی ہیں۔
ذہن کو کوئی راستہ نہ ملا تو افشاں پر غصہ آنے لگا...... نظر بار بار وال کلاک کی طرف جا رہی تھی۔
ایک دم سے اس کے دروازے پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ پتہ نہیں کب سے چکر چلا رہی تھی۔

☆......☆......☆

ثمر ندا کے گھر سے نکل کر دو دریا کے ایک ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور ایسی ٹیبل سنبھالی تھی جو نسبتاً الگ تھلگ تھی روشنی بھی کم تھی۔ سمندر کی موجیں ریسٹورنٹ کی دیواروں سے پوری قوت سے ٹکرا رہی تھیں۔ پانی کے

شور میں اندر کا شور گم ہو رہا تھا۔
پانچ سال کا تعلق اچانک ختم ہوا تھا......
اس طرح کہ آفس سے گھر واپسی کا سارا راستہ اس نے چمن کے ساتھ بہت اچھی رات گزارنے کو پلان کیا تھا کہ پہلے چائنیز جائیں گے پھر کچھ دیر لونگ ڈرائیو کریں گے۔
راستے میں چمن کے برجستہ جملے ہوں گے وہ قہقہے لگائے گا۔ مگر یہ کیا......
خواب دیکھتے دیکھتے بستر سے فرش پر گر گیا...... نیند ٹوٹی...... آنکھ کھلی اچانک منظر تبدیل ہو گیا۔
حادثاتی طور پر ٹوٹنے والی شادی...... ذہن کو ایک خاص عرصے تک مفلوج رکھتی ہے...... اور حادثہ بھی اتنا خوفناک کہ مرد کی مردانگی کو گالی پڑی ہو اس کی ذہنی حالت اتنی مخدوش تھی کہ ندا کے سامنے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد اب تاسف میں مبتلا تھا۔
''کیا ضرورت تھی...... بے چاری پر اچانک حملہ آور ہو گیا۔ جو منہ میں آیا بولتا چلا گیا۔''
اور سب سے بڑا ظلم تو اس کمزور جان پر یہ کیا کہ اسے اپنے طوفانی عشق سے مطلع کیا...... کتنا بڑا ایٹم بم اس کے سر پر پھوڑا کہ اس کی وجہ سے چمن کو چھوڑ دیا۔
چاہے جانے کا اعزاز دیا...... مگر زندگی کے سب سے بڑے جھوٹ کے ساتھ میری زندگی میں تو چمن کے سوا کسی اور لڑکی نے آج تک حصہ ہی نہیں ڈالا چمن کو دل کی گہرائیوں سے پیار کیا...... تب ہی تو درگزر سے کام لیتا رہا تھا۔ مجھے تو نئی محبت ہو ہی نہیں سکتی...... ہاں مگر مجھے ایک بیوی چاہیے۔
اس وقت میں کیچڑ میں لت پت ہوں۔ مجھے پاک صاف ہونا ہے۔ ویٹر مینو کارڈ ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔
سمندر کی سفید جھاگ جھاگ لہریں چاندنی میں یوں چمک رہی تھیں گویا سمندر نہ ہو کھلی ہوئی پگھلی ہوئی چاندنی بہہ رہی ہو۔
تاریکی میں نورانی اُجالے تھے۔ دل میں سیاہ گھور اندھیرے...... ضمیر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔
معصوم سی ندا سامنے کھڑی سوال کر رہی تھی۔
''مجھ میں کیا نہیں ہے؟ مجھے کیوں نہ چاہا جائے؟ عشق کا نام لے کر کسی کو دھوکہ دینا کوئی انسانیت ہے؟ شادی تو تم سے ہی کروں گا...... جو کچھ میرے پاس ہے سب کچھ تمہیں دے دوں گا۔ شاید...... ایک دن واقعی مجھے تم سے محبت ہو جائے۔''
ماں کے سامنے ذلیل کرنے والی عورت سے تو مجھے شدید نفرت ہو چکی ہے خدا کرے مجھے ندا سے سچ مچ محبت ہو جائے۔
شدت کی محبت میں شدت ہی کے غم پہنچے تھے۔ محبت و نفرت ایک ہی سکے کے دو رخ...... کیفیات مختلف مگر گرفت کی مضبوطی یکساں ہوتی ہے...... جو انسان کسی ایک ذات کے ساتھ محبت و نفرت کی کیفیات سے گزرے وہ کسی دوسری ذات میں محو نہیں ہو سکتا...... بستر کے شراکت دار بدل سکتے ہیں...... مگر...... دل...... دل ہے...... کوئی بستر نہیں۔ وہ مینو پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔
مگر قربتوں کے زخم آنکھوں کو دھندلا رہے تھے۔

☆......☆......☆

مہ وش کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ وہ آدھی رات کو گھبرا کر اٹھی اور قے پر قے کرنے لگی۔

چمن کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ خود ڈرائیو کر کے ہاسپٹل جا سکتی تھی مگر عطیہ بیگم کو جگانا بہت ضروری تھا۔ اکثر وہ رات کو اُٹھ کر اس کمرے میں جھانک لیا کرتی تھیں۔ جس میں آج کل چمن دونوں بچیوں کے ساتھ قیام پذیر تھی۔

چمن اور مہ وش کو گھر میں نہ پا کر انہیں شاک لگ سکتا تھا۔ شوہر کا تو وہ نوزائیدہ بچے کی طرح خیال کرتی تھیں۔ کسی بھی صورت حال ہو منشکور صاحب کو کبھی نہیں جگاتی تھیں۔

مجبوراً چمن کو عطیہ بیگم کو بیدار کرنا پڑا۔

''امی میں مہ وش کو لے کر ہاسپٹل جا رہی ہوں...... وہ وومیٹنگ کیے جا رہی ہے میں نے اسے نمک چینی کا پانی بھی پلایا۔ مگر اس نے فوراً ہی وومیٹ کر دی۔

چمن کے ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھا۔ وہ اپنا موبائل رکھتے ہوئے جلدی جلدی بولی تھی۔ اور عطیہ بیگم گہری نیند ٹوٹنے کی وجہ سے گھبرا کر کانپنے لگیں۔

''بیٹا...... اتنی رات کو اکیلی گاڑی لے کر جاؤ گی۔ ساتھ میں بیمار بچی...... دو منٹ رکو...... میں ساتھ چلتی ہوں۔'' وہ اٹھنے کی ہمت کر رہی تھیں۔

مہ پارہ کی آنکھ کھلی تو وہ ڈر جائے گی۔ آپ اس کے پاس جا کر لیٹ جائیں۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھیں...... اس وقت تو آدھا شہر جاگ رہا ہوتا ہے۔ چمن نے عجلت کے انداز میں ماں کو تسلی دی اور کمرے کی طرف بھاگی جہاں سے مہ وش کی آوازیں آ رہی تھیں...... خالہ...... خالہ......''

''مہ وش...... آجاؤ میری جان...... ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں...... جلدی کرو۔'' مہ وش دروازے تک آ گئی تھی۔ چمن اس کا ہاتھ پکڑ کر پورچ کی طرف بھاگی...... بچی پے در پے قے کرنے کے بعد نڈھال ہو چکی تھی مگر خالہ کے ساتھ خود کو گھسیٹ رہی تھی۔ چمن کی بھی مجبوری تھی۔ سات سال کی بچی کو گود میں اُٹھا کر بھاگ نہیں سکتی تھی۔

''یہ شاپر اپنے ہاتھ میں لے لو...... وومیٹنگ ہو تو منہ سے لگا لینا۔'' جلدی میں تین چار شاپر کچن سے اٹھائے تھے۔ اتنا بڑا شاپر مہ وش کے ہاتھ میں پکڑایا جس میں پانچ کلو آٹا آسانی سے آ جائے۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر علی عثمان سیکنڈ فلور کا وزٹ کر کے نیچے آ رہے تھے۔ کان سے سیل فون لگا ہوا تھا۔ چہرے پر بڑی شفقت بھری مسکراہٹ کا نور پھیلا ہوا تھا۔

''ٹینا...... میری جان...... سو جاؤ...... ورنہ سوزی ناراض ہو کر جکارتہ چلی جائے گی۔ اور پھر ذرا سوچو......''

باقی جملہ ڈاکٹر علی عثمان کے منہ ہی میں رہ گیا...... سامنے چمن مہ وش کا ہاتھ تھامے عجلت کے انداز میں ریسپشن کی طرف جا رہی تھی۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز
ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

ذرا سی بات

جس دن اظہر سے اُس کی منگنی ہوئی اُس رات عاطف کا مبارکباد کا فون آیا۔ ''بڑی بے وفا ہو بچپن میں مجھ سے شادی کا وعدہ کیا اور اب کسی اور سے منگنی رچالی۔'' عاطف کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے فون تھامے جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ''کیا ہوا......؟

وہ حیران تھا آج آج پہلی دفعہ شازینہ نے ایک معمولی سی بات پر اس طرح ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ اور اُس کے اس طرح غصہ کرنے اور رونے پر وہ اپنی بہن کے سامنے سخت شرمندہ ہو رہا تھا۔

''اصل میں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے رات سے اس کے سر میں سخت درد ہے۔'' اُس نے بڑی بہن کے سامنے صفائی پیش کی۔

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ آخراتنی سی بات پر وہ اس قدر ناراض کیوں ہو رہی ہے۔ میں نے ایک خواہش کا اظہار ہی تو کیا تھا۔ کوئی ایسی غلط بات تو نہیں کہہ دی جس پر اُس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔'' وہ اُس کی بڑی بہن تھیں نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''آپ ناراض نہ ہوں۔ میں اُس سے کہوں گا وہ آپ سے معافی مانگ لے گی۔''

''ابھی وہ غصے میں ہے۔ میں اس کی طرف سے آپ سے سوری کرتا ہوں۔'' وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں اور وہ سب سے چھوٹا تھا۔ اس لیے وہ اُن کا احترام بھی کرتا تھا اور اُن سے ڈرتا بھی بہت تھا۔ وہ جانتا تھا وہ غصے کی بھی بہت تیز ہیں۔ اگر وہ ناراض ہوگئیں تو اُن کو منانا بہت مشکل ہو جائے گا اور اگر یہ بات اُس کی ماں تک پہنچ گئی تو پھر گھر میں ایک سرد جنگ کا آغاز ہو جائے گا۔

اور اُسے اس قسم کی سرد جنگوں سے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ جہاں سب ساتھ تو رہ رہے ہوں لیکن دل شکوؤں اور شکایتوں سے لبریز ہوں۔ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کی بیوی بہت سمجھدار اور سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک تھی۔ اس کے آنے سے گھر کا ماحول بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ ورنہ اُس سے پہلے بڑی دونوں بھابیوں کا وہی وطیرہ تھا جو عام طور پر گھروں میں بھاوجوں اور بہوؤں کا ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر منہ بنالینا۔ نندوں کے آنے پر جھنجھلانا۔ اپنے گھر والوں کی بڑھا چڑھا کر تعریفیں کرنا، اپنے آپ کو مظلوم سمجھنا

اور اس قسم کی بے شمار باتیں جن کی وجہ سے اکثر گھر کے ماحول میں کشیدگی پیدا ہو جاتی۔ وہ شادی سے پہلے یہی سمجھتا تھا کہ شاید شادی کے بعد ہر گھر کا ماحول ایسا ہی ہو جاتا ہے لیکن جب اس کی شادی ہوئی تب اُسے احساس ہوا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صحراؤں میں بھی گلاب کھلانے کا ہنر جانتے ہیں۔ شازمینہ بھی ایسی ہی تھی۔ اس کی شادی کے اِن پانچ سالوں میں شاید کبھی ایسا ہوا ہو کہ گھر میں سرد جنگ کی فضا پیدا ہوئی ہو۔ وہ بہت خوش مزاج ہنس مکھ تھی۔ ہر ایک کا خیال رکھنے والی، وہ خود بھی خوش رہتی اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔ اسی لیے تو آج اس کے اس طرح جھنجلانے پر وہ دونوں حیران تھے۔

''بھئی شازمینہ تو میرے عاطف کی دلہن بنے گی۔'' شاہدہ نے کئی دفعہ کا دھرایا ہوا جملہ پھر دھرایا۔ جس سے ساجدہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

سردیوں کی نرم گرم دھوپ میں وہ دونوں بہنیں صحن میں بیٹھی کینو کھاتی جا رہی تھیں اور خاندان کی سیاست پر بے لاگ تبصرے بھی کرتی جا رہی تھیں۔ اس دوران شازمینہ لال سوئٹر پہنے دوڑتی ہوئی آئی اور ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے رخسار سردی کی وجہ سے انار کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔ سرخ مفلر سے اس کے بالوں کی سنہری لٹیں چہرے پر بکھری ہوئی ایسے لگ رہی تھیں جیسے گلاب کے پھول پر سورج کی کرنیں۔ شاہدہ نے اُسے دیکھ کر بے اختیار اپنا جملہ دھرایا۔

''آپا پلیز میں نے کتنی دفعہ کہا ہے بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کیجیے۔'' ساجدہ نے ہمیشہ کی طرح بہن کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیوں کیا تم نہیں چاہتیں کہ شازمینہ میری

بھو بنے۔'' شاہدہ نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے ابھی بچے بہت چھوٹے ہیں۔ پتہ نہیں بڑے ہو کر ان کے کیا خیالات ہوں۔''

''اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ بچپن سے اِن کے دماغوں میں یہ بات بیٹھ جائے تاکہ بڑے ہو کر کسی اور کے بارے میں نہ سوچیں۔'' شاہدہ نے اپنی منطق پیش کی۔

''اپیا' زمانہ بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ نہ جانے آنے والے وقتوں میں کیسے حالات پیدا ہو جائیں۔ بچوں کے سامنے وقت سے پہلے اِن باتوں کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں۔''

ساجدہ چھوٹی ہونے کے باوجود شاہدہ کے مقابلے میں بہت سمجھدار اور پختہ ذہن کی مالک تھی۔ اُس نے سائیکولوجی میں ماسٹرز کیا تھا اور چائلڈ سائیکولوجی پر ریسرچ بھی کی تھی۔ وہ بچوں کے سامنے اس طرح باتیں کرنے کی سخت مخالف تھی۔ اُس کے برعکس شاہدہ کو اِن باتوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ اُسے لکھنے پڑھنے سے بھی شغف نہیں رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی اس لیے انٹر کرتے ہی اُس کی شادی ہو گئی۔ اُس کی سسرال کا ماحول بھی بہت زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ وہاں بچوں کی بہت کم عمری میں شادیاں کر دی جاتی تھیں۔ اُس کی دونوں نندوں کی شادیاں بھی اُن کے میٹرک کرتے ہی کر دی گئی تھیں۔

وہ بھی اپنے بچوں کی کم عمری میں شادیاں کرنے کے حق میں تھی عاطف اُن کا بڑا بیٹا تھا اور ابھی ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ جبکہ شازینہ ابھی دوسری کلاس میں تھی۔

''تم خوامخواہ کے وہم دماغ میں نہ پالو...... دیکھنا وقت کتنی تیزی سے گزرے گا۔ بس تم اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لو کہ شازینہ میرے عاطف کی دلہن بنے گی۔'' شاہدہ ساجدہ کی بات کو انتہائی غیر اہم گردانتے ہوئے اپنی بات پر اڑی رہی۔

''اچھا...... اچھا ٹھیک ہے۔ شازینہ تم جا کر اپنا ہوم ورک کرو۔'' ساجدہ کو شاہدہ کا اس طرح بے دھڑک بولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اُس نے شازینہ کو وہاں سے ہٹانے کے لیے سخت لہجے میں اُس سے کہا۔

شازینہ بہت ذہین بچی تھی وہ غور سے ماں اور خالہ کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ ماں کی بات کو سُن کر بھی خالہ کی گود میں بیٹھی رہی۔

''شازینہ میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں۔ تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ تم اپنے کمرے میں جا کر اپنا ہوم ورک کرو۔'' ساجدہ نے اُسے شاہدہ کی باتیں غور سے سنتے دیکھ کر سرزنش کی۔

''بھئی میری بچی کو اس طرح نہ ڈانٹا کرو۔ یہ تو میری گڑیا ہے، میری رانی ہے۔ شاہدہ نے شازینہ کے منہ بسورنے پر فوراً اُسے گلے سے لگا لیا۔

ساجدہ کو شاہدہ کا اس طرح بچی کا لاڈ اٹھانا ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ کینو کے چھلکے سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھو نا...... کہاں جا رہی ہو؟'' شاہدہ کو لگا وہ ناراض ہو گئی ہے۔

''دوپہر کے لیے کھانے کا بندوبست کر لوں پھر آ کے باتیں کروں گی۔'' ساجدہ نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''چلو میں بھی تمہارے ساتھ کچن میں چلتی ہوں۔ وہاں پکانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی رہوں گی۔'' شاہدہ بھی اُس کے ساتھ اُٹھ

کھڑی ہوئیں۔

وہ دو ہی بہنیں تھیں دونوں کی غیروں میں شادی ہوئی تھی۔ شاہدہ کی سسرال بہت بڑی تھی اُس کے گھر میں ساس سسر کے علاوہ دو جیٹھ' جیٹھانیاں اور اُن کے بچے بھی ساتھ رہتے تھے۔ اُن کے گھر میں ہر اتوار شادی شدہ نندیں اپنے بچوں کے لے کر آ جاتیں اِسی لیے شاہدہ بھی عام طور پر چھٹی کے دن بچوں کو لے کر ساجدہ کے گھر آ جاتی۔ ساجدہ کی سسرال پنڈی میں تھی۔ وہ اپنے میاں کے ساتھ کراچی میں رہتی تھی۔ اُن دونوں بہنوں میں بے حد محبت تھی۔ جبکہ دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اُن کے والدین بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ وہ اور اُن کا ایک بھائی نانی کے گھر پلے بڑھے تھے۔ بھائی پڑھ لکھ کر امریکہ چلا گیا اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ نانا نانی بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُن کی ماں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ لہٰذا نانا نانی کے بعد میکے کے نام پر اُن دونوں بہنوں کا ایک دوسرے کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ ساجدہ سسرال کے جھنجٹ سے آزاد تھی۔ اِس کے باوجود وہ بہن کے گھر شاذو نادر ہی جا پاتی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُس کے شوہر کو اُس کا اپنی بہن کے سسرال جانا زیادہ پسند نہیں تھا۔ وہ اُن لوگوں کو اپنے اسٹیٹس کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے وہ بھی شاہدہ کے سسرال جا کر اتنی آزادی سے بات نہیں کر پاتی تھی۔ جیسے اپنے گھر میں کر لیتی تھی۔ وہ دونوں چھٹی کا سارا دن دل بھر کے باتیں کرتیں۔ اپنی مرضی کے کھانے پکاتیں۔ کبھی کبھار شاپنگ کے لیے بازار کے چکر لگا لیتیں۔ ساجدہ نے کچن میں آ کر برتن سمیٹنا شروع کیے تو شاہدہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن میں آ گئی۔

''آج تو عاشر بھی نہیں ہیں تم کوئی سی آسان سی ڈش بنا لو۔ پھر بازار چلتے ہیں۔ سنا ہے گل احمد پر سیل لگی ہے۔'' شاہدہ نے کچن میں داخل ہوتے ہی اپنی تجویز پیش کی۔

''میں بھی سوچ رہی ہوں۔ مٹر پلاؤ بنا لوں۔ شازمینہ بہت شوق سے کھاتی ہے۔''

''میرا عاطف بھی مٹر پلاؤ کا دیوانہ ہے۔'' شاہدہ نے ہنس کر کہا اور ساجدہ پھر کلس کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

''عاطف......'' عاطف ٹی وی پر انڈین مووی دیکھ رہا تھا۔ تو شازمینہ اُس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ شاہدہ کی ساس بیمار تھیں۔ ساجدہ ان کی عیادت کے لیے آئی تھی۔ شازمینہ تھوڑی دیر تو ماں کے ساتھ شاہدہ کی ساس کے کمرے میں بیٹھی رہی پھر اُٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئی۔

''ہوں۔'' عاطف نے نظریں ٹی وی پر جمائے ہوئے کہا۔ ٹی وی پر کسی کی شادی دکھائی جا رہی تھی۔

''عاطف...... تمہیں پتہ ہے میں تمہاری دلہن بنوں گی۔'' شازمینہ نے دلہن کو دیکھ کر انتہائی معصومیت سے کہا۔

''تم سے کس نے کہا؟'' عاطف کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''تمہاری ماما نے...... وہ میری ماما سے کہتی ہیں کہ ہم دونوں کی شادی ہو گی۔ عاطف کتنا مزہ آئے گا۔ مجھے تو دلہن بننے کا بہت شوق ہے۔''

عاطف نے غور سے شازمینہ کی طرف دیکھا وہ بارہ سال کا تھا اور شازمینہ چھ سال کی۔ وہ بہت معصوم تھی۔ جبکہ عاطف اتنا معصوم نہیں تھا۔ نیٹ اور انڈین فلموں نے اُسے وقت سے پہلے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

''یہ اچھی بات نہیں ہوتی لڑکیوں کو ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے۔'' عاطف نے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیوں؟ تمہاری ماما تو ہر وقت بھی باتیں کرتی ہیں۔'' اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ بڑی ہیں میری ماما ہیں۔ وہ ایسی باتیں کر سکتی ہیں ہمارے ماں باپ ایسی باتیں کر سکتے ہیں لیکن ہم نہیں کر سکتے۔''

''کیوں نہیں کر سکتے، کیا دلہن بننا بُری بات ہے۔ مجھے تو دلہن بہت پیاری لگتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں بھی دلہن بنوں۔ خوب اچھے اچھے کپڑے پہنوں، خوب میک اپ کروں، میری مووی بنے سب مجھے تحفے دیں۔'' وہ جوش میں بول رہی تھی خوشی سے اُس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''آہستہ بولو...... تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ ابھی تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔'' عاطف نے پھر اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کیوں نہیں ہو سکتی۔ میں اپنی ماما سے بات کروں گی۔ وہ ضرور میری بات مان جائیں گی۔''

''تمہاری ماما تو بہت غصے والی ہیں۔ تم نے اُن سے یہ بات کی تو وہ تمہیں بہت ڈانٹیں گی۔ تم سمجھتی کیوں نہیں؟ یہ اچھی بات نہیں ہوتی۔ لڑکیاں اپنی شادی کی باتیں نہیں کرتیں۔'' وہ اُسے سمجھاتے ہوئے پریشان ہو گیا۔

''اچھا لڑکیاں نہیں کر سکتیں تو لڑکے تو کر سکتے ہیں۔ لیکن تم بھی نہیں کرتے۔ کیا تمہیں دولہا بننا اچھا نہیں لگتا۔''

''اچھا تو لگتا ہے...... لیکن ابھی میں بھی بہت چھوٹا ہوں۔ جب بڑا ہو جاؤں گا پڑھ لکھ جاؤں گا تب میری شادی ہو سکتی ہے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے تم بھی بڑے ہو جاؤ میں بھی ڈاکٹر بن جاؤں۔ پھر ہم دونوں شادی کر لیں گے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن یہ بات تم کسی سے کہنا نہیں۔''

''تم دولہا بن کے کتنے پیارے لگو گے بالکل اِس لڑکے کی طرح......'' وہ ٹی وی پر دولہا کو دیکھتے ہوئے اُس کو دولہا کے روپ میں دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

بچپن کی معصوم سی خواہش ایک مضبوط جڑ کی صورت میں دل کی زمین کے اندر پیوست ہو گئی۔ عاطف ایم بی بی ایس کر کے مزید پڑھنے انگلینڈ چلا گیا۔

اُس کے ایف ایس سی میں نمبر خاصے کم آئے تو اُس کا میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ہو سکا۔ وہ بی ایس سی کر کے گھر میں بیٹھ گئی۔ ویسے بھی اُسے پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ ورنہ ساجدہ کی خواہش تھی کہ وہ ایم ایس سی تو کر لے اُس کے رشتے آ رہے تھے۔ ساجدہ ہر رشتے کے بارے میں بہن کو ضرور بتاتی لیکن اب شاہدہ نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ بھی مجبور تھی۔ اُس کی اب بھی یہ خواہش تھی کہ شازینہ اُن کی بہو بنے لیکن اُس کے شوہر راضی نہیں تھے۔ انہیں اپنی بھتیجی زیادہ پسند تھی۔ جو ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں تھی۔ پھر عاطف بھی اُس میں انٹرسٹڈ تھا۔ ساجدہ عجیب شش و پنج کا شکار تھی۔ وہ ہر رشتے سے انکار کر رہی تھی کیونکہ جو بھی رشتہ آ رہا تھا۔ وہ عاطف کے مقابلے کا نہیں تھا۔ عاطف جوان ہو کر بہت خوبرو اور اسمارٹ ہو گیا تھا۔ پھر وہ پڑھنے میں اتنا لائق تھا کہ ہر سال کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور لیتا اور اب تو ساجدہ کے شوہر بھی اپنی سالی کے شوہر سے جنہیں کبھی وہ اجڈ اور گنوار کہتے تھے بہت خوش

دلی سے ملنے لگے تھے۔ پہلے وہ اُن کے گھر نہ جانے کے سو بہانے تراشتے تھے۔ اب وہ اُن کے گھر جانے کے لیے بہانے ڈھونڈنے لگے پہلے انہیں اُن کے گھر کے ماحول سے وحشت ہوتی جہاں اتنے سارے لوگ رہتے تھے۔ اب انہیں اُن کے گھر کا ماحول، سب کا آپس میں مل جل کر رہنا بہت اچھے لگنے لگا تھا۔

پہلے شاہدہ کے آنے پر اُن کے ماتھے پر بے شمار بل پڑ جاتے اب وہ شاہدہ کو آئے دن بلانے پر اصرار کرتے۔

☆......☆......☆

اداسیاں ساون کی بارشوں کی طرح ٹوٹ کر برس رہی تھیں۔ شاہدہ کے جیٹھ کے بیٹے منگنی ہوئی تھی۔ ساجدہ مبارکباد دینے گئی تھی۔ وہ واپس آئی تو دل پر بے حد بوجھ تھا۔ گھر میں شاز مینہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ سارا دن وہ بے کل بے کل پھرتی رہی۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ شاز مینہ نے پوچھا بھی لیکن اس نے ٹال دیا۔ رات کو کھانے کے بعد جب وہ بیڈ روم میں آئی تو اُس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر کے اُس کے شوہر نے پوچھا۔

''کیا بات ہے آج...... تم بہت اپ سیٹ لگ رہی ہو۔''

''میرا خیال ہے اب ہمیں عاطف کے رشتے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔''

''ہاں میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اب تمہاری بہن کی نظریں بدل گئی ہیں۔'' انہوں نے بھی بیوی کے خیال کی حمایت کی۔

''آج آصف کی منگنی کی مبارکباد دینے گئی تھی۔ کاشف بھائی جتنی دیر بیٹھے رہے اپنی بھتیجی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہے۔ اشاروں اشاروں میں انہوں نے یہ بھی بتا دیا کہ اُن کے والدین کی یہ خواہش تھی کہ دونوں بھائی اپنے بچوں کی آپس میں شادیاں کر کے اپنے رشتوں کو اور زیادہ مضبوط کر دیں۔ اُس نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

''مجھے تو یاد ہے تمہاری بہن تو اس وقت سے تمہارے پیچھے پڑی تھیں جب شاز مینہ اور عاطف بچے تھے بلکہ جب عاطف میٹرک میں تھا تب بھی انہوں نے رشتہ دیا تھا۔'' عاشر کا لہجہ گرم ہو گیا۔

''اُس وقت آپ نے منع کر دیا تھا۔'' ساجدہ بھی قدرے ناراضگی سے بولی۔

''اُس وقت شاز مینہ کی عمر دس سال تھی کیا دس سال کی عمر میں اُس کا رشتہ طے کر دیتا؟'' عاشر غصے سے بھنا کر بولے۔

''اگر اُس وقت ہم ہاں کر دیتے تو رشتہ پکا ہو جاتا......''

''اور اگر رشتہ پکا ہونے کے بعد وہ لوگ انکار کر دیتے تو......''

''ایسا نہیں ہوتا۔''

''کیوں نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کو اپنی زبان کا پاس نہ ہو۔ وہ رشتوں کا کیا لحاظ کرتے...... اچھا ہوا ہم نے ہاں نہیں کی۔ خوامخواہ ہماری بیٹی کے لیے مسائل پیدا ہوتے۔'' عاشر نے دل گرفتگی سے کہا۔

''میں سوچتی ہوں ایک دفعہ آپا سے کھل کر بات کر لوں۔'' ساجدہ کو ابھی بھی امید باقی تھی۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ تم ہی تو بتا رہی تھیں کہ تم نے اُن سے اظہر کے رشتے کا ذکر کیا تھا۔ اگر اُن کے دل میں خیال ہوتا تو وہ خود ذکر کرتیں بلکہ انہوں نے تو تمہیں مشورہ دیا تھا کہ اگر لڑکا اچھا ہے تو فوراً ہاں کر دو۔'' عاشر نے انتہائی صاف گوئی سے حقیقت کا اظہار کیا۔

''میں تو اب سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ اظہر کے رشتے کو اوکے کردوں اچھا لڑکا ہے ایم بی اے ہے بینک میں جاب کرتا ہے اپنا گھر ہے۔ بس شکل وصورت کا تھوڑا کم ہے۔تو کیا ہوا...... مرد کی صورت کون دیکھتا ہے؟'' ساجدہ نے دل پر پتھر رکھ کر یہ جملے کہے جسے کہنے کے لیے انہیں جس کرب اور اذیت سے گزرنا پڑا۔ یہ وہی جانتی تھیں۔

''آپ شازینہ سے پوچھ کر اوکے کردیجیے۔'' عاشر نے بھی بادل نخواستہ رشتے کی منظوری دے دی۔

ساجدہ شازینہ کے کمرے میں آئی تو وہ اپنی وارڈروب ٹھیک کررہی تھی۔

''تمہارے پاپا نے اظہر کے رشتے کے بارے میں تمہاری رائے پوچھی ہے۔'' ساجدہ نے اُس کی طرف دیکھے بغیر جلدی سے پوری بات کہہ دی۔

''اگر پاپا کی مرضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ لوگ جہاں بھی میرا رشتہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔'' شازینہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی یا اُسے محسوس ہورہی تھی۔

''اظہر بہت اچھا لڑکا ہے۔ جس سے پوچھا اُس نے تعریف کی ہے۔'' شازینہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی۔

''تم خوش ہونا......'' وہ نہ جانے اُس سے کیا کھوجنا چاہ رہی تھیں۔

''ہاں...... ماما...... میں بہت خوش ہوں۔'' اُس نے اِس طرح کہا کہ اُن کا دل کٹ کررہ گیا۔

☆......☆......☆

جس دن اظہر سے اُس کی منگنی ہوئی اُس رات عاطف کا مبارکباد کا فون آیا۔

''بڑی بے وفا ہو بچپن میں مجھ سے شادی کا وعدہ کیا اور اب کسی اور سے منگنی رچالی۔'' عاطف کا قہقہہ بڑا جاندار تھا۔

وہ کانپتے ہاتھوں سے فون تھامے جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

''کیا ہوا......؟ اتنی خاموش کیوں ہو......کیا اظہر صاحب نے بولنے پر پابندی لگادی ہے۔''

''ایسی......کوئی بات نہیں۔'' اُس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کہوں...... مائنڈ نہ کرنا۔''

''جی......جی......کہیے۔''

''وہ بندہ تمہارے جوڑ کا نہیں ہے۔تم تو اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی حور لگ رہی ہو۔'' وہ اُسے چھیڑ رہا تھا۔ اُس نے منگنی کا پورا فنکشن اسکائپ پر دیکھ لیا تھا۔ اُس کے چھیڑنے پر وہ ایکدم خاموش ہوگئی اور آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کو اپنے اندر انڈیلنے کی کوشش کرنے لگی۔

''تم کچھ زیادہ ہی شرمیلی اور گھبریلی نہیں ہوگئیں۔تم سے کیا بات کروں۔تم ساجدہ خالہ سے بات کرواؤ میں اُنہی کو مبارکباد دے دوں۔'' اُس نے اُس کی خاموشی کو شرم سے محمول کرتے ہوئے ساجدہ سے بات شروع کردی۔

''ساجدہ خالہ یہ فاؤل ہے میری ہونے والی بیوی کو آپ نے کسی اور کی منگیتر بنادیا۔'' وہ انگلینڈ جاکر کچھ زیادہ ہی بے باک ہوگیا تھا۔

''یہ تو تم اپنی ماں سے پوچھو جو عنایہ سے تمہارے نکاح کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔'' ساجدہ کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوگیا۔

''مما سے کیا پوچھنا اُن کو آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں وہ بچپن سے ہی ہر خوبصورت لڑکی کو میری دلہن بنانے کے خواب دیکھتی تھیں۔''

عاطف نے اُن کے لہجے کی تلخی کو محسوس کیے بغیر خوش دلی سے کہا۔

''تم پاکستان کب آرہے ہو؟'' انہوں نے بھی حتی الامکان لہجے کو بشاش کیا۔ جس کو آپ کے درد کا احساس نہ ہو اُس کے سامنے درد کی تشہیر کرنا اپنے آپ کو ارزاں کرنا ہے۔

''بس انشاء اللہ دسمبر میں آؤں گا۔''

''دسمبر میں تو شازمینہ کی بھی رخصتی ہے۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے میں اُس کی شادی میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔'' اُس نے خوشی کا اظہار کیا تو اُن کے دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا۔

دسمبر کی سرد راتوں میں اُس کی شادی کے فنکشنز خوب دھوم دھام سے ہوئے۔ عاطف کا نکاح، شازمینہ کی رخصتی کے بعد ہفتے بعد تھا۔ وہ دل کھول کر ہر رسم کو انجوائے کر رہا تھا جبکہ دسمبر کی راتوں کی ساری ٹھنڈک اور تاریکی اُس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

''ساجدہ خالہ...... شازمینہ تو بالکل ہی بدل گئی ہے بچپن میں کتنی باتونی اور ہنس مکھ ہوا کرتی تھی۔ اب تو بڑی سنجیدہ ہوگئی ہے۔'' عاطف نے خالہ کو مخاطب کیا۔ جو دولہا کے گھر بھیجنے والے سامان کا جائزہ لے رہی تھیں۔

وہ مایوں کے زرد لباس میں سر جھکائے بیٹھی تھی لڑکے اور لڑکیاں انڈین گانوں کے بولوں پر تھرک رہے تھے۔

''بچیاں شادی کے وقت ایسی ہی ہو جاتی ہیں اپنا گھر چھوڑنے کا دکھ جو ہوتا ہے۔'' ساجدہ نے شازمینہ کو اُداس اور ملول دیکھ کر اپنی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کو جذب کرتے ہوئے عاطف کی بات کا جواب دیا۔

''مگر مجھے تو کوئی دکھ نہیں میں بھی تو آخر اپنا گھر چھوڑ کر سسرال جاؤں گا۔'' عاطف نے ہنس کر شوخی سے کہا۔

''تم کہاں جاؤ گے تم اور تمہاری بیوی تو ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔''

''رخصت تو ہوں گا ہی، نیچے کی منزل سے بائیس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر تو جانا ہوگا۔''

''پھر دلہن کو لے کر نیچے آنا ہوگا۔'' کسی لڑنے جملہ کسا۔

''ابھی کہاں...... ابھی تو سال بھر انتظار کرنا ہے۔'' عاطف نے سامنے بیٹھی ہوئی عنایہ کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھریں اور شازمینہ کے برابر بیٹھی ہوئی عنایہ کا چہرہ شفق رنگ ہو گیا جبکہ شازمینہ کی آنکھوں میں بجھتے ہوئے چراغوں کی لو بجھ اور مدھم ہوگئی۔

وہ صبح کو اٹھی تو ساجدہ اُس کی صورت دیکھ کر حیران رہ گئی اُس کی آنکھیں اتنی سوجی ہوئی تھیں کہ کھل ہی نہیں پا رہی تھیں۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا ساری رات روتی رہی ہو۔''

ساجدہ کو خوامخواہ ہی اُس پر غصہ آنے لگا جو چیز نصیب میں نہ ہو اُس پر رونے سے کیا حاصل اگر آنسو بہانے سے اپنی من پسند چیز مل جاتی تو شاید یہ دنیا انسانوں کے آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی۔ ساجدہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب نہ کہہ سکیں۔

''مجھے شدید زکام ہو رہا ہے۔ ناشتے کے بعد دوا لوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔'' اُس نے گھسا پٹا سا بہانہ بنایا۔ اور ساجدہ نے ایسے ظاہر کیا جیسے اُسے اُس کی بات پر سو فیصد یقین آ گیا ہو۔

''یہ آخری آنسو تھے جو تم نے اُس شخص کے لیے بہائے جس کے دل میں تمہارے لیے کوئی

جگہ نہیں دینا۔ کرو۔ اب تم کبھی اپنے اِن قیمتی موتیوں کو ضائع نہیں کرو گی۔ تمہیں ایسا بننا ہے کہ مجھے اپنی تربیت پر فخر ہو۔ آج کے بعد تمہاری ساری خوشیاں سارے غم بس اظہر سے وابستہ ہونے چاہئیں۔ یہ ہنر سیکھ لو گی تو یہ دنیا بھی تمہاری ہوگی اور وہ دنیا بھی......'' ساجدہ نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُس سے نظریں چراتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔ تو اُس نے کچھ کہے بغیر خاموشی سے سر ہلا دیا۔

وہ اظہر کے گھر آ گئی۔ اظہر اور اُس کے گھر والوں نے اُسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اُسے بے حد محبت اور عزت دی اُس نے بھی اپنی ماں کی تربیت پر حرف نہ آنے دیا۔ وہ اِس طرح اپنی سسرال میں گھل مل گئی جیسے مدتوں سے ان کے درمیان رہتی آئی ہو اِن پانچ سالوں میں اُس کے تین بچے ہوگئے۔ وہ ایک بے حد بھرپور اور مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ اسی لیے اظہر کو یہی تو حیرانی تھی کہ آج شازینہ کو کیا ہوگیا۔ وہ ایک چھوٹی سی بات پر اتنی برہم کیوں ہوگئی۔ وہ تو کبھی ایسا نہیں کرتی تھی۔ اُس نے تو کبھی کسی سے اِس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ پھر اُس نے اپنی بڑی نند سے جن کی سب ماں کی طرح عزت کرتے تھے کیوں اِس طرح جھنجلا کر بات کی۔

آخر انہوں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی جس پر شازینہ نے اتنے تلخ ردِعمل کا اظہار کیا تھا۔ باجی نے اُس کی بڑی بیٹی انابیہ کو دیکھ کر جو اُن کے بیٹے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ مذاق میں یہی تو کہا تھا۔

''شازینہ مجھے انابیہ بہت اچھی لگتی ہے میں اسے اپنی بہو بناؤں گی یاد رکھنا یہ ہاشم کی دلہن بنے گی۔''

اور ابھی اُن کی بات بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ شازینہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور غصے سے کانپتے ہوئے اُس نے باجی کو تڑخ کر جواب دیا۔

''باجی آج تو آپ نے یہ بات کہہ دی لیکن آئندہ آپ ایسی بات ہرگز ہرگز نہیں کہیں گی میں اِس طرح کی باتیں کسی صورت برداشت نہیں کرسکتی۔'' وہ غصے کے مارے سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

''شازینہ تمہیں کیا ہوگیا ہے یہ تم باجی سے کس طرح بات کررہی ہو۔ آخر اتنی سی بات پر اتنا غصہ ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ اتنی بڑی بات تو نہیں ہے اگر باجی نے اپنی خواہش کا اظہار کردیا تو کون سی قیامت آ گئی۔''

اظہر نے گھبرا کر باجی کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے پر غصے اور حیرانی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ اظہر کے جملے پر وہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اظہر اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔

''بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟ تم کیوں اتنا غصہ کررہی ہو۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ اتنی سی بات پر......'' اظہر اُس کے قریب بیٹھ کر اس کے ہاتھ تھام کر محبت سے بولا۔

''آپ کو نہیں معلوم یہ اتنی سی بات نہیں ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے یہ بہت بڑی قیامت ہے اِس کو کوئی نہیں جانتا...... کوئی...... نہیں...... سمجھتا۔''

وہ اظہر کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی پھٹ پڑی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اظہر حیرانی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اب بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اتنی سی بات پر وہ کیوں اِس طرح تڑپ کر رو رہی ہے۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

اُمِ مریم

رحمٰن، رحیم، سدا بسائیں

''اور آپ مجھے اب بتا رہی ہیں ماما! کم از کم اس وقت تو بتایا ہوتا۔'' عادت اور فطرت کے مطابق وہ فی الفور بھڑک اٹھا تھا۔ بریرہ اتنی خائف اور ہراساں تھیں کہ جواب میں کچھ نہیں بولیں۔ کیسے کہتیں کہ معاملہ بیٹی کی عزت کا تھا۔ اپنے طور پر وہ اس کی سب سہیلیوں کو کال کر کے سرسری انداز میں خیریت دریافت کرنے کے دوران یہ جان چکی تھیں کہ وہ......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا پچیسواں حصہ

اتباع عصر کی نماز پڑھ کے اٹھی تو عبداللہ پر نگاہ گئی۔ جو بستر کے کنارے ٹکا دنیا و مافیا سے بے خبر اسے دیکھ رہا تھا۔ اتباع کے چہرے پر حجاب آلود مسکان آ کر بکھر گئی تھی۔

''آپ جلدی آ گئے ہیں۔'' جائے نماز رکھتی وہ نماز کے اسٹائل میں لپٹا دوپٹہ کھولنے لگی۔

''کہاں تک سنو گے...... کہاں تک سناؤں۔ والا معاملہ ہے یار۔ تمہارے بغیر کہیں دل نہیں لگتا۔ پاپا نے میری غائب دماغی کو فیل کر کے خود گھر بھیج دیا۔'' وہ جتنے مزے سے بتا رہا تھا۔ اتباع اسی قدر خفیف ہو گئی۔

''بٹ دس از ناٹ فیئر عبداللہ! آپ کو ماموں کی ذمہ داریاں بانٹنا چاہیے ناں کہ ان پر مزید بوجھ ڈالنا۔'' وہ ہلکا سا خفا ہوئی۔ عبداللہ نے گہرا سانس بھر کے اسے دیکھا۔

''کمال ہے یار، بجائے خوش ہونے کے تم مجھے نصیحتیں کر رہی ہو۔'' وہ بسورنے لگا تھا۔

''لیکن......''

''یار پاپا سمجھتے ہیں میری فیلنگز شادی کے شروع دنوں میں سنا ہے انہیں بھی ماما کے سوا اور کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ تبھی تو وہ میرا بھی خیال کرتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں پاپا پر بزنس کا برڈن نہیں ڈالوں گا۔'' وہ اس کا گال نرمی سے سہلا کر ہاتھ تھامتا ہوا اپنے قریب بٹھا گیا تھا۔

''بس میں تمہیں بہت مس کر رہا تھا۔ اک پل دور نہیں رہ سکا تم سے۔'' اس نے بوجھل آواز میں کہتے اپنے مضبوط بازوؤں میں اس کے نازک پیکر کو سمیٹا۔ اس کا مبہوت انداز بلا کی وارفتگی سمیٹے ہوئے تھا۔ اتباع اس کے رومینٹک موڈ سے اس قدر بوکھلائی۔

''عبداللہ! کیا کرتے ہیں۔ ابھی میں چائے بنانے جا رہی تھی شام کی...... بوا انتظار کرتی ہوں گی۔'' وہ گھبراہٹ زدہ انداز میں بے ربط سی کہہ رہی تھی۔ مگر عبداللہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔

''تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں ڈارلنگ! تمہارے ہونٹ پتا ہے کتنے پیارے ہیں۔'' وہ اس کا اک اک نقش عقیدت مندانہ انداز میں ہونٹوں سے چھو رہا تھا۔ اتباع شرم سے سرخ پڑنے لگی۔

''عبداللہ!'' وہ پھر مچلی۔

''چپ......!'' عبداللہ نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور ان سنی کیے اسے بہت جذب سے اپنے اندر سمیٹا اور اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

''تمہیں پتا ہے؟ میں کتنی محبت کرتا ہوں تم سے......؟'' اتباع کیا جواب دیتی۔ اس کی شدتیں اس کے جذبوں کی لپک اتباع کے حواس ہی ایسے غائب کرنے لگتی تھیں۔

اس قدر ٹوٹ کے ہمیں تم پر پیار آتا ہے
اپنی بانہوں میں بھریں مار ہی ڈالیں تم کو

وہ گنگنایا تھا۔ اور پھر خود ہی ہنسنے لگا۔ اتباع خجل ہونے لگی۔

''تو پھر مار ڈالیں۔ اجازت ہے آپ کو۔''

عبداللہ اور زور سے ہنس پڑا تھا۔

''نہیں...... میں جانتا ہوں۔ اتنی شدتیں نہیں سہہ سکو گی تم۔'' اتباع کی پلکیں جھک گئیں۔ اس پل دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ عبداللہ نے چونک کر ناگواری سے گردن موڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔

''اس وقت کون آ گیا ہے یار؟'' اس کا موڈ سخت آف ہوا تھا۔

''خیر جو بھی ہے۔ خود ہی چلا جائے گا۔'' اس نے بے نیازی سے سر جھٹکا تو اتباع بے چین ہوئی۔

''بو ہوں گی عبداللہ! میں کھولتی ہوں۔'' وہ اس کا سر اپنی گود سے نکالتی دوپٹہ اُٹھا کر تیزی سے بستر سے اتری تو عبداللہ سرد آہ بھر کے رہ گیا تھا۔

''مجھے تو لگا یہ تمہاری دعا کا ہی کرشمہ ہے کہ ماما یوں مُل ہو گئیں۔'' اس کے جل کر کہنے پر اتباع ڈھنگ سے اسے گھور بھی نہیں سکی تھی۔ دوپٹہ سلیقے سے پہلے اوڑھا پھر دروازہ وا کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق دروزے پر منتظر بریرہ تھیں۔ ان کے چہرے پر واضح اضطراب کی کیفیت تھی۔

''آیئے بو جانی!'' اتباع نے مودب ہوتے ان کے لیے راستہ چھوڑا۔

''نہیں بیٹے! عبداللہ کو ذرا بلاؤ آپ۔'' انہوں نے مدھم آواز میں کہا تھا مگر لہجے کی بے قراری عیاں تھی۔ اتباع کو اسی پل ان کی پریشانی کا اندازہ ہو پایا۔

''خیریت ہے بو جانی! آپ......عبداللہ!'' بات ادھوری چھوڑ کر اس نے عبداللہ کو پکارنا چاہا تھا کہ وہ خود اس کے پہلو میں آن کھڑا ہوا۔

''سب ٹھیک تو ہے ناں ماما!'' اس نے آگے بڑھ کر ان کے شانے پر اپنا بازو پھیلا دیا۔ یہ بھی اپنائیت کا ڈھارس کا ایک انداز تھا۔

''چھ بج گئے...... امن ابھی تک یونیورسٹی سے نہیں لوٹی ہے۔ بیٹے!'' ان کے چہرے پر موجود زردی ہر لحہ بڑھ رہی تھی۔ اتباع نے متحیر ہو کے جبکہ عبداللہ نے ٹھٹھک کر ان کی صورت دیکھی تھی۔

''کیا مطلب......؟ آپ نے اس کے ساتھ کانٹیکٹ کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' عبداللہ کی نگاہ وال کلاک پر گئی تھی۔ اگلے لمحے وہ مضطرب ہو کر سوال کر رہا تھا۔ ساتھ ہی پلٹ کر اپنا سیل فون اٹھا لایا۔ ارادہ نمبر ملانے کا تھا کہ بریرہ نے دل گرفتگی کی کیفیت میں اسے ٹوک دیا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں بارہا مرتبہ کوشش

کر چکی۔ نمبر بند ہے اس کا۔ بارہ بجے کے نزدیک اس کا ایک میسج میرے فون پر آیا تھا کہ وہ لیٹ ہو جائے گی۔ اک دوست کی طرف جانا ہے۔ جبکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اول تو وہ یوں سہیلیوں کے گھر جانے کی عادی نہیں ہے۔ جانا بھی پڑے تو گھر سے جاتی ہے اور میرے ساتھ......'' بریرہ کی آواز اب خدشات کی یلغار سمیت باقاعدہ لرزنے لگی تھی۔ اتباع نے گھبرا کر انہیں تھاما اور اندر لا کر بستر پر بٹھا دیا۔ عبداللہ اتباع کا نمبر ملا چکا تھا۔ صورتحال وہی تھی۔ جس سے بریرہ نے اسے آگاہ کیا تھا۔ یعنی نمبر آف جا رہا تھا۔

''آپ نے کب میسج دیکھا تھا ماما! اور جب دیکھا نمبر ٹرائی کیا تھا اس کا؟'' عبداللہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں موجود سرخ ڈورے ہر لحہ بڑھ رہے تھے۔ بریرہ نے نرمی سے پانی کا وہ گلاس ہاتھ سے دور کیا جو ان کی غیر ہوتی حالت کے باعث اتباع نے انہیں پلانے کی کوشش کی تھی۔

''وہ عموماً دو بجے گھر آتی ہے۔ دو بجے بھی جب نہیں پہنچی تو مجھے تشویش ہوئی تھی۔ اس کا نمبر ٹرائی کیا جو آف تھا۔ تب میسج پر نگاہ پڑی۔''

ان کی آنکھوں میں آنسو اتر رہے تھے۔ عبداللہ نے دہک اٹھنے والی نظروں کے ساتھ کسی قدر ناراضگی سے انہیں دیکھا۔

''اور آپ مجھے اب بتا رہی ہیں ماما! کم از کم اس وقت تو بتایا ہوتا۔'' عادت اور فطرت کے مطابق وہ فی الفور بھڑک اٹھا تھا۔ بریرہ اتنی خائف اور ہراساں تھیں کہ جواب میں کچھ نہیں بولیں۔ کیسے کہتیں کہ معاملہ بیٹی کی عزت کا تھا۔ اپنے طور پر وہ اس کی سب سہیلیوں کو کال کر کے سرسری انداز میں خیریت دریافت کرنے کے دوران یہ جان چکی تھیں کہ وہ گھر پہنچ چکی ہیں۔

ساتھ ساتھ امن کا بھی نمبر ملاتی تھیں۔ دعا...... اللہ سے مدد اور گھبراہٹ...... اس عالم میں ٹائم ہاتھوں سے پھسلتا گیا تھا۔ بالآخر مجبوراً انہیں عبداللہ کو بتانا پڑا تھا۔

''امن کی فرینڈز کے کانٹیکٹ نمبرز تو ہوں گے آپ کے پاس...... اتباع تم دو مجھے۔ میں پتا کرتا ہوں۔ اتباع جو بے چین بے قرار نظر آ رہی تھی۔ کچھ کہے بغیر اٹھ کر اپنا سیل فون اٹھا لائی۔

''میں ان سے پتا کر چکی ہوں۔ وہ لاعلم ہیں۔'' بریرہ کی مدھم آواز پر عبداللہ ساکن ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

''پھر کہاں جا سکتی ہے وہ......؟'' اب کے وہ بولا نہیں چیخا تھا۔ اتباع خائف جبکہ بریرہ روہانسی ہو کر رہ گئیں۔ بلکہ ایک بے بس آنسو بھی ان کی پلک سے ٹوٹ کر دوپٹے میں جذب ہوا تھا۔

''عبداللہ! آپ بو سے ایسے کیوں بات کر رہے ہیں۔'' اتباع سے عبداللہ کا سخت و درشت لہجہ بہرحال برداشت نہیں ہو سکا تو بالآخر ٹوک دیا تھا۔

''تم مانو گی کہ یہ غلطی ماما کی ہی ہے کہ انہوں نے اتنی لیٹ......'' کال بیل کی آواز پر عبداللہ ٹھٹکا تھا۔ اس نے لپک کر دروازہ کھولا اور کمرے سے نکل گیا۔ دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترا ہال عبور کیا راہداری سے تیز تیز قدم اٹھاتا پورٹیکو سے گیٹ تک آیا تھا۔ گیٹ کھولنے سے پہلے ہی وہ گیٹ کے پار امن کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ جیسے ہی اس نے گیٹ کا پٹ وا کیا امن جو بدحال بدحواس و سراسیمہ تھی۔ بری طرح کانپتی لرزتی اسے دھکیلتی پہلے اندر گھسی پھر کانپتے ہاتھوں سے دروازہ لاکڈ کرنا چاہتی تھی۔ مگر آنکھوں میں اترتے اندھیرے دل پہ چھایا خوف اس کے کام کے راستے میں رکاوٹ

کھڑی کر رہا تھا۔ عبداللہ نے خود دروازہ بند کیا پھر اسے تھاما۔

''امن......!''

''مجھے چھپا لیں بھائی! اللہ کا واسطہ ہے۔'' وہ اس کے بازو سے چپک کر دھاڑیں مارنے لگی۔ بریرہ اور اتباع جو ہراساں یہاں تک پہنچی تھیں صورت حال کی غیر معمولی گھمبیرتا خاص کر امن کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گئی تھیں۔ جو کسی طور بھی اپنے حواسوں میں نہیں لگتی تھی۔

''ہوا کیا ہے امن! کہاں تھیں تم......؟''

عبداللہ کے لہجے میں عجیب سی وحشت در آئی۔

''امن اندر چلو پلیز اندر آ جاؤ۔'' اتباع نے ایک نظر بریرہ کو دیکھ کر نرمی سے کہا تھا۔ عبداللہ کو بھی جیسے احساس ہوا۔ وہ امن کو جبکہ اتباع بریرہ کو سہارا دیتے اندر لائی تھی۔

''پلیز امن! ریلیکس! کنٹرول یور سیلف!''

اتباع اسے ساتھ لگائے تھپک رہی تھی۔ جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی طغیانی تھی۔ وہ اپنے گھر پر تھی مگر ایسے وحشت سے زدہ تھی گویا ابھی بھی شدید خطرے میں گھری ہو۔

''کیا ہوا ہے امن! مجھے بتاؤ کسی نے تمہیں کچھ کہا......؟'' عبداللہ بے چین بے قرار ٹہل رہا تھا۔ بریرہ ہنوز ساکن بیٹھی تھیں۔ یوں گویا انہیں بنا کچھ کہے سنے ہی عظیم نقصان کا علم ہو گیا ہو۔

''عبداللہ آپ کمرے میں جائیں! میں خود پوچھ لوں گی۔'' اتباع کو عبداللہ کا انداز مناسب نہیں لگا تھا۔ جبھی بظاہر نرمی سے ٹوکا۔ درحقیقت وہ اسے احساس دلانا چاہتی تھی۔

''مگر......'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اتباع نے اس کی بات کاٹ ڈالی۔

''ابھی وہ کچھ نہیں بتا سکتی۔ بہت خوفزدہ ہے۔ میں نے کہا نا میں پوچھ لوں گی۔ آپ جائیں پلیز!'' وہ اب بھی رسان سے ہی کہہ رہی تھی۔ عبداللہ جھلایا۔ خفا نظروں سے اسے دیکھا پھر ایک جھٹکے سے مڑ گیا تھا۔

''امن......! اٹھو۔ سب سے پہلے تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو پلیز! میں کھانا نکال کر لاتی ہوں۔ بو جان نے بھی نہیں کھایا ابھی تک تمہارے انتظار میں۔'' اتباع نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ بجائے اٹھنے کے اس کے ساتھ لگ کر بلک اٹھی۔

''کاش میں آج اکیلی یونیورسٹی نہ گئی ہوتی ...... کاش......'' اس کے انداز میں ایسی وحشت تھی۔ ایسی ہوک تھی۔ وہ ایسے ماتمی انداز میں روئی تھی کہ اتباع بھی دھک سے رہ گئی۔ اسی نے گھبرا کر بریرہ کو دیکھا تھا۔ جو گنگ بیٹھی تھیں۔ اتباع کو امن سے زیادہ ان کی جانب سے تشویش لاحق ہوئی۔

''اتباع! بو جان کو دیکھو۔ تمہیں خود کو سنبھالنا ہے۔ وہ یہ صدمہ نہیں سہہ سکتیں۔ جسٹ ریلیکس......!'' اس کا انداز سرگوشیانہ تھا۔ امن کا طوفان کی زد پر آیا ہوا دل و دماغ جیسے اس ایک بات پر غوطہ کھا کر حواسوں میں لوٹ آیا۔ اس نے سہم کر بریرہ کو دیکھا تھا۔ اور تمام تر اذیت کے باوجود خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی اور آہستگی سے اتباع سے الگ ہو گئی بریرہ سے اتباع سے نظریں چراتی وہ پلٹ کر تیزی سے کمرے سے چلی گئی تھی۔ اتباع نے خائف انداز میں امن کو دیکھا تھا۔

''بو جانی!'' اس کی آواز سہمی ہوئی تھی۔ وہ چونکیں اور دکھ سے مسکرائی تھیں انداز ایسا دل شگاف تھا مسکرانے کا کہ اتباع بھی شل ہو کر رہ

گئی۔

''بو جانی!'' وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ڈھارس کو اپنا ہاتھ اس کے سرد ہوتے ہاتھ پر رکھا۔ ایک بار پھر بریرہ کی آنکھیں چھلک گئی تھیں۔

''امن جو بھی بتائے...... مجھ سے کچھ مت چھپانا بیٹے! اور امن سے بھی کہنا...... کچھ مخفی نہ رکھے۔ یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہوگا۔'' ان کی آواز واضح گھبراہٹ اور لرزش تھی۔ اتباع سراسیمہ ہونے لگی۔

''سب خیر ہوگی بو جانی! انشاء اللہ!'' وہ جیسے ان کے خدشات کے آگے خود ڈٹ دینے کو تیار تھی۔

''اللہ کرے آمین۔'' انہوں نے مدھم آواز میں کہا تھا اور اس کا سہارا لے کر اٹھیں۔

''میں وضو کرلوں۔ مغرب ہونے والی ہے۔'' اتباع نے انہیں واش روم تک چھوڑا تھا۔ احتیاطاً وہیں فکر مندسی کھڑی رہی۔ یہاں تک کہ بریرہ نے وضو کرلیا تھا۔ اتباع انہیں پھر سہارا دے کر جائے نماز تک لائی۔ جو وہ پہلے بچھا چکی تھی۔

''اپنے ماموں کو کال کردو بیٹے! کہنا جلدی آ جائیں گھر......'' آج ان میں کھڑے ہو کر نماز کی ادائیگی کی ہمت نہیں تھی۔ جبھی بیٹھ گئی تھی۔ اتباع نے مضطرب و بیکل ہو کر انہیں دیکھا۔

''آپ ماموں کو کچھ نہیں بتایئے گا بو جانی پلیز!'' بریرہ نے سرد آہ بھری۔

''انہیں ہی تو بتانے کی بات ہے یہ...... بلکہ شاید ہمیں نوبت ہی نہ آنے دیں بتانے والے خود بتا دیں۔'' وہ پژمردہ تھیں۔ انداز خود کلامی کا سا تھا۔ اتباع کے ہر بات سر سے گزری گویا اذان کی پکار فضا میں گونجی تب وہ چونکتی ہوئی گہرا سانس بھرتی ان کے کمرے سے نکل کر امن کے بیڈ روم کی جانب آئی تھی۔ دروازہ نیم وا تھا۔ وہ ہلکا سا تھپتھپاتی اندر داخل ہوئی۔ امن سامنے ہی بستر پر گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھی تھی۔ آہٹ پر ایکدم اپنی جگہ پر دہل کر سر اٹھایا۔

''اذان ہوگئی ہے امن! نماز پڑھ لو۔'' اتباع اس کی بھیگی آنکھوں سے نظریں چرا کر بولی تھی۔ امن کچھ نہیں بولی۔ پیر بستر سے نیچے لٹکا دیے۔

''مجھے اس سے سب سے شدید نفرت اس کے اوصاف کی وجہ سے تھی۔ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا اس کی دشمنی پاپا سے بھی نکل سکتی ہے۔'' اتباع نے بری طرح سے چونکتے اسے دیکھا۔ وہ اسے بے خیال سی لگی۔ جیسے خود سے باتیں کرتی ہوئی۔

''کیا مطلب ہے امن......! بو جان بھی عجیب ہی بات کر رہی تھیں۔'' امن نے چونک کر نمناک نظروں سے اسے دیکھا اور متاسفانہ سانس بھرا اور نظریں پھیر لیں۔

''میں نماز پڑھ لوں۔ اللہ نے ہمیں ہر حال میں شاکر رہنے کا حکم دیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو کبھی ان کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دی۔ جو کچھ آج ہوا۔ وہ جتنا بھی بڑا تھا۔ اس سے بڑا بھی ہوسکتا تھا۔ مجھے ہر پل لگا اللہ ساتھ ہے۔ میں اکیلی نہیں، انسان بڑا سخت جان ہے۔ جس بات کا تصور بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ جب حقیقت میں ٹوٹ پڑتی ہے تو چپ چاپ سہہ جاتا ہے۔''

اتباع منہ کھولے پوری آنکھیں وا کیے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ امن نے واش روم میں بند ہو کر دروازہ لگا لیا۔ اتباع سرد آہ بھر کے پلٹی تھی۔ واپسی کو اٹھتے اس کے قدموں میں تھکن بھی تھی۔ اضمحلال بھی، اضطراب بھی تھا اور فکر مندی بھی۔

☆......☆......☆

وہ ہمیشہ میرے راستے میں کھڑا ہوا کرتا تھا۔ سطحی باتیں کرنا گھٹیا فقرے کسنا عادت تھی اس کی...... میں نے کبھی اتنی اہمیت بھی نہیں دی کہ اتباع سے ہی اس کا تذکرہ کردیتی۔ دراصل ایسے لوگ تو باہر نکلنے والی خواتین کو اکثر فیس کرنے ہی پڑتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کا واحد حل نظر اندازی تھی۔ میں نے وہی کیا...... مگر کل جو کچھ ہوا...... اس کا گمان تک نہیں تھا۔'' اس کے رکے ہوئے آنسو پھر سے بہنے لگے۔ بریرہ اور اتباع ساکن اس کے سامنے بیٹھی تھیں۔ خاص کر بریرہ کا رنگ بالکل زرد تھا۔

اتباع سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ دو دن پہلے عبدالعلی اور قدر کے ساتھ ساتھ عبدالغنی اور عبدالہادی کی فیملی عمرہ کے لیے گئی تھی۔ اتباع اسی باعث مصروف رہی تھی۔ زیادہ وقت اس کا ادھر ہی گزرا تھا۔ عبداللہ سے اس نے بات بھی کی تھی اپنی تعلیم جاری رکھنے کی۔ اسے بہر حال اعتراض نہیں تھا۔ جبکہ اب اس خوف سے اس کی روح سلب ہورہی ہو جو کچھ امن کے ساتھ ہو چکا تھا۔ ہارون بزنس کے سلسلے میں کل ہی دوسرے شہر چلے گئے تھے۔ انہیں بیٹی پر ٹوٹ جانے والی قیامت کے متعلق آگاہی نہیں تھی۔ البتہ عبداللہ ضرور پریشان تھا۔ بلکہ اگر کہا جاتا کہ وہ سب ہی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے تو غلط نہ ہوتا۔ صبح وہ بریرہ سے ملے اور ناشتہ کیے بغیر چلا گیا تھا۔

''کل کیا ہوا تھا امن......!'' بریرہ کا ضبط جواب دینے لگا تو انہوں نے استفسار کیا۔ ان کی آواز غم کی شدت سے گھٹی ہوئی بھی تھی اور بھرائی ہوئی بھی۔ اتباع نے کچھ کہے بنا اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر بہت اپنائیت آمیز انداز میں رکھا تھا۔

''اس کا سامنا جب سابق ہوا تھا مجھ سے۔ وہ معمول سے زیادہ بے باک محسوس ہوا۔ جبھی میں نے چھٹی کا انتظار کیے بنا گھر آجانے کو ترجیح دی تھی مگر...... وہ میری تاک میں تھا جیسے......'' آواز پھر امن کے حلق میں پھنسی۔ آنسو پھر بے اختیار ہوئے۔

''میسج تم نے کیا تھا مجھے......؟'' بریرہ کا سارا تحمل سارا ضبط آج جیسے ان کا ساتھ چھوڑے ہوئے تھا۔ امن نے آنسو پونچھتے ہوئے سر کو نفی میں جنبش دی۔

''اسی نے کیا تھا۔ وہ مجھے سی سائیڈ پر کسی ہٹ میں لے گیا تھا۔ وہ مجھے برباد کردینا چاہتا تھا ماما! مگر اللہ نے مجھے خود میری نظروں سے گرنے سے بچالیا۔ خدانخواستہ ایسا ہوتا تو میں شاید پلٹ کر آپ کے پاس واپس نہیں آتی۔ غم کی شدت شاید مجھے بھلادیتی کہ خودکشی حرام فعل ہے۔''

''شکر ہے خدا کہ اُس نے تمہاری عزت محفوظ رکھی۔'' بریرہ کی جانے کب کی اٹکی سانس جیسے بحال ہوئی۔ امن جو ویران خالی نظروں سے اپنی ہتھیلیوں کو گھور رہی تھی چونک کر انہیں تکتی متاسفانہ آہ بھر کے رہ گئی۔

''وہ بہت ظالم اور بے حس انسان ہے۔ اس کے دل میں رحم کا جذبہ بھی مفقود ہے۔ وہ اپنے شیطانی منصوبے کو لازماً پورا کرلیتا بس اللہ نے بچانا تھا مجھے۔ ماما! جو عورت وہاں آئی وہ ماضی میں شاید کبھی پاپا سے نفرت کرتی تھی۔ وہ اس کا بیٹا تھا۔ پاپا سے انتقام کا انہوں نے یہ انداز اپنایا تھا۔ مجھے برباد کرنے کا...... تاکہ پاپا کبھی سر اٹھا کر نہ جی سکیں۔ وہ یہی چاہتے تھے دونوں۔''

''سوحا...... اُس کا نام سوحا تھا......؟'' بریرہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ آنکھوں میں اضطراب اور ملال اتر رہا تھا۔ اس نے جھکا ہوا سر

نہیں اٹھایا۔

''پتا نہیں، لیکن وہ بہت عجیب خاتون تھیں۔ بے باک بلکہ اگر واہیات کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ ماما اس نے اپنے بیٹے سے مجھے نکاح کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر میں آمادہ نہ ہوتی تو......'' امن نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ان کہی بات بنا کہے سنے ہی سمجھی جانے والی تھی۔ بریرہ نے کچھ کہے بغیر اسے ساتھ لگا لیا۔ امن بے قراری سے مچل مچل کر رونے لگی۔

''میں کل سے صبر کرنا چاہ رہی ہوں ماما! مجھے صبر نہیں آ رہا۔ کوئی تو مجھے بتا دے۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟'' اس کے آنسوؤں نے کتنی شدتوں سے بلکتے ہوئے ایسا سوال کیا تھا۔ جس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ بریرہ خود بھی جیسے ضبط نہ رکھ سکیں۔ اس کے ساتھ وہ بھی بلک کر رو پڑی تھیں۔ اتباع کی گھبراہٹ دو چند ہوئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ ایسا کیا کرے جو ان کا دکھ دور ہو سکے۔

☆......☆......☆

وہ ساکن بیٹھے تھے۔ آنکھوں میں نمی کا احساس ہر گزرتے لمحے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ہونٹوں پر شدت ضبط کے باوجود لرزش تھی۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ ان کی جذباتیت ان کی خطا کی سزا ان کی معصوم بیٹی کو بھگتنا پڑے گی۔ یہ تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچ پائے تھے وہ۔ غصے میں اٹھا ہوا ایک غلط قدم...... آج انہیں زندگی کے کس درجہ نازک دوراہے پر لا کر کھڑا کر چکا تھا۔ وہ عورت...... جس کے تعلقات کسی ایک مرد تک محدود نہ تھے۔ وہ تھی اُن کا انتخاب......

بظاہر وہ خود کو کتنا پارسا کتنا مظلوم بنا کر پیش کرتی تھی۔ جبھی تو اس کے فریب میں آ کر انہوں نے شادی کی تھی اس سے۔ یا پھر ان دنوں جس جذباتی کیفیت کے زیر اثر تھے۔ عقل سے ماورا ہو گئے تھے۔

وہ کتنا عرصہ ان کے عقد میں رہی تھی۔ مگر اس کے حوالے سے حقیقت منکشف ہونے کے بعد کتنے دل برداشتہ ہوئے تھے وہ یہ سوچ کر کہ ان کے نصیب میں عورت کی محبت اس کی وفا کا سکھ نہیں لکھا گیا تھا۔ سوحا کی بدکرداری کا احساس اس حد تک گھن آمیز تھا کہ وہ خود کو دوبارہ اس کے قریب جانے پر آمادہ نہیں کر سکے۔ ڈیڑھ سال بعد میں بھی وہ ان کے حق میں ان کی زوجیت میں رہی تھی۔ مگر ہارون اسرار نے کبھی اس عورت سے اپنا شرعی و جائز حق وصول کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ سوحا نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کر لی تھی۔ تو اس کی وجہ ظاہر ہے اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر وہ ہارون اسرار تھے۔ ایسے نفیس اور اعلیٰ ذوق کے مالک شخص جنہوں نے بریرہ کی جانب سے دل برداشتہ ہو کر اسے اپنایا تھا۔

''بریرہ...... جس میں خدانخواستہ کردار کے لحاظ سے معمولی سی بھی خامی نہیں تھی۔ وہ اس کی بے اعتنائی نہیں سہہ سکے تھے۔ یہ تو پھر بہت بڑا دھوکہ تھا۔ جو سوحا انہیں دیتی رہی تھی۔ اگر بریرہ پر کچھ جتلانا مقصود نہ ہوتا تو لازماً اسی وقت وہ اس فاحشہ عورت کو چھوڑ دیتے۔ انہوں نے لیکن اگر چھوڑا نہیں بھی تھا تب بھی ہر لحاظ سے اس سے کٹ گئے تھے۔ یہاں تک کہ اک دوسرے کو دیکھے بھی ہفتے گزر جاتے۔ ہارون نے اس آگاہی کے بعد اپنا کمرہ الگ کر لیا تھا۔

اس کے باوجود طلاق کے محض چھ ماہ بعد جب وہ گود میں موجود بچے کے ہمراہ یہ دعویٰ لے

کر آئی کہ وہ ان کا بچہ نہیں ہے تو پھر ہارون کیسے بپھر گئے تھے۔ وہ سارے راز یا پھر طیش جو اندر ہی رہ گیا تھا۔ اس وقت ابل کر اتنی شدت سے باہر آیا تھا کہ سوچا بریرہ کے سامنے پوزیشن خراب ہونے پر الٹا انہیں دھمکیاں دینے پر اتر آئی۔ ہر صورت سوچا وہ بچہ جس کا نام وہ دائم تجویز کر چکی تھی۔ ہارون کے سر تھوپنے پر آمادہ تھی۔ اور ہارون کسی بھی طرح کسی دوسرے کے گناہ کی نشانی خود اپنانے پر آمادہ نہیں تھا۔ حالانکہ تب سوچا کی دھمکیوں سے خائف ہوتیں بریرہ نے انہیں سمجھایا بھی تھا۔

''آپ اس بچے کو ایکسپٹ کر لیں ہارون! کوئی حرج نہیں ہے۔ میں پال لوں گی اسے۔''
اور جواب میں ہارون کی آنکھیں ایسے سرخ ہو گئیں تھیں گویا ان سے لہو چھلکنے لگا ہو۔

''تم کیوں سنبھال لو گی اسے بریرہ!'' وہ اسے گھورنے لگا تھا۔ بریرہ کی جان پر بن کر آنے لگی۔

''میرا مطلب ہے......!''

''تمہارا مطلب کہیں یہ تو نہیں ہے بریرہ! کہ یہ میرا بیٹا ہی ہے......؟ تمہیں مجھ سے زیادہ اس تھرڈ کلاس عورت کی بات کا یقین ہے۔؟ میں تمہیں بتا چکا ہوں سالوں سے میرا اس سے ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر یہ بچہ میرا کیسا ہو گیا۔'' ہارون ضبط کھو کر چلانے لگے تھے۔ بریرہ اس حد تک ہراساں نظر آنے لگیں۔

''ہارون! ریلیکس! میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ اللہ گواہ ہے۔ میں نے آپ پر شک نہیں کیا۔ مجھے آپ کی بات کا بھی یقین ہے۔ بات یہ ہے کہ بچہ تو معصوم ہے۔ چاہے کسی ناجائز تعلق کی پیداوار ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی ماں بھی اگر اسے رکھنے پر آمادہ نہیں تو بچہ کہاں جائے گا......؟ اسے اچھا ماحول مل جائے۔ اچھی تربیت مل جائے۔ میرا مقصد تو اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔''

بریرہ وضاحتیں دیتے ہوئے صفائیاں پیش کرتی ہوئی روہانسی ہونے لگیں تھیں۔ جب ہارون اسرار نے انہیں شانوں سے تھام کر اپنے مقابل کر لیا تھا۔ کچھ دیر سرد نظروں سے انہیں دیکھتے رہے پھر جب بولے تو ان کا لہجہ بھی ان کی نظروں کی مانند سرد مہر ہو رہا تھا۔

''تم الگ ہو۔ اعلیٰ ظرف ہو، میں مانتا ہوں جان بھی گیا ہوں۔ مگر بریرہ تمہاری یہی اعلیٰ ظرفی میری زندگی کے بہت سے قیمتی ماہ و سال تباہ و برباد کر چکی ہے۔ جو مجھے بے حسی سے زیادہ کچھ اور احساس نہیں دیتی تھی۔ توہین اور بیکی کے سوا کچھ اور نہیں لگتی تھی۔ بریرہ بہت سلگا ہوں۔ بہت تڑپا ہوں۔ مزید نہیں یہ دکھ اٹھا سکتا۔ میں ان معاملوں میں ......یعنی اپنی ذات اپنے گھر اپنے بچوں کے معاملے میں پوزیسو دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔ چاہتا ہوں تم بھی میرے لیے ویسی ہی پوزیسو ہو جاؤ۔ تم یہاں اعلیٰ ظرف نہ بنو۔ تم یہاں الگ نظر نہ آؤ۔ تم مجھ سے لڑو، مجھ سے سوال کرو، مجھ سے بدگمان ہو۔ پوچھو فلاں وقت میں کہاں تھا۔ فلاں وقت میں نے تمہیں اگنور کیوں کیا۔ بریرہ تمہارا یہ رویہ مجھے کتنی خوشی دے سکتا ہے اندازہ نہیں کر سکتیں تم۔''

بریرہ گنگ رہ گئی تھیں۔ ان کی گویائی گویا سلب ہو گئی۔ حواس مختل تھے۔ انہیں یقین نہ آتا تھا جیسے ہارون اتنے حساس بھی ہو سکتے ہیں۔ اتنی شدت کی ایسی جنونی محبت بھی اس سے کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس کا ثبوت تو وہ فراہم کر چکے تھے۔ ان کا دل گداز ہوا۔ آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔ انہیں

سمجھ نہیں آیا وہ ہارون کو کیسے قائل کریں۔ ایک طرف قربانی تھی۔ ایثار کا جذبہ تھا۔ ایک طرف شوہر کی خوشی تھی۔ رضا تھی۔ ایک طرف اللہ کا حکم تھا۔ اچھائی کا، دوسری طرف شوہر کی آس مندانہ نظریں تھیں۔ ایسی مشکل سے دوچار ہوئی تھیں۔ جس سے نکلنے کا راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ انہوں نے بارہا مرتبہ کوشش کر کے دیکھ لی۔ مگر نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات۔

''اس بچے کو اپنانا...... گویا کہ اس الزام کو خود پر تھوپنا ہے بریرہ! میں یہی نہیں کر سکتا۔'' ان کا لہجہ دانداز قطعی اور دو ٹوک تھا۔ اور بریرہ کو مصلحتاً خاموش ہونا پڑا۔ شوہر کی نیتیں تو اللہ کی خفگی کا احتمال دامن گیرا ہوتا تھا۔ اللہ کی رضا کے راستے پر چلتیں تو ہارون شاید عمر بھر کو بدگمان ہو جاتے۔ انہوں نے نیکی کے جذبے کو دبا دیا۔ مار ڈالا۔ چشم پوشی اختیار کر لی تھی۔ اور بائیس سال گزر گئے تھے۔ وہ عورت اپنی بدفطرت کے ساتھ ان کے روبرو تھی۔ یا پھر قدرت کا یہ کوئی حساب تھا جو برابر ہوا تھا۔ ان کے پہلو میں شدید درد اٹھا تھا۔ اور لبوں سے کراہیں پھوٹنے لگیں۔

''کاش تب وہ بریرہ کی بات کو نہ ٹالتے۔ کاش تب وہ اس بچے کو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے قبول کر لیتے۔ الزام تو نبیوں پر بھی عائد ہوتے تھے۔ پھر وہ کیا چیز تھے۔ انہوں نے دانستہ یا نادانستہ خود کو کچھ سمجھا تھا۔ خود کو کچھ گردانا تھا۔ اور یہ جو کچھ سمجھنا کچھ گرداننا ہوتا ہے ناں یہی غرور کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور حدیث ہے کسی دل میں اگر رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہے تو وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ انہیں خدا سے خوف آنے لگا۔ انہیں آخرت میں جو سزا ملنی تھی۔ سو ملنی تھی۔ دنیا میں اس کا خمیازہ وہ اس طرح بھگت رہے تھے۔ یعنی اللہ نے بائیس سالوں بعد ان پر گرفت کر کے انہیں ان کی غلطی جتلا دی تھی۔ انہیں کبھی کا پڑھا تکبر کے حوالے سے واقعہ پوری جزئیات سے یاد آنے اور آنسو دلانے لگے۔

تیری قدرت کو جانتا ہوں میں
تجھ کو لاریب مانتا ہوں میں
مقتدر قادر و قدیر ہے تو
تیری رحمت بھی مانگتا ہوں میں

ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہونے لگا۔ اللہ ہمارے حالات سے ہی ہم پر ہماری غلطیوں اور گناہوں کو آشکار کرتا اور جتلاتا ہے۔ اور اللہ نے تو انہیں قدم قدم پر سنبھلنے سمجھنے کے مواقع فراہم کیے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ''دنیا سے ایسے تعلق رکھنے کا حکم ہے جیسا آگ سے رکھا جاتا ہے۔ اس سے اپنا آپ بچایا بھی جاتا ہے اور نفع بھی حاصل کیا جاتا ہے۔''

دروازہ کھلا تھا۔ اور بریرہ اندر چلی آئیں۔ وہ اتنے غمگین وافسردہ تھے کہ نگاہ بھر کے بھی انہیں نہیں دیکھا۔ ورنہ یہ وہ ہستی تھی۔ جس سے انہوں نے اپنی ذات سے بھی بڑھ کر محبت کی تھی۔ وہ جب بھی سامنے آتیں انہیں اپنی قسمت پر رشک اور بینائی پر پیار آنے لگتا تھا۔

''ہارون......!''

''بریرہ......! تم ٹھیک تھیں۔ وقت نے حالات نے اللہ نے جتلا دیا۔ غلط میں تھا۔ میرا فیصلہ تھا۔ میرا رویہ تھا۔ کاش میں ایسا نہ کرتا تو......'' بریرہ تڑپ کر ان کے پاس آئی تھیں۔ گھٹنوں کے بل ان کے پاس نیچے بیٹھیں اور ان کے ہاتھ دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

''ملال اچھا ہوتا ہے ہارون! مگر اسے پچھتاوے کی جانب نہیں بڑھنا چاہیے۔ غلطی

صرف آپ کی نہیں تھی۔ کجی تو میرے اندر تھی۔ کہ میں ڈٹی نہیں بلکہ ڈر گئی۔ حق پر ہوتے ہوئے آپ کو منانے قائل کرنے اور اللہ سے مدد مانگنے کے بجائے خاموشی اختیار کرلی۔'' وہ خود ان سے بڑھ کر ملول اور افسردہ تھیں۔ ہارون ساکن بیٹھے انہیں مضطربانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔

''یہ موقع ایسا نہیں ہے کہ خاموشی میں پناہ تلاش کی جائے۔ عمل کا وقت ہے ہارون! ہمیں اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا ہے۔ یہ نکاح زبردستی کا ہوا ہے۔ جس کی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ آپ خود فیصلہ کرلیں کیا کرنا ہے مزید!'' ہارون خاموش رہے۔ وہ ہنوز گم صم تھے۔

''دنیا میں ہر شے ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جایا کرتی ہے۔ مگر صرف انسان ہے جو ٹھوکر لگنے کے بعد بنتا ہے۔ بریرہ..... تمہیں اپنی شادی یاد ہے۔ میں کیا تھا۔ نیک محبت بھی ایک عطا ہے۔ ایک نعمت ہوتی ہے۔ جو ہر کسی کو میسر نہیں آتی۔ حالات پر غور کریں تو اک اور جانب بھی اشارہ محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے قدرت ہمیں پھر سے اک موقع فراہم کررہی ہو اصلاح کا......؟ انہوں نے کہا تھا اور بریرہ دہل گئی تھیں۔ انہوں نے خوف سے پھٹی نظروں سے ہارون اسرار کو دیکھا۔ جو کہیں کھوئے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

''ک...... کیا مطلب ہے آپ کا؟'' ان کی آواز بھی ان کے لہجے کی طرح لڑکھڑا گئی تھی۔ ہارون نے پھر سرد آہ بھری۔

''ممکن ہے اللہ دائم کو بھی راہ ہدایت پر لانا چاہتا ہو......؟ ہمیں کوئی بھی ایکشن لینے سے قبل استخارہ کرنا چاہیے۔'' بریرہ کی آنکھوں میں اترا خوف گہرا ہونے لگا اور دکھ بھی......

''ایسی شک آلود نظروں سے مجھے نہ دیکھو بریرہ! میں اپنی غلطی پر اپنی بیٹی کو قربان کرنے کا تصور بھی نہیں رکھتا ہوں۔ یہاں یہ ضرور ہے اب میں خود سے کوئی فیصلہ کرنے سے خائف ہوں۔ اللہ کی رضا کو اپنی مرضی اپنی چاہت پر مقدم رکھنے کا خواہش مند ہوں۔'' انہوں نے گویا وضاحت دی تھی۔ بریرہ کی نظریں ہلکی سی خفت کا احساس لیے جھک گئیں۔

''جی...... میں سمجھتی ہوں۔ ہم انشاء اللہ! استخارہ کروالیں گے۔'' اُن کا لہجہ مدہم تھا۔ ہارون اسرار نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کے ہاتھ پر رکھا پھر بھاری بوجھل آواز میں گویا ہوئے تھے۔

''محبت رضا ہے بریرہ! راضی بارضا رہتی ہے۔ محبت میں حزب و ملال نہیں رہتا۔ وہ آر کرے یا پار کرے وہ جو چاہے کرے' کوئی سوال نہیں ہوگا۔ وہ ہمارے لیے وہی کرے گا۔ جو بہترین ہے۔ وہ رب ہے۔ اُسے ہر حق حاصل ہے۔ میں نے استخارہ کا اسی لیے کہا ہے بریرہ! کہ اب ہمیں رب سے مشورہ کرنا چاہیے۔ ہم اس سے پہلے اپنی مرضی کرچکے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔''

ان کا لہجہ گھمبیر تھا۔ ان کا انداز بے حد نرم تھا۔ بے حد سلجھا ہوا۔ بریرہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتیں رہیں۔ پھر مسکرادیں تھیں۔ اس دوران وہ پہلی بار ایسے دل سے مسکرائی تھیں۔ ہلکے پھلکے انداز میں، انہیں ہارون کا سمجھانا ایسی بات کرنا، اللہ کی طرف دیکھنا اللہ پر مکمل یقین اور بھروسا کرنا بہت پیارا لگا تھا۔ اک عرصے سے وہ ان کا یہ روپ دیکھنے کی متمنی تھیں۔ اک عرصے بعد ان کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ یہ سچ ہے۔ اللہ پر کیا بھروسا کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ اللہ سے محبت کبھی بے فائدہ نہیں رہتی۔ اللہ سے مانگی دعا کبھی

کبھی ضرور قبول ہوتی ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہم بھروسا کرنے محبت کرنے والے نہیں بنتے ہمیں دعا کے لیے فرصت نہیں ہے۔

☆......☆......☆

مکہ مکرمہ میں رات اتر چکی تھی۔ سارا دن سورج سروں پر تپتا تھا اور پسینوں میں نہلائے رکھتا۔ مگر رات بے حد سکون آمیز اور ٹھنڈک بھری ہوتی تھی۔ لیکن اگر ان کے احساسات پوچھے جاتے تو جذب گداز اور بے مائیگی کا ایسا احساس دل و روح پر چھایا ہوا تھا کہ جسے بیان میں لانا ممکن ہی نہ تھا۔ درمیان میں آنے والے پچیس سال انہیں بھول گئے تھے۔ انہیں لگتا تھا۔ وہ وہی علیزے ہیں جو دیا بن گئی تھیں۔ جس نے اپنے گھر والوں کو دھوکہ دیا تھا۔ جس نے اپنا مذہب چھوڑ دیا تھا۔ محض دنیا کی اک کشش کی خاطر، پھر جسے احساس ہوا تھا۔ اپنی غلطی کا...... اپنے گناہ کا...... جو ردتی جاتی تھیں تو انہیں کوئی چپ نہ کرا سکتا تھا۔ ان گزرنے والے ماہ و سال میں وہ متعدد بار اللہ سے معافی مانگ چکی تھیں۔ مگر جو حالت جو کیفیت بیت اللہ شریف کے سامنے آکر اُن کی ہوئی۔ اسے کیا نام دیا تھا۔ ایسی ہیبت طاری ہوتی تھی کہ وہ وجود سے ذرہ بن گئی تھیں۔ حقیر ذرہ...... جس کی کوئی وقعت ہوتی ہے نہ اوقات پھر بھی...... پھر بھی اتنے زعم میں بتلا ہوئی پھر بھی اتنے بڑے بڑے گناہ کر ڈالے۔ انہیں لگا ابھی تو رب کے روبرو ہوئی ہیں وہ۔ ابھی تو رب نے نگاہ ڈالی ہے اُن پر وہ کھڑی نہ رہ سکی تھیں۔ پیشانی کے بل سجدے میں جا گری تھیں۔ گریہ وزاری کا عالم یہ تھا کہ حواس سلامت نہیں رہے۔

لبیك اللھمہ لبیك

بس اک صدا ہونٹوں سے بلند ہوتی تھی اور وہ سسکتے جاتے تھی۔ بھوک پیاس، گرمی سردی ہر احساس ختم تھا۔ وہ بس رب کے ساتھ دعا کا رشتہ جوڑے بیٹھی تھیں۔ باتیں تھیں کہ ختم نہ ہوئی تھیں۔ دکھ تھا کہ مٹتا ہی نہ تھا۔ ملال تھا کہ کنارہ نہ پاتا تھا۔

دوسری جانب عبدالہادی تھے۔ جن کی کیفیت شاید تھوڑی ہی علیزے سے جدا تھی۔ وہ بھی ہر چیز سے بے نیاز تھے۔

غلافِ کعبہ کو چھوتے وہ سراپا عاجز تھے۔ خاکسار تھے۔ بوسہ دیتے ان کا دل آنکھوں کے رستے بہہ جانے پر آمادہ تھا۔

رحمٰن رحیم سدا سائیں
رحمٰن رحیم سدا سائیں

ان کا دل ورد کر رہا تھا۔ پھر وہ پیشانی کعبہ کی چوکھٹ پر ٹیکتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

اس کرم کا کروں شکر کیسے ادا
جو کرم مجھ پر میرے رب نے کیا

''تجھے یاد ہے ناں میرے مالک! سب یاد ہے ناں...... جب میں نے کہا تھا۔ میں تھک چکا ہوں۔ تو نے فرمایا۔

خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ سورۃ زمر آیت 53

اور میں رو دیا تھا۔ کوئی میرے دل کی بات نہیں جانتا۔ تو نے تسلی دے دی تھی۔

کتنا بے قرار تھا میں تب بھی تو پوچھ لیا تھا۔ کب تک صبر کرنا پڑے گا مجھے۔ تو نے جواباً فرما دیا تھا۔

''تم کیا جانو شاید وعدے کا وقت قریب ہی ہو۔''

اور واقعی تو نے مجھے نوازا تھا۔ بہت جلدی بہت تسلی سے، ایسے کہ کوئی تشنگی نہ رہیں۔ پھر اک

وہ وقت بھی آیا تھا۔ جب میں نے کہا تھا۔ تُو بہت بڑا ہے۔ اور تیری قربت مجھ نہایت چھوٹے انسان کے لیے نہایت دور ہے۔ میں اس وقت تک کیا کروں؟'' تُو نے جواب دیا تھا۔

''تم وہی کرو۔ جو میں کہتا ہوں۔ اور صبر کرو تاکہ خدا خود ہی حکم جاری کر دے۔''

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ تو نے علیزے کے دل میں میرے لیے موجود نفرت کو محبت میں بدل دیا۔ تو ہی ایسا کرنے پر قادر تھا۔ لیکن جو بیچ کا وقفہ تھا وہ بہت تکلیف دہ تھا۔ جبھی تو میں نے گزارش کی تھی تجھ سے۔

''تُو تو بہت ہی پر سکون ہے۔ تُو خدا ہے اور تیرا صبر و تحمل بھی خدائی ہے۔ جبکہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے صبر کا ظرف بہت ہی چھوٹا ہے۔ تُو ایک اشارہ کر دے...... کام تمام ہے۔''

کیسا کرم تھا رب کا...... کیسی عطا اگر سمجھی جاتی تو۔ کہ وہ سجدے میں سر کو رکھتے تھے۔ تو اٹھانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ ایسا سکون ایسی تسکین اور آسودگی جس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔ وہ خوش تھے بہت سرشار...... عطا فرمانے والے رب نے اپنے خزانوں کے منہ ان کے لیے کھول دیے تھے۔ رب کی رضا سے بڑھ کر بھی کوئی دولت ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ اس دولت سے مالا مال تھے۔ اور اک جذب کی کیفیت میں کہتے تھے۔

سجدوں کے عوض فردوس مجھے یہ بات مجھے منظور نہیں

بے لوث عبادت کرتا ہوں بندہ ہوں تیرا مزدور نہیں

عبداللہ نے کس قدر غصے سے ناراضی سے بریرہ و ہارون اسرار کو دیکھا۔

''یہ جو کچھ بھی تھا۔ نفرت کی کوئی حد یا انتقام کی خاطر لیا گیا اسٹیپ پاپا میں بس اتنا جانتا ہوں۔ میں اس خبیث آدمی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ وہ کیا سمجھتا ہے۔

امن لاوارث ہے کہ وہ جو چاہے گا اس کے ساتھ سلوک روا رکھ لے گا۔ اس کی بہتری اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ امن کو اسی خاموشی سے چھوڑ دے۔ جیسے بزدلوں کی طرح چھپ کر نکاح پر مجبور کیا تھا۔''

اس کا لہجہ سنگلاخ اور غصیلا تھا۔ صاف لگتا تھا وہ جو کہہ رہا ہے اگر وہ ویسا نہ ہوا تو لازماً وہ اپنا کہا کر گزرے گا۔ بریرہ نے گھبرا کر پہلے عبداللہ پھر ہارون کو دیکھا تھا۔ جو پریشان نظر آ رہے تھے۔

''آپ فکر نہ کرو بیٹے! میرا جیسے ہی ان لوگوں سے رابطہ ہوتا ہے میں اس مسئلے کا حل نکال لوں گا۔ انشاء اللہ! انہوں نے آہستگی سے کہا تو عبداللہ کی آنکھوں میں عجیب سی تلخی اترنے لگی۔

''مجھے آپ پر بھی حیرت ہے پاپا! آپ اس عورت کی خباثت سے آگاہ تھے۔ وہ باقاعدہ آپ کو دھمکیاں بھی دے چکی تھی۔ پھر بھی آپ پُرسکون بیٹھے وار ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ ایسی صورت حال میں ایسے ہی نتائج سامنے آیا کرتے ہیں۔''

اس کا لہجہ زہر خند تھا۔ ہارون خفت سے سر جھکائے ہونٹ بھینچ گئے تھے۔ اتباع نے گھبرا کر بے چین ہو کر عبداللہ کی جانب دیکھ کر گویا نظروں میں سرزنش کرنی چاہی تھی۔ مگر وہ متوجہ نہیں تھا۔ ایک جھٹکے سے اُٹھ کر وہاں سے گیا تو اتباع خود بھی اس کے پیچھے کمرے میں آئی۔ وہ شرٹ کے بٹن کھولتا باتھ لینے کے ارادے سے اپنے کپڑے نکالنا چاہتا تھا جب اتباع نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔

''آپ کو ماموں سے ایسے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ عبداللہ!'' گو کہ اس کا انداز ناصحانہ تھا اس کے باوجود عبداللہ کو ناگوار محسوس ہوا اور تیوری چڑھ گئی۔

''پھر کیسے بات کرنی چاہیے ہے تم بتادو۔''

''قرآن کریم میں رب تعالیٰ نے والدین کے سامنے اُف کرنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ یہ بھی مت بھولیں۔ عبداللہ کہ یہ جو کچھ بھی ہوا اس میں سب سے زیادہ دکھ کا حصہ ماموں اور بوجانی کے حصے میں ہی آیا ہے۔ ہمیں پھر یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ انہی پر انگلی اٹھا اٹھا کر ملامت کریں۔'' وہ کچھ دیر کو خاموش ہوئی پھر لہجے میں مزید نرمی بھرتے ہوئے اس کے ہاتھ ہٹا کر خود اس کی شرٹ کے بٹن کھولنے شروع کیے تھے۔

''عبداللہ! والدین کے ساتھ حسنِ سلوک یہ ایک ایسا قصہ ہے۔ جسے لکھتے آپ ہیں اور آپ کی اولاد اسے پڑھ کر سناتی ہے۔ لہٰذا اچھا لکھیں تاکہ کل کو اچھا سننے کو ملے۔''

سر جھکائے سنجیدگی سے کہتی وہ اس کی شرٹ اُتار کر رکھنے کے ارادے سے مڑی تھی کہ عبداللہ نے ایکدم سے اس کی کلائی جکڑ کر اسے اپنے مقابل کر لیا۔ آنکھوں کے چہرے کے تاثرات لمحوں میں کچھ کے کچھ ہو گئے تھے۔

''اگر میں کہوں کہ مجھے پھر بھی فکر نہیں۔ میری اولاد کی تربیت تو آپ کریں گی۔ اور مجھے یقین ہے بہت اچھی کریں گی۔'' اتباع ٹھٹکی اور اس کی جانب نگاہ اٹھائے بغیر ہی لرز کر بول اٹھی تھی۔

''استغفراللہ! میں کیا اور میری اوقات کیا...... عبداللہ اک قانون قدرت بھی ہے۔ مکافاتِ عمل بھی یہی رب کا انصاف بھی ہوتا ہے۔ چنے بو کر کوئی گندم نہیں کاٹ سکتا۔ کیئر فل تو رہنا پڑتا ہے۔ اللہ سے ڈرنا ہی عافیت کی نشانی ہے۔''

وہ جیسے سمجھانے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ عبداللہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

''اوکے فائن مائی حور! میں پاپا سے معذرت کر لوں گا۔ اور حکم......؟''

''اس روز بوجان سے بھی آپ بہت سخت لہجے میں بولے تھے۔'' اتباع ہنوز سنجیدہ تھی۔

''اُن سے بھی کر لوں گا۔ مزید ارشاد فرمایئے۔ اس کی آنکھیں بھی متبسم تھیں گویا۔ اب کے اتباع جھینپی۔

''کچھ نہیں میں چائے بناتی ہوں۔ وہیں آجایئے گا ہال میں، اور ماموں کو تسلی دیں انہیں آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ بیٹا بازو کی حیثیت رکھتا ہے باپ کے لیے۔ آپ کو انہیں ان کی طاقت بن کر دکھانا ہوگا عبداللہ!''

''جو حکم مائی لیڈی!'' وہ سرخم کر گیا۔ اتباع خفیف سی ہو گئی تھی۔ جبھی مسکراہٹ دباتی باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

خواب میں ہاتھ تھامنے والے
دیکھ بستر سے گر پڑا ہوں میں

امن نے بے چین ہو جانے والے ہاتھ سے سیل فون واپس رکھ دیا۔ یہ دائم کا میسج تھا۔ وہ اب بہت دھڑلے سے اسے کال بھی کرتا تھا اور میسج بھی۔ امن کو اپنا آپ اس بے بس پرندے کی مانند لگتا تھا۔ جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں۔ جس کے پیروں میں ان دیکھی زنجیریں ڈال دی گئی ہوں۔ وہ خود کو ہر لمحہ جاں گسل دلدل میں اترتا محسوس کرتی تھی۔ اس کی سوچوں کی یلغار کو فون پر ہونے والی بیل نے توڑا تھا۔ اس نے خالی نظروں سے اپنا سیل فون دیکھا۔ جس کی اسکرین

براب سوائے دائم کے کسی کا نمبر روشن نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس نے کال ریسیو کرلی۔ وہ اگر کال ریسیو نہیں کرتی تو وہ بہت گھٹیا اور گھٹیا زبان میں بات کرنے اور دھمکیاں دینے لگتا تھا اسے۔ جو اس کی برداشت سے باہر کی بات ہوا کرتی۔

''کتنے دن ہو گئے ہیں ہمارے نکاح کو...... تمہارے پیرنٹس بہت بے غیرت ہیں کہ ابھی تلک تمہیں رخصت کرنے کا فیصلہ نہیں کر پائے۔ کیا تمہارا باپ نواسے کی آمد کی خبر سن کر یہ قدم اٹھائے گا؟'' امن کے چہرے پر تکلیف دہ تاثر پھیل گیا۔ اس نے نچلا ہونٹ بے دردی سے دانتوں سے کاٹا۔

''زبان کاٹ کر نہیں پھینکی تھی تمہاری میں نے گھر چھوڑتے وقت جو بولنا بھول گئی ہو۔ بتاؤ اپنے باپ کو جا کر کہ تم پریگنینٹ بھی ہو سکتی ہو۔ اس سے پہلے وہ تمہیں میرے ساتھ بھیجنے کا انتظام کرے۔'' امن نے آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ دو آنسو پھر بھی ٹوٹ کر پلکوں سے گالوں پر پھسلتے دوپٹے میں جذب ہوئے۔ وہ تب بھی لب بستہ رہی تھی کہ وہ مخمور قسم کی سانس بھرتے ہوئے ہنسنے لگا تھا۔

''سنا تھا ایک اچھا تعلق بارش کی طرح ہوتا کہ برسنے کے بعد ختم ہو جائے۔ ہوا کی طرح ہوتا ہے۔ خاموش مگر آپ کے آس پاس...... تمہاری قربت کے وہ چند لمحے ایسے ہی کیف آگہیں تھے امن ڈارلنگ! میں ابھی تلک ان کے خمار میں ڈوبا ہوا ہوں۔ ہر لمحہ تمہیں مس کرتا ہوں۔ آجاؤ اس سے پہلے کہ بے قرار ہو کر میں خود آجاؤں۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ امن جو ہر جذبے سے عاری بیٹھی تھی۔ چونکی اگلے لمحے اس نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون کا سوئچ آف کر دیا۔

اندر آئی اتباع کو اس نے اپنی انہی خالی اور ویران نظروں سے دیکھا تھا اور نگاہ پھیر لی۔

''امن......! ارسل بھائی آئے ہیں۔'' اس اطلاع پر امن کے دل میں جیسے کسی نے چٹکی سی بھری تھی۔ اس نے استفہامی نظروں سے اتباع کو دیکھا۔ گویا پوچھ رہی ہو۔ مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ وہ بھی اب......''

''تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اتباع کا لہجہ مدھم تھا۔ نظریں جھکی ہوئیں۔ امن کو جیسے اپنی سماعتوں پر اعتبار نہیں آسکا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل سی پڑیں۔

''کس سے......؟'' وہ گنگ ہوتی ہوئی رہ گئی۔

''تم سے امن! میں یہاں چھوڑ جاتی ہوں بھائی کو۔'' اتباع کہہ کر پلٹنا چاہتی تھی کہ وہ بے اختیار ٹوک گئی۔

''مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ منع کر دو انہیں۔''

''امن......!'' اس کا لہجہ سخت تھا۔ روکھا تھا۔ جبھی اتباع ہرٹ ہوئی تھی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ حوصلہ گنواتی بے اختیار چیخ پڑی۔

''اتباع میں نے کہا مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ صاف کہہ دو جا کے کہ......'' اس کی بات ادھوری رہ جانے کا باعث دروازہ کھول کر وہیل چیئر سمیت اندر آتا ہوا ارسل احمد تھا۔ وہ اس کی آخری دھتکار نما بات بھی پوری جزئیات سے سن چکا تھا۔ اب صحیح معنوں میں امن کو سکتہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

''میں چائے بنا کر لاتی ہوں بھائی!'' اتباع گڑبڑا کر بولی تھی اور کترا کر دروازے سے نکل گئی۔ ارسل بہت محتاط نظروں سے امن کا جائزہ لے رہا تھا۔ جو دوپٹہ پیشانی تک کھینچتی ذرا سا رُخ

بھی پھیر گئی۔

''تائی جان کی اجازت سے آیا ہوں میں امن اور......''

''آپ فی الفور یہاں سے چلے جائیں۔''

اس کی پوری بات سنے بغیر وہ دھاڑ اٹھی تھی۔

''امن......!'' اس نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ وہ پھر چیخی۔

''میں کہہ چکی ہوں مجھے آپ سے بات کرنے کی خواہش نہیں۔'' اب کہ اس کی آواز بھیگ چکی تھی۔ ارسل احمد نے ہونٹ بھینچ کر سر جھکا لیا۔

''ماضی میں جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ امن! اپنا فیصلہ واپس لے لو۔ میں شادی کروں گا تم سے......'' امن کا جھکا ہوا سر ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں اس پل کتنی وحشت تھی، ارسل دیکھ نہ پایا۔ وہ اٹھی تھی اور اس کے مقابل آن کر کھڑی ہوگئی۔ عجیب نظریں تھیں۔ غم آلود نمناک، زخمی، حسرت زدہ' ارسل کے اندر شرمندگی و شرمساری کا احساس گہرا ہونے لگا۔

''آپ رحم کھا سکتے ہیں مجھ پر۔ اس لیے کہ اب میں بھی قابلِ رحم ہوں۔ مگر ارسل احمد میں آپ کو بتانا ضرور چاہوں گی کہ...... مجھے آپ کی ہمدردی کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ چیخ کر بولی تھی۔ ارسل احمد کا وجیہہ چہرہ دھواں دھواں ہوتا چلا گیا۔ ہونٹ لرزے تھے۔

''یہ ہمدردی نہیں ہے امن! میں تم سے محبت......''

''آگے ایک لفظ نہیں بولیے گا ارسل احمد! محبت اس توہین و تذلیل کی ہرگز متحمل نہیں ہوسکتی۔'' آنسو قطرہ قطرہ اس کی شفاف آنکھوں سے بے اختیار گرنے چلے گئے تھے۔ ارسل کے

چہرے پر عجیب سی بے چارگی پھیل گئی۔

میں جانتا ہوں امن کہ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ بی کوز اک بار میں تم سے غلط بیانی کر چکا تھا۔ حالانکہ......'' اس سے بات مکمل نہیں ہوسکی اس کی آواز شدتِ جذبات سے گھٹنے لگی تھی۔

''حالانکہ اللہ گواہ ہے۔ میں تب بھی تم سے محبت کرتا تھا مگر اس وقت خود کو تمہارے قابل نہیں پاتا تھا۔ اور......''

''تو اب آپ کو لگتا ہے میں آپ کے قابل ہوگئی ہوں؟ اس لیے کہ میرا معیار اور اسٹینڈرڈ اب گر گیا ہے۔ میں ایسی اغواء شدہ لڑکی ہوں جس کی عزت مشکوک ہوچکی ہے۔ آپ اسے اپنا کر نیکی کمانا واہ واہ کرانا چاہتے ہیں۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔ زہر خند سے انداز میں بنا سوچے سمجھے بولتی گئی۔ ارسل کے چہرے پر دکھ اضمحلال اور کرب اتر تا محسوس نہیں کیا۔ یا کر بھی لیا تو اس پل اتنی بے حس یا پھر جذباتی اور دکھی ہو رہی تھی کہ اس کے احساسات و جذبات کو قطعی اہمیت نہیں دے رہی تھی۔

''نہیں...... میرے نزدیک تم اب بھی وہی ہو۔ جو پہلے تھیں امن! میرے اس اقدام کی وجہ کوئی اور نہیں تمہارا انتہائی فیصلہ ہے۔ تم خود کو اس شخص کے ساتھ منسوب کر کے اپنے آپ کو سزا دینا چاہتی ہوں امن! جو ہرگز تمہیں ڈیزرو نہیں کرتا۔ میں تمہاری زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کوئی کمی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ تمہیں ہر دکھ سے بچانے کا متمنی تھا۔ جبھی اس پل تمہیں رد کر دیا تھا مگر اب...... امن...... مجھے لگتا ہے تم مجھ سے شادی کر لو گی تو اس شخص سے بہتر شوہر ثابت ہوسکوں گا۔''

امن کھڑے سے ایک دم بیٹھ گئی۔ اس نے

اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اور زار وقطار رو پڑی تھی۔ عجیب لٹا پٹا سا انداز تھا۔ ارسل احمد اس کے اس انداز پر گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا۔

''میں اکثر اک خواب دیکھا کرتی تھی ارسل احمد! میں ایک وسیع چٹیل میدان میں کھڑی ہوں۔ جس میں ایک بہت گہرا گڑھا ہے۔ میں اسی گڑھے میں موجود ہوں۔ آپ کنارے پر کھڑے مجھے آواز دیتے ہیں۔ میں آپ کو دیکھ سکتی ہوں۔ مگر آپ تک پہنچ نہیں سکتی۔ حالانکہ میں آپ تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی۔

اس عجیب خواب کی کیا تعبیر ہوسکتی ہے۔ تب میرے لیے یہ تصور بھی محال تھا کہ آپ بھی خود بھی میرے طلب گار اور خواہش مند ہوسکتے ہیں۔ اتنی ہی شدت سے جو ٹھکرایا تھا مجھے۔ مگر آج وہ خواب حقیقت کا روپ دھار کر میرے سامنے ہے تو مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلا رہا ہے۔ دیکھیں...... میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ کچھ بھی اختیار میں نہیں رہا ہے۔ میں اتنی بے بس ہوں۔ جتنی خواب میں ہوا کرتی تھی۔ ارسل احمد میں معذرت خواہ ہوں۔ میں آپ کی آفر قبول نہیں کرسکتی۔ اس لیے کہ اب اس کا وقت گزر چکا ہے۔ مجھے معاف کردیجیے گا۔ اس لیے بھی...... کہ اب میں آپ کے قابل نہیں رہی ہوں۔'' وہ یونہی روتے ہوئے اٹھی تھی اور کمرے سے نکل گئی۔ ارسل احمد پتھرایا ہوا تھا جیسے۔

☆......☆......☆

اس وقت وہ لوگ مکہ مکرمہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہورہے تھے۔ اور لاریب کا دل نہیں کرتا تھا یہاں سے جانے کو...... بیت اللہ شریف کی سر بلند روشن و منور عمارت ان کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں دھندلاتی جارہی تھی۔ ہجر کا وقت ہر کسی پر کڑا تھا۔ سبھی اشکبار تھے۔ اور دل پھر سے یہاں لوٹ آنے کی دعاؤں سے لبریز ایسے میں عبدالغنی کی پُرسوز آواز میں مناجات جیسے براہ راست دل پر اثر انداز ہورہی تھی۔ انہیں دیکھتے عبدالعلی کو کبھی کی کہیں پڑھی ایک بات پوری جزئیات سے یاد آنے لگی۔

''محبت سے آشنا محبت کی روح سے آشنا محبت کے کرشموں سے آشنا محبت کے اعجاز سے آشنا لوگ ہر موسم اور ہر رت میں پیار کی بہار ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہر شے میں جلوس تلاش کرلیتے ہیں۔ ہر وجود میں محبوب حقیقی کو موجود پاتے ہیں۔ وہ آشنائے راز ہوتے ہیں۔ اور راز آشنا کرنا جانتے ہیں۔ اور ایسے لوگ دنیا کے سمندر میں سیپ کی طرح ہوتے ہیں۔ محض پوشیدہ یہاں آنے کے بعد عبدالغنی کی طبیعت ایکدم خراب رہنے لگی تھی۔ مگر وہ کوئی دوا لینے پر آمادہ نہیں تھے۔

''کیوں بابا جان......! طبیعت ٹھیک نہیں ہوگی تو مجھے ڈر ہے آپ کا کوئی ارکان نہ رہ جائے۔'' عبدالعلی نے محبت سے ٹوکا تھا۔ جواباً وہ کتنے اطمینان سے گویا ہوئے تھے۔

''جس مالک کے دربار میں حاضر ہوا ہوں عبدالعلی! شفا دینے والا بھی وہی ہے۔ تم مجھے وہاں سے پانی پلادو۔ میرا ایمان ہے میں اس پانی سے ہی شفایاب ہوجاؤں گا۔ کسی درخت پتہ توڑ کر کھالوں تو ہر درد تھم جائے گا۔ دوا دارو میں وقت برباد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے یار۔''

اور عبدالعلی کے ساتھ باقی سب نے بھی دیکھا تھا۔ ان کا رب پر یہ یقین یہ بھروسا بے جا نہیں تھا۔ بغیر دوا کے وہ اس یقین کے ساتھ رو

بصمت ہوئے تھے۔ اور تمام ارکان جس جوش و محبت سے وہ ادا کر رہے تھے۔ عبد العلی ان سے عمر میں آدھا ہو کر بھی ویسا استقلال ویسی ہمت اور جواں مردی کا مظاہرہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اک بات محبت کی بھی ہوتی ہے۔ وہ تو پھر عشق کی طرف گامزن لگتے تھے۔ اور عبد العلی جان پایا تھا سطح پر تیرنے والے کے حصے تو فقط جھاگ اور خس و خاشاک آتا ہے۔ جبکہ گہرائی میں اترنے والے کے حصے میں موتی...... زندگی کو سطحی طور پر برتنے والے کو بس روز مرہ کی زندگی کے خس و خاشاک سے ہی حصہ ملتا ہے۔ البتہ جو زندگی کی گہرائی میں اتر کر دیکھے تو حیات کا اصل حسن اس پر آشکار ہو جاتا ہے۔

روضۂ رسول ﷺ کے سامنے سبز گنبد کے دلکش نظاروں میں گم وہ ایک بار پھر زار و قطار روتے عشق کی بھیک کے طلب گار تھے۔ بلال حبشیؓ کے جیسا عشق ان کی خواہشات میں سے اک خواہش اک دعا تھی۔ عبد الغنی کے آنسو اسی تواتر سے گرتے تھے۔ ان کے برابر عبد الہادی تھے۔ اور ان دونوں کے دائیں بائیں لاریب اور علیزے اور عبیر...... ساتھ میں قدر تھی۔

''جس کے دل میں سجدے کی خواہش ہے۔
وہ شخص کبھی پریشان نہیں ہوتا۔''

عبیر کے ہونٹوں پر آسودگی سے لبریز مسکان بکھر گئی۔ دل الحمد للہ رب العالمین کی صدا سے وسیع ہونے لگا۔ یہ اللہ کی محبت تھی۔ اللہ کا کرم اللہ کی عطا...... کہ انہیں کہاں سے نکال کر کہاں لایا تھا۔ یہ عطا...... اللہ اللہ وہ خود کو اس قابل پاتی ہی نہ تھیں۔

''ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا ہے ممانی جان! ادھر آئیں۔'' قدر انہیں پکار رہی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر اسی سرشاری کی کیفیت میں اس جانب بڑھ گئیں۔

☆......☆......☆

رات گہری تھی اور تاریک بھی، اس کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے چاند جھانکتا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اور کروٹیں بدلتی تھی۔ بہت دن ہوئے نیند اب اس پر مہربان نہیں ہوتی تھی۔ آج تو مکمل طور پر خفا تھی جیسے......

''جب تک کوشش کی محرومیاں سمجھ میں نہ آئیں۔ نصیب کو سمجھا نہیں جا سکتا ہے مسٹر ارسل احمد چلے جائیں اس لیے بھی کہ محبت مصلحت اندیش نہیں ہوتی۔ اگر مصلحت اندیش ہو تو وہ پھر محبت نہیں ہوتی۔ اس وقت آپ نے کسی مصلحت کے تحت مجھے بے دردی سے ٹھکرا دیا تھا۔ مگر میں تو اب سراسر مجبور ہوں۔ آپ کے لیے تو کیا خود اپنے لیے کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں نے جان لیا ہے۔ جو نصیب میں نہ ہو اسے چھینا نہیں جا سکتا۔

ہاں صبر کیا جا سکتا ہے۔ میں بھی صبر کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اس لیے کہ...... میں نے اچھے وقت سے زیادہ اچھے انسان کو عزیز نہیں رکھا۔ آپ اچھے ہیں ارسل احمد! آپ اچھا وقت پیدا کر سکتے ہیں مگر اچھا وقت اچھا انسان پیدا نہیں کر سکتا۔ میں نے امید کو مٹھی میں قید کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر حالات کڑے ہیں تو میں اپنی ذمہ داری سے کیوں منہ موڑوں...... میں ایسا نہیں کروں گی۔''

اس نے آج آخری بار ارسل کو مکمل طور پر مایوس کر دیا تھا۔ کتنا ہرٹ ہوا تھا۔ وہ اس کا قطعی فیصلہ سن کر اسے بے حس بنا دیکھ کر۔ اس نے اس کی آنکھوں میں امید کو مرتے دیکھا تھا۔ جس کی

آنکھوں میں زندگی کی رمق پیدا کرنا اس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اس نے اسی کو اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کر ڈالا تھا۔ اور یہ اذیت ہی سب سے بڑی اذیت تھی۔ یہ دکھ بہت جان لیوا تھا۔

کھڑکی کے پاس سے کوئی سایہ سا گزرا۔ وہ دکھ کی گہرائیوں میں نہ اتری ہوتی تو لازماً چونکتی۔ راہداری میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ اسے اب ہی الرٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ بے خبر تھی۔ بے خبر رہی۔ یہاں تک کہ تاریکی اور سناٹے میں لاک کھلنے کی ہلکی سی کلک ابھری تھی اگلے لمحے دروازہ دھکیل دیا گیا۔ ہلکی سی چرر کی دروازہ وا ہونے کی مخصوص آواز ابھری پھر کوئی لمبا تڑنگا سایہ اپنے پیچھے دروازہ لاک کرتا ہوا بہت عجلت میں بیڈ پر کودا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب امن کی غفلت ایک جھٹکے سے ٹوٹ کر بکھری اور مارے خوف و دہشت کے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اُس کا گلا دبانے والے نے اس کے منہ پر اپنا سناک ہاتھ جما کر بے دردی سے گھونٹ دیا تھا۔

''خاموش...... بالکل چپ...... آواز نہیں نکالنا۔ ورنہ گلا گھونٹنے سے ہرگز گریز نہیں برتوں گا۔ سمجھیں......'' ایک ہاتھ سے اس کے بال مٹھی میں جکڑتا ہوا دوسرے سے اس کا منہ زور سے دبائے ہوئے تھا۔ امن کا تڑپتا پھڑپھڑاتا ہوا وجود جیسے سکتے میں آ گیا۔ دائم کی سرد و سناک آواز پہچان کر ہی وہ آن کی آن میں سناٹوں میں گھرتی چلی گئی تھی۔ دل گویا خوف کی سرد پناہوں میں اُتر کر دھڑکنا بھول بیٹھا۔

تعجب

بے یقین

صدمہ

کیا کچھ نہ تھا اس کے چہرے پر

''کیا کہا تھا تم سے......؟ اثر کیوں نہیں ہوتا تمہیں...... کیا سمجھتی ہو کہ اپنے باپ کے گھر پر ہو تو بچ جاؤ گی مجھ سے......؟ بتاؤں تمہارے باپ اور بھائی کو کہ اس وقت تمہارے بیڈ روم میں تمہارے ساتھ ہوں میں......''

''کیا کر لیں گے وہ سورما......'' وہ پھنکار رہا تھا۔ دھمکی دے رہا تھا۔ امن تھرا کر رہ گئی۔ زور سے پھڑپھڑائی۔

''پلیز......!'' وہ گھگھیانے لگی۔

میرا ہرگز وہ مقصد نہیں تھا جو تم سمجھے۔'' وہ جیسے سسکی اور صفائی پیش کی۔ دائم نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ ان کر دیا۔ امن اسے خود سے قریب تر پاتی دل کو خون ہوتا محسوس کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ہراس بھی تھا۔ وحشت بھی آنسو بھی......

''مم...... میں تمہارے حق میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ گھر والوں کو بھی قائل کر لوں گی۔''

وہ منمنائی۔ دوسرے لفظوں میں اسے قائل کر کے وہاں سے دفعان کرنا چاہا۔ دائم نے مدھم روشنی میں اس کے سحر آفریں چہرے کے ملکوتی نقوش سے سجے چہرے کو سیاہ ریشمی بالوں کے حصار میں گھرے دیکھا۔ غور سے جی بھر کے دیکھا اور لوفرانہ انداز میں اسے آنکھ مار کر مسکرانے لگا۔

بڑی عجیب تھی یہ مسکان بھی......

''گڈ۔ اب تم مجھے ہی بس اپنا گھر والا بنالو اور سمجھو تو بہتر ہے تمہارے لیے۔ ویسے کیا خیال ہے میں تم سے صرف یہی کہنے آیا تھا بس...... ارے بھئی شادی شدہ ہو اب تم...... اک بار میرے پاس میری قربتوں میں بھی آ چکی ہو، اور......''

مخمور آواز میں کہتا وہ اس پر جھکا تو امن ایک جھٹکے سے اسے پیچھے دھکیلتی سرعت سے فاصلے پر

ہوئی۔

''یہاں سے جاؤ......'' بستر سے اتر کر وہ اسے گھورتے ہوئے پھنکاری۔ دائم نے بجائے برا ماننے کے گویا حظ لیا اور خود کو سنبھال کر اسے اندر تک اترتی نظروں سے دیکھا۔

''ایسے کیسے چلا جاؤں؟ میں نے کہا تو تھا کہ تم بہت خاص ہو، بہت ہی پیاری بھی ہو۔ یہ سارا انتقام کا ہی تو معاملہ نہیں۔''

ایک آنکھ دبا کر خباثت سے کہتا امن کو وہ بالکل شیطان لگا۔ اسے اس سے کچھ اور گھن بھی محسوس ہوئی تھی۔

''اگر تم شرافت سے نہ گئے تو میں شور مچادوں گی۔ بہر حال اپنی عزت تو پیاری ہوگی تمہیں۔''

اس کا بھینچا ہوا سرد لہجہ نفرت و حقارت سے لبریز تھا۔ اب کے دائم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بلکہ بستر سے اتر کر اس کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے گھورتا رہا۔ پھر اچانک اسے اپنے بازو کے حصار میں ایسے جکڑا کہ اس کی سانسیں بھی تھم کر رہ گئیں۔ اسے لگا وہ جتنا بھی پھڑ پھڑائے خود کو ہرگز نہیں چھڑا سکے گی۔

''مچاؤ شور...... میں بھی چاہتا ہوں برادران لاء اینڈ فادران لاء سے یہیں اسی پوزیشن میں ملاقات ہو جائے، ہمارے کپل کو سراہیں گے ناں وہ لازمی......'' اس کا لہجہ اس کے الفاظ کے بالکل برعکس تھا۔ سفاک، ترش، حقارت سے لبریز، امن جو پہلے ہی بے بسی بے کسی کے عالم میں تھی۔ بالکل حواس باختہ رہ گئی۔ آنکھیں خوف کی شدت سے جیسے پھٹ سی گئیں۔ معا خود کو بامشکل بولنے کے قابل کرتی بے اختیار سسک اٹھی۔

''پلیز...... خدارا ایسا مت کرو۔ چلے جاؤ۔ میں خود بات کروں گی ناں...... مناؤں گی سب کو...... کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم اس گھر میں پورے وقار کے ساتھ سر اٹھا کے آؤ۔ اپنے مرتبے کے مطابق عزت و احترام سمیت...... میری بات کو سمجھو۔ پلیز۔''

باقاعدہ منت پر اترتی وہ اب ساتھ رو بھی رہی تھی۔ اور گویا پہلے سے بڑھ کر حسین قیامت خیز لگنے لگی۔ دائم کا غصہ اور نفرت اسی حسن کی آگ میں جل کر خاکستر ہوئے وہ اُسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

''کتنی حسین ہو تم توبہ...... مجھے لگتا ہے بھاگ جاگ اٹھے ہیں میرے اس بدلے و انتقام کے چکر میں...... عیاشی کی عیاشی، بدلے کا بدلہ......''

وہ دانت نکال رہا تھا۔ امن کا سرخ چہرہ زرد پڑتا چلا گیا۔ وہ صحیح معنوں میں اسے کوئی عفریت محسوس ہوا۔ خون چوسنے والی بلا، جس سے بس خوف آتا ہے وحشت محسوس ہوتی ہے۔

گھن آتی ہے۔

اسے بھی اس پل گھن آرہی تھی۔

نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

مگر وہ پھر بھی اس کی منت پر مجبور تھی۔ واپس بھیجنے پر اصرار کرتی تھی۔ جبکہ دائم ضد پر اٹکا تھا۔ اپنا مقصد حاصل کیے بنا جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ امن کی منتیں اس کی سسکیاں اور التجائیں بھی، کچھ بھی اس بے رحم ظالم اور سفاک بے غیرت بے حس انسان کے راستے میں رکاوٹ کھڑی نہیں کر پائیں۔ وہ اگر پہلے مقام پر جیتا تھا تو اب کیسے ہار جاتا۔ امن اگر پہلے ہار چکی تھی تو اب جیتنا تو اور بھی دشوار تھا۔ اب تو شاید اسے عمر بھر ہارنا تھا۔ جیت کو ترستے ہوئے اس کی آنکھیں ہر لمحہ سمندر بنتی جا رہی تھیں۔

(لفظ لفظ مہکتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہ مئی میں ملاحظہ فرمائیے)

افسانہ

نزہت جبیں ضیاء

میرے درد کی جو دوا ملے

''بیٹا تمہارا اس وقت انکار کر دینا کس قدر غلط ثابت ہوگا تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے سارے خاندان میں، رشتے داروں میں جاننے والوں میں یہ بات پھیل چکی ہے کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے اور اب اس موقع پر ایسا ہو جائے اور صرف حسام......

لفظ ''محبت'' ایک چھوٹا سا چار حرفی لفظ اپنے اندر کتنی وسعتیں رکھتا ہے، محبت جان لیتی بھی اور جان دیتی بھی ہے۔ کتنے فساد پھیلاتی ہے...... دلوں میں کرب و نارسائی کے دکھ دیتی ہے۔ رگ رگ میں اُتر کر انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔

''تڑپاتی ہے...... ستاتی ہے اور...... اور...... انسان اگر محبت کے اس دلدل میں پھنس جائے تو لاکھ کوششیں اور جتن کرنے کے بعد بھی اس سے نکل نہیں پاتا...... دن، مہینے اور سال گزر جانے کے باوجود بھی...... کبھی کبھی...... ایسا بھی ہوتا ہے جیسا کہ وامق کے ساتھ ہوا تھا۔

انسان اپنی پہلی ''محبت'' کبھی نہیں بھول سکتا۔ اسے آج اس بات کا ادراک ہوا تھا جب شام کو اس نے شاپنگ مال میں چھ سال بعد سجل کو اپنے روبرو دیکھا تھا۔ نادان دل مچل اٹھا تھا۔ دل میں آج بھی سجل موجود تھی تب ہی اسے دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

اُسے لگا تھا کہ جیسے سجل کے دل میں بھی اس کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود ہے۔ تب ہی تو ہمت کر کے وامق نے اپنا سیل نمبر اس کی جانب پھینکا تھا۔ گو کہ سجل نے نمبر اگنور کر دیا تھا مگر...... مگر...... پھر بھی وامق کو ہلکی سی آس ایک اُمید ضرور تھی اور اسی امید اور آس کو لے کر وہ رات کے تین بجے تک جاگ رہا تھا۔

دوسری جانب سجل کو بھی آج نیند نہیں آ رہی تھی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کے دل میں وامق کے لیے محبت جاگ گئی تھی یا وامق کے لیے اُس کے دل میں کہیں کوئی نرم گوشہ تھا بلکہ وہ آج وامق کو دیکھ کر اس کے ذہن میں گزشتہ سال کے بیتے ہوئے اچھے برے دنوں کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ وامق کو دیکھ کر وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھونے لگی تھی۔ آج وہ مطمئن تھی۔ سجل نے پلٹ کر بیڈ پر سوئے ہوئے تیمور کی جانب دیکھا۔

پُرسکون نیند میں اپنے چہرے کی معصومیت اور اطمینان کے ساتھ وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ تیمور حسن جواب اس کی جان تھا جسے سجل دل و جان

سے چاہتی تھی اپنے ماضی کو قطعاً بھلا کر سجل نے تیمور حسن کو سرتھ اپنایا تھا اور بدلے میں اُسے تیمور حسن کی بھرپور محبت، چاہت اور اعتماد ملا تھا۔

''اعتماد'' جو اس کی زندگی کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا گزشتہ چھ سالوں میں تیمور حسن کی بھرپور محبت کے ساتھ اس کی گود میں پنکی اور سونو بھی آگئے تھے۔ جس سے اس کی زندگی مزید مطمئن آسودہ اور خوش حال ہوگئی تھی۔ سجل اپنے ماضی کو دفن کر کے تیمور حسن کے گھر آئی تھی۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو چکی تھی لیکن...... آج...... آج...... اچانک سے ہی وامق کی انٹری نے اس کی پُرسکون سمندر جیسی زندگی میں پتھر پھینک کر بے شمار دائرے بنا دیے تھے۔ اور...... اور...... سجل انہی دائروں میں گم ہوتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

وہ ابھی ابھی کالج سے تھکی ہاری لوٹ کر آئی تھی اور اب چینج کر کے منہ دھو کر کھانا کھانے بیٹھی تھی کہ وامق کی کال آگئی۔

''ہیلو......! یہ تم بائیک پر کس کے ساتھ گھوم رہی تھیں؟'' نہ سلام نہ دعا چھوٹتے ہی قدرے چبھتے لہجے میں سوال کیا۔

''گھوم رہی تھی مطلب؟ میں گھر آ رہی تھی کالج سے۔ اور وہ...... وہ...... نبیہ آپی کا دیور ہے صرف سولہ سال کا بچہ۔ میں...... اُسے ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔'' اس کی بات پر سجل نے تپ کر وضاحت دی۔

''سولہ سال کا ہو یا چھبیس سال کا مجھے اس طرح سے تفریحات کرنا بالکل پسند نہیں۔'' وامق

کا لہجہ بدستور ویسا ہی تھا۔

''گھومنا، تفریح...... وامق یہ سب کیا بکواس ہے؟ پتا ہے تمہیں کہ میں کالج سے آرہی تھی اور میں کوئی ننھی بچی نہیں ہوں وہ مجھ سے پورے چھ سال چھوٹا ہے آپی کہتا ہے مجھے......''

''اوکے...... اوکے......'' تجل کو غصے میں دیکھ کر وامق نے فوراً اپنے لہجے کو بدل لیا۔

''آئی ایم سوری بٹ کیا کروں یار تم سے پیار جو کرتا ہوں۔'' ہمیشہ کی طرح آخر میں وہی جملہ کہا جس سے تجل کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔

وامق اور تجل کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ وامق اچھی فیملی سے تعلق رکھتا تھا جبکہ تجل کے والد نہیں تھے ایک بڑا بھائی حسام، ایک شادی شدہ بہن نبیہ اور امی (شاہدہ بیگم) کے ساتھ رہتی تھی۔ حسام جاب کے سلسلے میں امریکہ میں رہتا تھا وامق اور تجل ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اس لیے ان لوگوں کا رشتہ طے کر دیا گیا تھا۔

اور تعلیم مکمل ہوتے ہی شادی کا پلان تھا تب تک حسام کے لیے بھی لڑکی پسند کر لی گئی تھی۔ شاہدہ بیگم کا خیال تھا کہ تجل اور حسام کی شادی ساتھ ساتھ کر دیں تاکہ تجل گھر سے جائے تو بہو آجائے۔

تجل فطرتاً نرم مزاج، صلح پسند لڑکی تھی جبکہ منگنی کے بعد وامق تجل کے معاملے میں بہت شدت پسند ہو گیا تھا۔ تجل کو وہ اپنی ملکیت سمجھنے لگا تھا۔ تجل کی نرم مزاجی نے اُسے مزید شیر بنا دیا تھا۔ تجل کا خیال تھا کہ جب اسے ساری زندگی وامق کے ساتھ ہی گزارنی ہے تو اس کی پسند اور منشا کے مطابق ہی گزاروں اور اس کی اسی عادت نے وامق کو بگاڑ دیا تھا۔ وامق ابھی سے مکمل طور پر تجل پر اپنا حق جتانے لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایشو بنا کر جھنجلا جاتا۔ اور اگر کبھی تجل کسی بات کا برا مناتی تو وہ بھی وامق سے برداشت نہ ہوتا فوراً تجل کو منا لیتا اور اپنی محبت کا یقین دلاتا کہ تم سے اتنی محبت جو کرتا ہوں اس لیے چھوٹی بات بھی برداشت نہیں کر پایا۔ تجل جھٹ سے مان جاتی۔ تجل کو پتا تھا کہ وامق کو یہ بات بھی پسند نہیں کہ تجل کسی خاندان کے لڑکے سے بھی زیادہ بات چیت کرے، یا تعلق رکھے۔ حسام نے اپنے آنے کا کنفرم کیا تو شاہدہ بیگم نے حسام اور تجل کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

روز ہی وامق کی کال آجاتی کبھی کوئی بات...... کبھی کوئی آرڈر اور کبھی کوئی فرمائش۔

''کیا تم نے جہیز کے سوٹس کی شاپنگ اسٹارٹ کر دی؟'' وامق نے کال پر بات کرتے کرتے اچانک سے پوچھا تھا۔

''ہاں! آج چار سوٹس لائی ہوں۔'' تجل نے بتایا۔

''اچھا سنو! یاد رکھنا کہ کپڑوں کے کلرز ہلکے ہونے چاہیں تیز اور چبھتے ہوئے برائٹ کلرز مجھے پسند نہیں ہیں۔'' وامق نے کہا تھا۔ تجل زور سے ہنس دی۔

''تو مجھے کون سا پسند ہیں بے فکر رہو سارے کلرز ہی سوفٹ اور لائٹ ہوں گے۔''

''گڈ......!'' وہ جواباً بولا تھا۔

روزانہ ہی کال پر کوئی نہ کوئی بات کہتا۔ ''بیڈ شیٹس کا کلر ہلکا ہو ڈارک کلرز پر مچھر آتے ہیں اور مجھے مچھروں سے الرجی ہے۔''

''ہائی ہیلز مت لینا ویسے ہی تمہارا قد اچھا ہے ایسا نہ ہو کہ مجھ سے بڑی لگو، میک اپ سوفٹ ہونا چاہیے۔''

''مایوں اور مہندی میں زیادہ شور شرابہ اور ہلا

گلہ نہیں ہونا چاہیے مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' غرض یہ کہ اِدھر شادی کی بات شروع ہوئی اُدھر روزانہ وامق کی ہدایات کی لسٹیں جاری ہونے لگیں۔

سجل ہر بات پر ''اوکے'' ''ٹھیک ہے'' ''تمہاری مرضی'' بس یہی کہتی۔

اس روز بھی سجل وامق سے بات کر رہی تھی اور وامق اُسے کچھ کہہ رہا تھا کہ نبیہ کمرے میں آ گئی۔

''اوکے ٹھیک ہے۔'' کہہ کر سجل نے کال بند کی۔

''کس کی کال تھی؟'' نبیہ نے پوچھا۔

''وامق سے بات ہو رہی تھی آپی اس کا خیال ہے کہ میک اپ کے لیے فلاں پارلر ٹھیک رہے گا۔'' سجل نے کہا۔

''سجل تمہیں نہیں لگتا کہ وامق کا ابھی سے تمہارے معاملے میں اتنا انوالو ہونا غیر ضروری ہے۔'' نبیہ نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

''جی آپی! مگر وامق مجھے بہت چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کی پسند کے مطابق نظر آؤں۔'' سجل نے کہا۔

''ہاں مگر اس حد تک انوالو ہونا تو شدت پسندی کی علامت ہے گڑیا۔'' نبیہ سجل کے لیے پریشان تھی۔

''آپی جی آپ بالکل فکر مت کریں شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔'' دراصل وہ گھر میں سب سے چھوٹا ہے تو اس کی نیچر میں بھی بچوں جیسی ضد اور توجہ حاصل کرنے کا عنصر ہے اور کچھ نہیں، دیکھنا کہ شادی کے بعد وہ بدل جائے گا۔ اس کو میں سنبھال لوں گی آپی اور دیکھیے گا کہ وہ مجھے کتنا خوش رکھے گا۔''

''انشاء اللہ اللہ پاک میری بہن کو بہت ساری خوشیاں دے۔'' نبیہ نے سجل کو گلے سے لگا کر دعا دی۔

''افوہ! دیکھو نبیہ نے سر پر ہاتھ مارا میں کس کام کے لیے آئی تھی اور کن باتوں میں لگ گئی امی نے کہا ہے کہ تم جا کر زیور کا ڈیزائن پسند کر لو۔'' نبیہ نے کہا تو سجل مسکرا کر اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔ سجل بذاتِ خود بھی وامق کو دل و جان سے چاہتی تھی اس سے دوری یا اس کی ناراضگی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے وہ خود بھی محتاط رہتی کہ کوئی حرکت یا کوئی بات پر وامق ناراض نہ ہو جائے۔

گھر میں شادی کی خوش گوار چہل پہل تھی۔ حسام نے آنے کی تاریخ بتا دی تھی اور سب بے چینی سے منتظر تھے۔ اس روز نبیہ کے بیٹے کو بخار تھا، شاہدہ بیگم کو لے کر وہ ہاسپٹل جا رہی تھی کہ حسام کی کال آ گئی کہ وہ ایئرپورٹ پر ہے اور اسے ٹکٹ تین دن پہلے کا مل گیا ہے۔ حالانکہ حسام نے منع کر دیا تھا مگر سجل نے ضد کی وہ ایئرپورٹ جا کر حسام کو لے کر آئے گی وہ ٹیکسی لے کر ایئرپورٹ پہنچ گئی حسام پورے چار سال بعد آیا تھا۔

وامق نے حسام کو تصویروں میں دیکھا تھا اور حسام نے بھی حسام کو وامق سے ملنے کی بہت جلدی تھی۔

''یہ بتاؤ تمہارے ہونے والے کیسے ہیں؟'' حسام نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی پوچھا۔

''بہت اچھے!'' سجل اترائی۔

''اچھے ہی ہوں گے تب ہی تو میری گڑیا کو پسند آئے۔'' حسام نے آنکھوں میں محبت بسائے پیار سے سجل کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا اور سجل

مسکرادی، عین اسی لمحے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے حسام اور سجل کو کسی کی تیز نظروں نے بغور دیکھ لیا تھا۔

شاہدہ بیگم اور نیہا بھی حسام کے اچانک سے آ جانے پر بہت خوش تھے۔ حسام کو بھی اتنے عرصے بعد ماں اور بہنوں کے ساتھ مل کر بیٹھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''پہلے اپنے اُن کو بلوا کر ملوا دو ناں گڑیا۔'' کچھ دیر بعد حسام نے سجل کو دیکھ کر شرارت سے کہا تو سجل مسکراتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب چل دی تاکہ وامق کو کال کر کے حسام کے آنے کی اطلاع دے دے۔

وہ وامق کو کال ملا رہی تھی کہ اسی وقت وامق کی کال آ گئی۔

''اوہو!'' وہ اسکرین دیکھ کر مسکرائی۔

''کہتے ہیں ناں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے تب ہی اس نے خود ہی کال کر لی۔'' سوچتے ہوئے گنگناتے ہوئے کال ریسو کی۔

''ہیلو وامق! بہت بڑی عمر ہے تمہاری میں تمہیں کال کرنے ہی والی تھی۔'' سجل نے خوش گوار لہجے میں بات کی ابتداء کی۔

''کیوں بھئی! مجھے یاد کرنے کی فرصت مل گئی تم کو......؟ فارغ ہو گئیں اپنی تفریحات اور انجوائے منٹ سے؟'' دوسری جانب سے وامق نے چبھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب......؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' سجل وامق کے طنز کو نہ سمجھ پائی۔

''مطلب یہ کہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے تمہیں ٹیکسی میں کسی لڑکے کے ساتھ اس طرح اور ایسی حالت میں دیکھا کہ جس طرح کوئی بوائے فرینڈ کے ساتھ......''

''شٹ اپ وامق! یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم......؟'' وامق کے جملے کو درمیان سے کاٹ کر سجل نے غصے سے چلائی۔

''ہاں...... ہاں...... بکواس...... بکواس...... میں کر رہا ہوں اور...... اور...... جو تم کر رہی ہو سرعام...... اس بات کا بھی خیال نہیں کہ ہماری شادی ہونے والی ہے۔ شرم...... شرم آنی چاہیے تم کو۔'' وامق نے زہر خند لہجے میں چلا کر کہا۔

''شرم...... شرم تو تم کو آنی چاہیے وامق! کتنی گھٹیا اور بیچ بات کی تم نے......؟ تم کو رشتوں کے تقدس کا بھی پاس نہیں، اتنی چھوٹی اور گری ہوئی بات کرنے سے پہلے صحیح اور غلط کا اندازہ تو کر لیتے۔ اپنی بکواس کرنے سے پہلے ایک بار سوچ تو لیتے۔'' سجل کی برداشت ختم ہونے لگی تھی۔

''تم بتاؤ مجھے کیا صحیح ہے؟ کیا غلط؟'' وامق کا لہجہ کچھ دھیما ہوا تھا۔

''نہیں وامق! تم......تم اس قابل نہیں ہو کہ میں اب تمہارے سامنے کوئی صفائی پیش کروں۔ تم شک کی ان منزلوں پر پہنچ چکے ہو کہ تمہیں صحیح غلط کا اندازہ کروانا کسی کے بس کی بات نہیں...... تم شک کے گہرے دلدل میں دھنستے چلے جا رہے ہو وامق...... میں نے ہر ممکن تمہارا ساتھ دیا۔ تمہاری چھوٹی چھوٹی بات کو مانا، تمہاری مرضی کے آگے اپنی پسند، اپنی مرضی اور اپنی خواہشات سب قربان کر ڈالا۔ اپنے خاندان کے چھوٹے لڑکوں سے بھی بات کرنا چھوڑ دیا۔

اتنے عرصے میرے ساتھ رہتے ہوئے میری نیچر جانتے ہوئے بھی...... آج بھی تم......اج بھی تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔ اب بھی تمہارے دل میں مجھے لے کر میرے کردار کو لے کر شک کے

ناگ پھن پھیلائے کھڑے ہیں۔ تم شک کی دلدل میں اس طرح سے دھنستے چلے جارہے ہو کہ تمہارا اس سے نکلنا ممکن نہیں۔ اور...... اور اب بات حد سے بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اس لیے میں ساری زندگی کے عذاب سے ایک بار ہی چھٹکارا پانے کے لیے تم سے اپنا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم کررہی ہوں۔ آج کے بعد میرا اور تمہارا نہ واسطہ ہے نہ رشتہ۔'' بات ختم کر کے سجل نے کال بند کردی۔

اسی وقت نبیہ بھی کمرے میں آئی تھی۔

''کیا...... کیا ہوا؟'' نبیہ اس کے زرد چہرے اور آنسو بھری آنکھیں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''آپی...... آپی...... آپ نے سچ کہا تھا کہ وامق کی شدت پسندی میرے لیے اب برداشت سے باہر ہوگئی تھی۔

''اور...... اور...... میں نے شادی سے انکار کردیا ہے۔'' سجل نے کہا اور نبیہ کے گلے لگ کر بری طرح رونے لگی۔

''ارے ارے گڑیا! ایسا کیا ہوا؟ کیا کہا اب اس نے......؟'' نبیہ نے پریشان ہوکر اس سے کئی سوال کر ڈالے۔ تب اس نے ساری بات بتادی۔

''پاگل ہوگئی کیا؟'' اس وقت شادی سے انکار کیسے کرسکتی ہو؟ نبیہ نے پریشان ہوکر کہا۔ شاہدہ بیگم اور حسام بھی آگئے تھے۔ وہ لوگ بھی سجل کے فیصلے سے پریشان تھے۔

''بیٹا تمہارا اس وقت انکار کردینا کس قدر غلط ثابت ہوگا تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے سارے خاندان میں، رشتے داروں میں جاننے والوں میں یہ بات پھیل چکی ہے کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے اور اب اس موقع پر ایسا ہوجائے اور صرف حسام کی شادی ہو تو لوگ کتنی باتیں بنائیں گے تمہیں اندازہ ہے اس بات کا......؟'' شاہدہ بیگم نے سجل کو سمجھایا حسام بھی اس صورتِ حال سے پریشان تھا۔

لیکن سجل اپنے فیصلے پر قائم تھی یوں اچانک سے اتنا بڑا فیصلہ لے لینا آسان بات نہ تھی اور وہ بھی جبکہ سجل وامق سے بہت محبت کرتی تھی لیکن نبیہ کو اصل حقیقت کا علم تھا اس نے معاملہ سنبھال لیا۔

وہ سجل کے ساتھ تھی اس طرح سے یہ بات جلد ہی پھیل گئی کہ سجل اور وامق کا رشتہ ختم ہوگیا ہے۔ کسی نے وجہ جاننے کی کوشش کی تو کسی نے سن کر صرف افسوس کیا اور کوئی تو ایسا بھی تھا جس کو اس خبر سے خوشی ہوئی تھی۔

اور وہ تھا 'تیمور حسن' حسام کے ہونے والے سالے کا دوست جس کو پہلے دن پہلی نظر میں ہی یہ معصوم، سیدھی سادی اور کومل سی لڑکی سجل بہت اچھی لگی تھی لیکن بعد میں جب اسے یہ پتا چلا کہ سجل کی شادی طے ہوچکی ہے تو اسے دکھ ہوا تھا۔ اور شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ سجل کو تیمور حسن کی دلہن بن کر اس کے گھر آنا تھا۔

تیمور شہر کا جانا مانا وکیل تھا۔ اکیلا تھا ماں باپ کا انتقال ہوچکا تھا اور وہ اپنے بڑے سے گھر میں تنہا رہتا تھا۔ صورت شکل کے ساتھ، خوش اخلاق، سعادت مند اور صاحبِ حیثیت بھی تھا یوں سجل کے لیے تیمور کا رشتہ آیا تو فوراً ہی قبول کرلیا گیا اور شادی کی وہی تاریخ پر جو کہ پہلے سے طے تھی سجل کی تیمور سے شادی طے پاگئی۔

سجل کو سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہی نہ تھی وامق نہیں تو کوئی بھی ہو اسے کوئی غرض نہ تھی اس کے روم روم میں تو وامق بسا ہوا تھا۔ جسے سجل نے

ٹوٹ کر چاہا تھا۔ جس کی ہر بات کو حدیث سمجھ کر مانا تھا، جس کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دی تھی۔ جس کی خوشی کے لیے اپنی خوشی، اپنی مرضی، سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہو اتھا۔ اس کے دل سے، اس کے ذہن سے وہ شک اور بے اعتمادی کا کیڑا نہ نکال سکی تھی۔

لیکن اب سجل وہ سب کچھ بالکل بھول کر ساری یادیں، ساری باتیں، اپنا ماضی اور اس سے جڑی تلخ یادیں میکے کی دہلیز پر چھوڑ کر سچے دل اور پوری محبت کے ساتھ تیمور کا ساتھ نبھانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے دل میں کہیں ایک خوف چھپا تھا۔ ایک اندیشہ اور وہم تھا کہ کہیں تیمور حسن بھی وامق جیسے نہ ہو کہیں وامق اور میرے رشتے کو لے کر مجھے طنز کا نشانہ نہ بنا ئیں؟ کہیں میرے کردار کو کیچڑ نہ اچھالیں؟ ڈھیر سارے خدشات لے کر وہ رخصت ہو کر تیمور حسن کے ساتھ ان کے عالیشان گھر میں آ گئی۔

لیکن تیمور حسن سے بات کر کے اس کے سارے خدشات پل بھر میں اڑ گئے۔ سنجیدہ، سوبر اور گریس فل شخصیت کے مالک تیمور حسن نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پہلے اس کی خوبصورتی کی تعریف کی اور پھر ٹھہرے دھیمے لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

''سجل میاں اور بیوی ان کا آپس میں رشتہ دوست جیسا ہوتا ہے ایک دوسرے پر بھروسا اور اعتماد کرنے کا جب تک دونوں مل کر ایک دوسرے کو اعتماد میں نہ لے لیں، ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہو کر ان میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش نہ کریں تب تک رشتوں میں پائیداری اور پختگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ جو بھی ہوا اور مجھے سخت حیرانی ہے کہ کیا کوئی شخص اس حد تک بھی شدت پسند ہوسکتا ہے۔

بہرحال گزشتہ ساری تلخیوں کو بھلا کر ہم لوگ اپنی خوشگوار زندگی کی ابتداء کریں گے میں اور تم پہلے 'دوست' اور پھر 'میاں بیوی' ہیں۔

تم میری عزت ہو اور میں کبھی بھی کسی مقام پر بھی تم کو ہرٹ نہیں کروں گا۔'' سجل خاموشی سے تیمور حسن کی باتیں سن رہی تھی اس کے دل میں، ڈھیروں سکون اتر آیا تھا۔ تیمور حسن کتنے عظیم انسان ہیں۔ ان نے نگاہ اٹھا کر تیمور حسن کی جانب دیکھا۔

''تیمور میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ جیسا عظیم انسان کا ساتھ نصیب ہوا ہے۔ اگر خدا کے بعد سجدہ فرض ہوتا تو یقیناً آپ جیسے مجازی خدا کے لیے ہی ہوتا۔''

سجل کی خوب صورت بات پر تیمور حسن نے آگے بڑھ کر سجل کو سینے سے لگالیا اور سجل کو ڈھیروں سکون مل گیا۔

واقعی تیمور حسن نے سجل کا اس طرح سے خیال رکھا جیسے سجل کانچ کا نازک کھلونا ہو ذرا سے دھکے سے چُور چُور ہو جائے گا۔

سجل تیمور کا ساتھ پا کر خود کو دنیا کی خوش نصیب لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ اُس نے بھی خود کو مکمل طور پر تیمور اور اس کے گھر کے لیے وقف کر دیا تھا۔

بہت خوش گوار دن گزر رہے تھے۔ شاہدہ بیگم اور حسام بھی سجل کو اتنا خوش اور مطمئن دیکھ کر پُرسکون ہو گئے تھے اور اس بار حسام انتظام سے آیا تھا وہ اپنی دلہن اور اماں کو ساتھ لے کر جانے والا تھا۔ نبیہ تو اپنے سسرال میں خوش تھی اور سجل بھی...... یہ بات ان لوگوں کے لیے پریشانی کا

باعث نہ تھی کہ بیٹیاں جانے کس حال میں رہیں گی۔

جب سے وامق سے رابطہ توڑا تھا اس کے بعد سے اس کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ ایسے ہی کبھی کبھی کوئی افسانہ پڑھتے یا ڈرامہ دیکھتے کبھی کبھی وامق کا ہیولہ سانظروں کے آگے آجاتا تو سجل سر جھٹک دیتی۔ اس طرح وقت گزرتا رہا گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی گود میں پہلے پنکی اور پھر سونو آگئے۔ یوں اللہ کے فضل سے اُن کی فیملی مکمل ہوگئی تھی۔ آسودہ اور خوشحال فیملی جہاں صرف محبتیں، پیار، امن اور بھروسے کا دور دورہ تھا۔

تیمور ہر بات سجل سے شیئر کرتا۔ اپنے پاس آنے والے کیسز کے بارے میں سجل کو بتاتا اور سجل بھی بڑی دلچسپی سے روز روز، نئے نئے واقعات سنتی کبھی کبھار مشورے بھی دیتی، تیمور کیوں کہ خود مصروف رہتا تو ایک گاڑی معہ ڈرائیور کے سجل کے لیے رکھی تھی۔ سجل کو بچوں کے اسکول جانا ہو یا شاپنگ کرنے سجل بچوں کو لے کر چلی جاتی۔ کبھی کبھار بچوں کو لے کر پارک بھی چلی جاتی۔

اس روز بھی پنکی کے اسکول میں کلر ڈے منایا جارہا تھا تو پنکی نے ضد کی کہ نئے کپڑے چاہیے تو سجل دونوں بچوں کو لے کر شاپنگ مال آ گئی۔ مطلوبہ چیزیں لے کر باہر نکلی تو بچوں نے پلے لینڈ میں جانے کی ضد کی بچوں کو پلے لینڈ میں چھوڑ کر سجل باہر کی طرف آگئی۔ یونہی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ دفعتاً نگاہ سامنے کی طرف اٹھی تو جیسے جم کر رہ گئی۔ چھ سال کے طویل عرصے کے بعد اس کے سامنے وامق کھڑا تھا۔ کمزور، مضمحل اور افسردہ افسردہ سا 'اسلام علیکم!' اس نے سلام کیا تو سجل نے ناگوار نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''وعلیکم السلام!'' نہ چاہتے ہوئے بھی سلام کا جواب دیا اور راستہ کاٹ کر آگے کی طرف بڑھ گئی۔

''سجل کیسی ہو......؟'' وامق نے پوچھا۔

''مسز تیمور حسن ہوں میں اور الحمد اللہ بہت خوش ہوں۔'' سجل کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

''سجل...... مجھے معاف کردو...... میں غلط تھا۔'' وامق کے لہجے میں بے بسی تھی۔

وامق اب ان باتوں کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے، یہ رش کی جگہ ہے نہ اپنا تماشا بنواؤ اور نہ میرا۔'' سجل نے تلخی سے کہا اتنی دیر میں وامق ایک پرچے پر اپنا نمبر لکھ کر اس کی طرف پھینک چکا تھا۔

''ہونہہ!'' سجل نے کاغذ کا وہ ٹکڑا پیروں سے کچلا اور آگے بڑھ گئی۔ وامق پہلے ہی پلٹ کر جاچکا تھا۔ اتنی دیر میں پنکی اور سونو بھی آ گئے۔ سجل کے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ پلٹ کر وہ کاغذ کا پرچہ اُٹھا کر پرس میں رکھ لیا۔

اس لیے نہیں کہ اس کے دل میں وامق کے لیے کوئی ہمدردی، محبت یا نرم گوشہ تھا بلکہ اس کی کوئی اور ہی وجہ تھی۔

اور سجل کو آج پھر سے ماضی کی یاد آ گئی تھی۔ سونو کی آواز پر وہ چونکی اور خیالات سے نکل آئی یوں ماضی میں کھوئے کھوئے اُسے وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا تھا۔

سجل نے دو دن بعد وامق کو میسج کیا تو وامق تو خوشی سے پاگل ہوگیا۔

''سجل...... سجل...... واقعی تم ہو......؟ تم نے مجھے میسج کیا۔ مجھ سے بات کی...... بہت شکریہ تمہارا...... میں جانتا ہوں سجل کہ تم مجھے بھلا نہیں سکتیں۔

ہم مل سکتے ہیں......؟ کیا کہیں مل کر بات کر سکتے ہیں؟ مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں......تم سے معافی مانگنی ہے۔''

''ہاں ہم ضرور ملیں گے۔'' سجل کے جملے نے وامق کے اندر جیسے جان ڈال دی تھی۔ آج بھی وامق کے دل میں سجل موجود تھی۔ تین تین شادیاں کر کے بھی وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ ایسے میں سجل کا اس طرح سے مل جانا اور پھر بات بھی کرنا۔ یقیناً وہ بھی خوش نہیں ہوگی۔ اس کے دل میں بھی بس میں ہوں گا۔

''میں ...... میں ...... اس کے سامنے ہاتھ جوڑوں گا اُسے مجبور کر دوں گا۔ ایک بار پھر...... پھر ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔'' وامق اپنے دل میں بے شمار باتیں سوچ رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں اج بھی سجل کے دل میں اس کے لیے سوفٹ کارنر موجود ہے، اور یہی بات کو لے کر وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔

آج کل تیمور ایک کیس کو لے کر خاصے پریشان تھے۔ وہی 'شک' کا کیس تھا ایک شوہر کو بیوی پر شک تھا کہ وہ کہیں اور انوالو ہے اور وہ اسے طلاق دینا چاہتا تھا جبکہ پہلے بھی وہ اپنی بیوی کو چھوڑ چکا تھا۔

جبکہ بیوی اس بار طلاق نہیں لینا چاہتی تھی اس کا دعویٰ تھا کہ وہ بے قصور ہے اور شوہر اس پر بے بنیاد الزام لگا رہا ہے۔

اتوار کا دن تھا اور کافی دن بعد تیمور نے گھومنے کا پروگرام بنایا تھا اور اسی دن سجل نے بھی وامق کو ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ سارا دن بچوں کے خوب انجوائے کیا اس وقت بھی بچے پلے لینڈ میں تھے کہ سجل نے کہا۔

''تیمور میں ذرا ریسٹورنٹ جا رہی ہوں۔ وہاں کوئی آنے والا ہے۔ میں آپ کو اس سے ملوانا چاہتی ہوں آپ بھی بچوں کو لے کر آ جایئے گا۔''

''اوکے تم چلو میں آتا ہوں۔'' تیمور نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اس وقت جمپنگ کیسل پر انجوائے کر رہے تھے۔

سجل ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی تو سامنے ٹیبل پر وامق کو بے چین اور منتظر پایا۔ وہ تو خوشی سے بے قابو ہو گیا۔

''سجل کیسی ہو تم؟ بہت شکریہ تم نے مجھے بلوایا۔ مجھ سے یوں ملنا چاہا...... خدا گواہ ہے سجل کہ میں ...... میں آج بھی صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ میرے دل میں آج بھی صرف تم ہو...... اور ...... اور ...... مجھے یقین ہے کہ تم ...... تم بھی مجھے بھلا نہیں پائی ہو۔ سجل اگر تم چاہو تو ہم پھر......''

''بس!'' سجل نے ہاتھ اُٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا...... کیونکہ تیمور بھی آ چکا تھا اور حیران نظروں سے وامق کو دیکھ رہا تھا۔

''تیمور یہ وامق ہے، جن کے بارے میں آپ جانتے ہیں اور...... اور...... وامق صاحب یہ تیمور حسن ہے میرے شوہر، میرے دوست......''

سجل نے اُٹھ کر ایک دوسرے کا تعارف کروایا اس لمحے سجل کے چہرے پر تفاخر تھا۔

''سجل ...... یہ ...... سب کیا ہے...... یہ کیسا مذاق کر رہی ہو میرے ساتھ......'' وامق کا چہرہ ایک دم فق ہو چکا تھا یہ سب اس کے حیران کن اور غیر متوقع تھا۔

''جی وامق صاحب، آپ کیا سمجھے کہ میں آپ کو یہاں بلوا کر آپ سے گزری ہوئی محبتوں کی تجدید کروں گی۔ پیار محبت کی باتیں کروں گی۔

تو سراسر آپ کی خام خیالی ہے ایک وقت تھا جب میں آپ انو الوتھی اور آپ نے اپنے اس رشتے کا ناجائز اور غلط استعمال کیا۔ آپ سمجھے کہ میں نے آپ سے رابطہ کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے دل میں آپ کے لیے کوئی نرم گوشہ ہے۔

تو کان کھول کر سن لیں کہ ایسی خوش فہمی کو دل سے نکال دیں کیونکہ میں آپ کو صرف یہ بتانا اور دکھانا چاہ رہی تھی کہ مرد کا ایک روپ یہ بھی ہے جو آپ کے سامنے میرے شوہر کے روپ میں کھڑا ہے۔ مرد صرف عورت پر اپنا حق جمانے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ دوست بھی ہوتا ہے۔ دیکھو تیمور نے آج مجھے آپ کے ساتھ یوں بیٹھا دیکھا لیکن انہوں نے میرے کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی۔ مجھ پر کوئی شک نہیں کیا، کیونکہ ان کو مجھ پر مکمل بھروسا ہے میرے کردار پر 100% یقین ہے تب ہی الحمد للہ ہماری زندگی مثالی ہے۔ اور میں آپ کو یہی بتانا چاہتی تھی آپ کے خیال میں ...... میں ...... آپ جیسے انسان کے لیے اس فرشتے جیسے انسان کو چھوڑ دوں گی تو لعنت ہے آپ پر اور آپ کی گندی سوچ پر۔'' سجل کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی تھی۔

''وامق احمد...... ! رشتوں کی سلامتی اور بقاء کے لیے ایک دوسرے پر پوری سچائی کے ساتھ بھروسا کرنا اور اعتماد بحال رکھنا پہلی شرط ہے۔ یہی کامیاب زندگی کا راز ہے اور تم...... تم...... کو یہ بات اب تک سمجھ نہیں آئی تب ہی تو تمہارا یہ حال ہے کہ تین تین شادیوں کے بعد بھی تم آج بھی اسی مقام پر کھڑے ہو جس پر کہ تم سالوں پہلے کھڑے تھے۔

اس لیے سب سے پہلے اپنی منفی سوچوں سے چھٹکارا پاؤ۔ اپنی سوچ کو مثبت بناؤ تب ہی اس کے مثبت اثرات تمہاری ناکام زندگی پر مرتب ہوں گے تب ہی کامیاب زندگی گزارنے کے قابل ہوسکو گے۔''

سجل کے رکتے ہی تیمور نے آہستہ آہستہ اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں وامق کو سمجھایا۔ سجل حیرانی سے تیمور کو دیکھ رہی تھی اُسے یہ سب کچھ کیسے پتا چلا تھا کہ وامق نے تین شادیاں کی ہیں۔'' وامق سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار نمایاں تھے۔

دفعتاً وامق نے سر اٹھایا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ سجل کو ایک لمحے میں وہ بات سمجھ آ گئی تھی کچھ دنوں سے تیمور حسن جس کیس کو لے کر پریشان تھے یقیناً وہ وامق کا ہی ہوگا وامق کے چہرے پر شرمندگی کے ساتھ پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے وہ چپ چاپ گم صم سا بیٹھا تھا پھر کرسی سے اٹھا اور بنا کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔

دو قدم بڑھا کر وہ رُک گیا۔ واپس آیا اور تیمور کی جانب دیکھ کر کہا۔

''سر میں اپنا کیس واپس لینا چاہتا ہوں۔ اس بار میں بیوی کو طلاق نہیں دوں گا بلکہ خود کو بدلنے کی کوشش کروں گا۔ تھینک یو سو مچ بوتھ آف یو۔'' اللہ پاک آپ دونوں کو یونہی شاد و آباد رکھے۔ پہلے تیمور کو اور پھر سجل پر اچٹتی سی نظر ڈال کر وامق نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف چل دیا۔

تیمور نے مجھے اور میں نے تیمور کو دیکھا ہم دونوں کے چہروں پر اطمینان تھا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہم لوگ پنکی اور سونو کی جانب چل دیے۔

☆☆......☆☆

''میں نے بہت سوچا اور اب ان سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جب میری زندگی کے لیے کوئی سوچنے والا نہیں تو...... تو مجھے بھی سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ جان پر بنے تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ میں تو پھر......'' پریا سسکنے لگی۔ فروا نے بمشکل اُسے......

"Now That She Had Nothing to Lose She Was Free" (PAULO COELHO)

زارا سے پہلی ملاقات زیادہ پرانی نہیں تھی۔ لیکن وہ کہتے ہیں نہ کہ کبھی تو برسوں کے فاصلے لمحوں میں پاٹے جائیں اور کبھی گرہ بھر دوری پاٹنے میں صدیاں گزر جائیں تو کچھ ایسا ہی تھا۔ زارا کی پریا اول الذکر لوگوں میں سے تھی۔

مارچ کے اوائل کی ٹھنڈک ابھی اپنی تر و تازگی سمیت فضاؤں میں ٹھہری تھی۔ اور شادی کا پنڈال اُسی روایتی انداز میں سجا تھا جو ہمارے یہاں کا خاصا ہے۔

پارکنگ میں گاڑی سے اترتی نگہت کو فروا دکھائی دی تو اُس نے اشارے سے سلام کرتے ہوئے رُکنے کا اشارہ کیا۔ نگہت سے ملاقات بھی سیمین حیات کی آرٹ گیلری میں ہوئی تھی جہاں وہ زارا اور پریا کے ساتھ تھی۔ فروا اور نگہت علیک سلیک کے بعد پارکنگ سے نکل کر گھر کے مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگیں۔

اُس عالیشان بنگلے کے لیے 'گھر' کا لفظ کسرِ نفسی بھی ہو سکتی ہے۔ جہاں اندر بڑے بڑے گرین لانز میں چار چار کی ٹکڑیوں میں رکھی کرسیاں اپنی سفیدی میں پرسکون ماحول بنائے ہوئے تھیں۔ نگہت اور فروا چلتی چلتی لان کے اُس حصے کی طرف بڑھیں جہاں لگی مارکیز میں عورتوں کی باتوں کی چہکار میں رنگ برنگے کولونز کی خوشبوئیں فضا کو مشکبار کیے تھیں۔ فروا اور نگہت ایک طرف دو خالی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ قریب ہی کچھ مزید سنبھلی سنبھلائی خواتین الگ تھلگ بیان لیے بیٹھی تھیں۔ باقی خواتین کی اکثریت پر قدرے دیہاتی چھاپ تھی جن کے بازوؤں میں بھری سونے کی چوڑیوں میں دانستہ نزاکت' اسٹائل یا خوبصورتی کے بجائے وزن کو مدنظر رکھا گیا تھا۔

سونا! جس کی چمک بڑے بڑوں کو خیرہ کرتی ہے پر کیا کیا جائے کہ کھرا سونا بھی کھوٹے چہروں

کر اُجالنے میں ناکام رہتا ہے لیکن یہ ذرا دیر میں پتا چلتا ہے۔...... پر، اس بات کی پروا ہے کسے؟

تیز رنگوں، تیز خوشبوؤں اور اونچے آہنگ میں باتیں کرتی عورتوں کے درمیان گھرے نیلے کاسنی کے سوٹ میں ملبوس زارا دکھائی دی۔ فروا اور نگہت پر نظر پڑتے ہی اُس کے چہرے پر خوشی بھری مسکراہٹ جگمگائی۔ وہ پاس آکر گلے ملتی ہوئی بولی۔

''بہت خوشی ہوئی تم لوگوں کے آنے سے۔''

''مبارک ہو بہت بہت۔'' فروا اور نگہت اُس سے ملتے ہوئے اکٹھی بولیں۔

''بہت بہت شکریہ، تم لوگ ٹھیک تو بیٹھے ہونا۔'' زارا ہلکے چلتے پنکھوں کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''ہاں۔۔۔ ہاں! ہم بالکل ٹھیک بیٹھے ہیں تم بے فکر ہو جاؤ۔'' نگہت ہنستے ہوئے بولی۔ زارا کی کسی رشتہ دار خاتون نے پیچھے سے آ کر اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور بولی۔

''ہے گلزاراں! مبارک ہووے نے کڑی دے ویاہ دی۔'' (اے گلزاراں! تمہیں مبارک ہو بیٹی کی شادی) زارا مڑ کر اس کے گلے لگی اور اس کے ساتھ ہی آگے چل دی۔

''زارا کتنی مختلف ہے نہ اپنی برادری سے۔'' نگہت دھیرے سے بولی۔

''ہاں! میں تو پہلی مرتبہ ہی دیکھ رہی ہوں۔'' فروا نے جواب دیا۔

''ہم کمیٹی پارٹی پر اکٹھے ہوتے رہتے ہیں نہ۔ زارا کی کزنز بھی ساتھ ہوتی ہیں تو میں ہمیشہ اُسے یہ بات کہتی ہوں۔'' نگہت ہنستے ہوئے بولی۔

''اچھا!'' فروا نے سامنے زارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ایک ادھیڑ عمر کے گہرے سانولے آدمی کے ساتھ ان ہی کی طرف آ رہی تھی۔ وہ رشتہ دار عورتوں سے ملتی ملاتی فروا اور نگہت تک پہنچی اور بولی۔

''سوچا تمہیں چوہدری صاحب سے بھی ملوا دوں۔''

''بہت بہت مبارک ہو آپ کو پریا کی شادی۔'' فروا چوہدری صاحب سے مخاطب تھی۔

''بہت مہربانی!'' چوہدری صاحب انکساری سے بولے اور ایک دو رسمی جملے بول کر زارا کے ساتھ آگے بڑھ گئے کچھ نئے آنے والے مہمانوں کی طرف۔ نگہت تھوڑا فروا کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

''سچ کہتے تھے سیانے کہ مرد کی شکل نہیں اُس کی جیب دیکھی جاتی ہے۔ اللہ معاف کرے شکل کو کیا کہنا پر...... توبہ! عمر بھر قصائی گلی اور رتہ امرال کے راجہ اِندر بنے رہے یہ چوہدری صاحب۔''

''قصائی گلی...... رتہ امرال؟'' فروا نے ہولے سے یہ دونوں نام دہرائے تو نگہت ہنستے ہوئے بولی۔

''تم دونوں جگہوں کو 'گلابوں والی گلی' سمجھ لو۔'' فروا کے چہرے پر عجیب سی خجالت چھا گئی۔ وہ ایسی ہی تھی دوسروں کی عیب جوئی پر خود شرمندہ ہو جانے والی۔ جیسے وہ سب کچھ خود اُس سے سرزد ہوا ہو۔ جس کی طرف کوئی انگلی اٹھا رہا ہو۔ ایسے وقتوں میں اس کا جی چاہتا ہے کہ صوفیوں کے زمانے کی لمبوتری اونی ٹوپی اس کے سر پر بھی ہوتی۔ اُنہی کی طرح کانوں تک پہنچی...... تاکہ اُس کے کان بھی کسی کے عیب سننے سے بچے رہتے۔ نگہت اُس کے حال سے بے خبر بولے چلی جا رہی تھی۔

''رتہ امرال پرانا علاقہ ہے پنڈی کا...... قدرے بدنام...... چوہدری صاحب کے باپ دادا کی جائیدادیں بشمول چند مشہور حویلیوں کے اُدھر ہی تو تھیں۔ یہ کالونی تو ان لوگوں نے بعد میں اِدھر بنائی نہ اپنی کچھ زمینیں بیچ کر۔ ویرانہ تھا یہ علاقہ، سمجھو آباد ہی ان لوگوں نے کیا تھا۔ لق و دق اس ویرانے میں ایک کالا بورڈ ان چوہدری فہیم حیدر ہی کا تو لگا ہوتا تھا۔''

''اچھا! میں پرانے پنڈی کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی۔'' فروا ہولے سے بولی تو نگہت بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''ان زمینوں، جائیدادوں کے بکھیڑوں میں تو یہ سب شادیاں برادری میں کرتے ہیں۔ دیکھ

نہیں رہیں ان سوٹے سے لدی عورتوں کے مہاندرے ایک سے ہیں۔''

''ہاں...... ہاں...... اچھا!''

''پر رہے نام اللہ کا۔ خدا کی خدائی کہ جہان بھر کے دھن سے اپنی بیٹی کا دھڑ نہ خرید سکے۔'' فروا نے ذرا چونک کر نگہت کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''پریا کی بات کر رہی ہوں۔ نیا گھر بنا کر سیٹ کر کے دیا ہے بیٹی کو۔ اتنا جہیز...... زیور اور دوسری پراپرٹی علیحدہ!'' وہ دونوں بازو پھیلا کر بولی۔

''اچھا! اللہ پریا کو نصیب کرے۔ اللہ اُسے شاد رکھے۔'' فروا جواباً بولی تو اس کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

اونچے چلتے میوزک میں اب بینڈ باجوں کی آوازیں بھی شامل ہونے لگیں تو اُن ایک سے مہاندروں والی بھاری بھرکم عورتوں کے ریوڑ کے ریوڑ وسیع و عریض لانز سے گزرتے مین گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔

''لگتا ہے بارات اندر آرہی ہے۔'' فروا اشتیاق سے بولی۔

''ہاں! عصر پر تو اب دیہاتی بیک گراؤنڈ کی باراتیں ہی آتی ہیں۔ یہ لوگ نہیں بدلنے کے، بھئی شام رات کی شادی رکھو۔ چھوڑ جاؤ دولہا دلہن کو کہیں کسی ہوٹل میں اور جاؤ گاؤں واپس، نہیں! اتنا عجیب لگتا ہے اب تو دوپہر میں تیار ہونا کسی شادی کے لیے۔'' نگہت گیٹ سے اندر آتے' گلے میں ہار پھول پہنے ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ڈھول تاشے والے آسمان پر سر اٹھائے اُن کے ساتھ ساتھ تھے۔

پھر کچھ سنولائے ہوئے چہروں اور سخت خدوخال کی پرتفاخر عورتیں اگلے اُجلے سفید صوفوں پر براجمان ہونے لگیں۔

عورتوں کے بعد آدمیوں کا جم غفیر مردانہ پنڈال میں بٹھایا جانے لگا۔ خوب دھوم دھڑکا ہوا۔ باراتیں شگن کے ناچ گانوں سے فارغ ہوئیں تو سب کو کولڈ ڈرنکس اور چائے بمعہ لوازمات کے وہیں کرسیوں پر سرو ہونے لگی۔

شام گہری ہونے چلی تھی اور فروا سوچ رہی تھی کہ پریا سے مل لے تو اجازت چاہے، کیونکہ ساتھ بیٹھی نگہت بار بار وارننگ جاری کر رہی تھی کہ دیہاتی بیک گراؤنڈ کی شادیاں کچھ زیادہ ہی لمبی ہوتی ہیں۔

مغرب کے سائے گہرے ہوکر سرمئی اندھیروں میں بدلے تو سارا لان اور اردگرد کا ایریا ننھی منھی آرائشی بتیوں سے جگمگانے لگا۔ زارا پاس ہوئی تو فروا نے اٹھتے ہوئے پریا سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا وہ فروا کا ارادہ بھانپتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... نہیں ابھی نہیں جانا وہ اِدھر اسٹیج پر ہی آرہی ہے۔ نکاح تو ہوا، ہوا ہے نہ آٹھ ساڑھے آٹھ تک کھانا لگا دیں گے۔ بارات نے واپس گاؤں جو جانا ہے۔ چار پانچ گھنٹوں کا تو سفر ہے آگے کا۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔'' فروا مارے مروت کے پھر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اِدھر اُدھر منڈلاتے وڈیو بوز والے گھر کی سمت بڑھے تو فروا نے سوچا واقعی! دلہن آرہی ہوگی۔ اگلے چند منٹوں میں ساری بتیاں بند کروا دی گئیں۔ صرف اردگرد لگی اسکرینز روشن تھیں۔

''اے، کے بکواس بازی اے؟'' کسی عورت کی اونچے کرخت لہجے میں آواز آئی۔ لان کے بیچ چلتی پتلی سرمئی پگڈنڈی پر کافی لڑکیاں

اکٹھی تھیں جو ذرا ترتیب میں ہوئیں اور قریب ہوئیں تو ان کے بیچ پورے چاند کی مانند جگمگاتا پریا کا چہرہ تھا۔ مکمل سنہرا! ماتھے پر ایک لٹ کی صورت پڑے سنہری بالوں سے ذرا نیچے دمکتا کندن کا ٹیکہ تھا۔ چہرے کی تابانی جسے مات کرتی تھی۔ گہرے مہرون قدرے پلین ڈریس پر بھرے کامدار دوپٹے کے ساتھ پریا کو دو لڑکیاں تھامے تھیں۔ وہ نگاہیں نیچی کیے دھیرے سے قدم بڑھاتی تو سینے سے نیچے کا دھڑ تھوڑا علیحدہ ہو کر آگے بڑھتا۔ ہر طرف گھپ تاریکی میں' کیمروں کی چکا چوند روشنی میں جو صرف پریا کے اوپر فوکس تھیں۔

سرمئی پگڈنڈی پر قدم بڑھاتی وہ بالکل تنہا لگ رہی تھی۔ جس کی لمبی سنہری گردن کے گرد ان گنت جڑاؤ زیورات اس کے لو دیتے چہرے سے دمک رہے تھے۔

''ماشاء اللہ بہت ہی پیاری لگ رہی ہے۔''

فروا پیار سے بولی۔ نگہت بولی۔

''اس کے کپڑے تھوڑے سادے نہیں؟ ہاں بھئی گردن میں ست لڑا ہار پڑا ہو تو......ایک ہنسی۔

پریا پھولوں سے بھرے چھوٹے سے اسٹیج تک پہنچی تو روشنیاں تب بھی گل تھیں۔ فروا کا بس چلتا تو وہ بتیاں بند ہی کروائے رکھتی۔ پریا کے لو دیتے چہرے کے آگے انہیں ویسے بھی ماند ہی رہنا تھا۔ دلہن کے بیٹھتے ہی سب سسرالی عورتیں بھی دھڑلے سے اسٹیج پر پہنچیں۔ ایک بھاری بھرکم خاتون نے آگے بڑھ کر دلہن کا دوپٹہ نیچے کرنے کی کوشش کی۔ غالباً گھونگھٹ کرنا چاہتی تھیں۔ پر لاتعداد پنوں میں جکڑے دوپٹے کے آگے پیش نہ چلی۔ کچھ عورتوں کے منع کرنے پر بمشکل منع ہوئیں پر ناگواری چہرے پر چپکی تھی۔ وہی پریا کی ساس تھیں۔

تھوڑی دیر میں مردانہ پنڈال سے ہلچل برآمد ہوئی تو پتا چلا کہ دولہا آ رہا ہے۔ گہرے چمکدار کپڑے کے سوٹ میں ملبوس، چھوٹا سا موتیوں کا سہرا لگائے۔ جس کی لمبائی فقط تھوڑی تک تھی۔ ساتھ دوشہ بالے تھے جو اُس کی طرح چمکیلے سوٹوں اور سہروں میں ملبوس تھے۔ ساتھ قریبی رشتہ داروں کا ٹولہ تھا۔ چھوٹی موٹی رسموں کے بعد دولہا اسٹیج تک پہنچا۔ پھولوں اور نوٹوں کی خوب نچھاور ہوئی۔ وہ پریا کے ساتھ بیٹھ گیا تو ویڈیو والوں نے لوگوں کو بٹھانے کا کہا۔ کچھ دیر بعد دولہا نے سہرا پلٹا اور پنڈال میں بیٹھے بہت سارے لوگ مایوس ہوئے۔ گہرا سانولا چہرہ جو اگرچہ سونے کی گھڑی اور بھاری سلامیاں وصول کرتے تمتما تا تھا پر، اُس کی آنکھیں ایک گہرے چالباز کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی، لیکن متکبر اور سفاک! اُدھر نگہت کا سینسر کی زد میں آتا بے لاگ تبصرہ جاری تھا۔ بڑے بڑے تھالوں میں رکھی بد بٹنے لگی اور اگلے مزید آدھے گھنٹے تک کھانا لگ گیا۔ کھانے کے بعد ہجوم میں زارا دکھائی دی تو فروا بولی۔

''آؤ زارا سے مل لیں اور پریا سے بھی، پھر چلتے ہیں پونے بارہ تو ہو چلے ہیں۔''

نگہت بولی۔ ''ہاں...... ہاں چلو!'' یہ جو دیہاتی بیک گراؤنڈ کی 'جلدی' ہوتی ہے نہ یہ بڑی 'دیر' سے ہوا کرتی ہے۔

☆......☆......☆

پریا کی شادی کے دو اڑھائی ہفتے بعد زارا کا فون آیا تو سلام دعا کے بعد بتانے لگی کہ پریا تو ہنی مون کے لیے گئی ہوئی ہے اور یہ کہ جس دن سے گئی ہے سمجھو گھر کی ساری رونق برکت ہی ساتھ لے گئی ہے۔ چوہدری صاحب تو مطمئن کم، بے

چین زیادہ ہیں۔'' پھر لہجہ دھیما کرتی بولی۔

''اُس کی رخصتی کے بعد ساری رات بے کل رہے۔ کبھی اندر کبھی باہر...... ہائے! مجھے اندازہ تو تھا کہ پری سے ان کا لگاؤ بہت ہے پر اُن کی اُس رات کی بے چینی...... بس کیا بتاؤں؟ اپنی شادی مجھے کل ہی کی بات لگتی ہے اور بے جی بتاتی تھیں کہ میری رخصتی کے بعد ابا اسی طرح بے چین اور فکر مند تھے۔ حالانکہ میں تو صحیح...... سلامت تھی پر...... پریا؟'' یہ کہتے اُس کی آواز رندھ گئی۔ فروا اُسے تسلی دیتی ہوئی بولی۔

''گھبراؤ نہیں، یہ سب فطری جذبات ہیں زارا، اور ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ میری ندا رخصت ہوئی تو اس کے خالی کمرے میں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اُس کی پیلی چوڑیاں پڑی تھیں۔ میں بار بار جب اُس کے کمرے میں جاتی تو مجھے لگتا کہ وہ صرف پیلی چوڑیاں نہیں...... میری گود، اپنا بچپن میرا آنگن اور اپنا ایک عہد چھوڑ گئی ہے۔ پر اب تو وقت بہت بدل گیا ہے وہ زمانے گئے کہ آنکھ اوجھل تو پہاڑ بھی اوجھل...... اب تو اوجھل پہاڑ بھی ایک 'کلک' کے فاصلے پر ہیں۔ بھگت لیا ہم لوگوں نے اور ہم سے پچھلوں نے...... اب تو بہت سہولتیں ہیں۔''

''ہاں! یہ بات تو ہے خیر سے روزانہ ہی بات ہو جاتی ہے۔ بس اگلے ہفتے تو آ جائیں گے دونوں۔'' زارا پُر امید لہجے میں بولی۔

''ہاں...... ہاں...... Let Them Enjoy تم چکر لگاؤ میری طرف۔''

''ہاں ضرور، بلکہ پریا آ جائے تو اُس کے ساتھ ہی آؤں گی۔ تم سے تو روح راضی رہتی ہے میری بیٹی کی۔'' فروا ہنستے ہوئے بولی۔

''ہاں...... ہاں Any Time۔''

زارا کا فون بند ہوا تو چلتے پھرتے کام کرتے بھی وہ پہلا دن آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جب مقامی نگار خانے میں سیمیں حیات کے مجسموں کی نمائش تھی۔ شرک اور کفر کے فتوؤں سے قدرے شرمندہ سی یہ نمائشیں دانستہ کم پبلسٹی کے طفیل محدود و مخصوص لوگوں پر مشتمل تھی۔ وہ تمام مخصوص لوگ جو تراشیدہ مجسموں میں مقید کہانیوں پر نگاہ ڈالتے تو اس خیال سے ڈالتے کہ

گو واں نہیں، پر واں سے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

نگار خانے کی ملیالی دیواریں ایک ثقافتی پختگی لیے، اپنے اوپر پڑنے والی اِن ڈائریکٹ روشنی سے اُن مجسموں کے خال و خد انہایت لطیف انداز میں اُجاگر کر رہی تھیں۔ سامنے خوبصورت سرمئی نقشین سلیٹ کی نشستوں پر بچھی اجرکیں اور سیاہ کڑھائی کے شیشوں والے کشن' دائیں بائیں لٹکتی پیلی نفیس گوٹے کناری سے بنی گھنٹیوں میں خوبصورتی سے اُجاگر ہو رہے تھے۔ فروا نے اندر داخل ہو کر دور سے ہاتھ کے اشارے سے سیمیں حیات کو سلام کیا جو کچھ خواتین میں گھری چار چھ دانشوروں اور آٹھ دس کیمرہ مینوں کے بیچ بیٹھی کسی سوال کے جواب میں کہہ رہی تھی۔

''یہ ہُنر تو صریحاً اللہ پاک کی عطا ہے۔ اللہ سائیں کے حکم پر میری انگلیوں میں اُن کی تراش اترتی ہے۔ ایسے، جیسے سنگیت کاروں پر دھنیں اترتی ہیں۔ لکیروں پر حروف کے صحیفے اترتے ہیں۔ وہ جیسے پوچھا تھا نہ ایک مشہور سنگ تراش سے کسی نے کہ 'تم یہ سب مجسمے کیسے تراش لیتے ہو تو اُس نے سکون سے جواب دیا کہ مجسمہ تو مٹی کے اندر موجود ہوتا ہے میں تو بس فالتو مٹی ہٹا دیتا ہوں۔' تو بس یہ ایسی ہی بات ہے پر کیا کیا جائے

کہ اپنے یہاں تو پہلے ہی فنونِ لطیفہ کی سرپرستی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پر اب، جب کہ کم از کم تین دھائیوں سے جعلی ڈگریوں کے انباروں تلے فہم و ادراک کی اکھڑی اکھڑی سانس چل رہی ہے تو اس ذہنی طور پر دیوالیہ ماحول میں کام مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔ دیکھیے پرانے وقتوں میں بوڑھے بوڑھ کے نیچے داستان گوئی ہوا کرتی تھی کیا وہ سحرزدہ نہ کرتی تھی سننے والوں کو، پھر کٹھ پتلی تماشہ، تھیٹر، اسٹیج اگر یہ سب گزرتے وقت کے ساتھ 'فلم' کی صورت ہوگئے تو کفر ہوگئے؟ کیا زمانے نے آگے نہیں جانا تھا؟ پر ہمارے ہاں اپنی منوانے کے لیے مذہب کی آڑ لی جاتی ہے، آپ ...... آپ سب بتائیں ہمارے خطے میں جب سے مذہبی انتہا پسندی بڑھی ہے۔ تو اس کے باعث اخلاقی گراوٹ گھٹی یا بڑھی؟'' خاموش، پُرسحر ماحول میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

''جی! میں جانتی ہوں کہ آپ بولیں نہ بولیں اندر سے آپ سب کا جواب موخرالذکر ہی ہوگا۔ سیمیں حیات ایک توقف سے بولی۔

''محمد احسن'' ایک بہت ہونہار رائٹر ہیں۔ ان کی کتاب کا ایک مکالمہ ہے کہ قلندر سے کسی نے وہ سوال پوچھا جو ان سے نہیں پوچھا جاتا کہ وہ تو قلندر ہوتے ہیں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے جب ان کا عشق جواب دیتا ہے تو سوالی کا علم جواب دے جاتا ہے تو جوان نے پوچھا۔

''حضرت! یہ فرمائیں غیر اللہ سے مدد مانگنا کیسا ہے؟'' قلندر نے جواب دیا۔

''بہت بُری بات ہے بچے...... بہت بری بات ہے پر! پہلے غیر اللہ کہیں ملے تو۔'' زوردار تالیوں کی گونج میں ایک جرنلسٹ نے کہا۔

''بہت خوب سیمیں حیات صاحبہ...... چلیے آخری بات اور وہی سوال کہ آپ اس حوالے سے کیا پیغام دینا چاہیں گی؟''

سیاہ چنری کی ساڑی میں ملبوس سیمیں حیات کی ذہین آنکھیں لحہ بھر کو کسی پاتال میں اتریں اور وہ بولی۔

''بس یہی کہ بلاتفریق رنگ نسل' علاقے' ملک اور مذہب کی قید سے ہٹ کر انسانیت کے لیے صرف اور صرف آسانیاں پیدا کرنے والی قوم بن جائیں کہ جو قومیں اپنی ثقافت اور اقدار کو تھامے وقت کے ساتھ آگے نہیں بڑھتیں انہیں دنیا پیچھے چھوڑ جاتی ہے اور زمانہ آگے نکل جاتا ہے کہ وہ بھی...... زمانہ بھی اسی کائنات کا حصہ ہے جو گردش میں ہے اور گردش ہی میں بقا ہے۔ کائنات کی بھی اور قوموں کی بھی، تھینک یو!'' اُن آخری لمحات کے سناٹوں میں ساکت بتوں میں سے ایک میں جنبش ہوئی اور اِس جنبش میں جب وہ کھڑی ہوئی تھی تو اس کا دھڑ تھوڑا الگ ہوا تھا۔

''ویری نائس سیمیں آنٹی۔'' تالیوں کی دبی دبی گونج میں اُس کی آواز ابھری تھی۔ وہ پریا تھی جو بولتی تھی تو قدرے وقت سے کچھ سانس مجتمع کر کے بولتی تھی پر اُس کا پُرکوشش لہجہ اُس کی آواز کو پُرکشش کرتا تھا اور......

وہ تھوڑا مختلف چلتی تھی۔ وہ پریا تھی...... جو پہلی ملاقات ہی میں فروا پر فریفتہ ہوگئی تھی اور کہتی تھی اور کہتی تھی کہ اگر آپ سیمیں آنٹی کی دوست ہیں تو میں سمجھوں کہ آپ میری بھی دوست ہیں؟'' اور فروا نے اُس کی سادگی اور بے ساختگی پر اُسے گلے لگالیا تھا۔ یونیورسٹی کے بعد وہ ایک مقامی انگریزی اخبار میں آرٹیکلز لکھتی تھی۔ جب وہ ہنس ہنس کر پہلی ملاقات ہی میں فروا کو اپنے بارے میں بتارہی تھی تو پاس کھڑی زارا دل ہی

دل میں سوچتی تھی کہ آخر میری بیٹی اپنے سے بڑی عمر کی عورتوں سے کیوں دوستی کر لیتی ہے۔"

تو اُس آرٹ گیلری کی ملاقات دوستی کا ایسا شاخسانہ بنی کہ اکثر ہی فروا، کبھیں زارا اور پریا کی ملاقات رہتی۔

☆......☆......☆

کچھ مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک روز زارا کا فون آیا وہ عام دنوں کی نسبت بہت ایکسایٹڈ تھی۔ پھر بتانے لگی کہ "خیر صلاً! پریا کا بہت زوردار قسم کا رشتہ آیا ہے۔ ہمارے گاؤں کے دور دراز کے رشتے داروں کا لڑکا ہے خالد! سردار عزیز کا بیٹا۔ ابھی پچھلے دنوں گاؤں میں شادی تھی نہ تو بس وہاں کہیں پریا کو دیکھ لیا ہے اور ایسا پیچھا پکڑا ہے کہ سمجھو چوکھٹ تھام لی ہے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں ہماری طرح......

"پریا کیا کہتی ہے اس رشتے پر؟" فروا کے استفسار پر زارا ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بولی۔

'پریا کو نیم رضا مند ہی سمجھو۔"

"نیم رضا مند؟" فروا کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"ہاں! صاف بتاؤں؟ اُسے ذرا منانا پڑا ہے مجھے اور...... چوہدری صاحب کو بھی، بلکہ ابھی بھی منا رہے ہیں۔'یار! پریا کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک کلاس فیلو کو بہت پسند کرتی تھی۔ عمر! وہ اُس کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ بعد میں اُس نے رشتہ بھی بھیجا مگر...... بھئی عام سا گھرانہ تھا۔ باپ کسی شپنگ کمپنی میں کام کرتا تھا آگے لڑکے نے بھی اُدھر ہی جانا تھا۔ اُس وقت انٹرویو وغیرہ دے کر آیا تھا کراچی جا کر پر؟ دیکھو نہ پریا کو ہم نے بہت ناز و نعم سے پالا ہے تو میں نے اور چوہدری صاحب نے انکار کر دیا۔ آج کے زمانے کے اخراجات تو دیکھو، پری کے اخراجات کہاں سے پورے کرتا...... یہ بچے ہزاروں کے تو بیڑا کھا لیتے مہینے کے ہیں؟ محبت کو چاٹنے سے تو پیٹ نہیں بھرتا نا۔ اصل چیز تو جیب ہوتی ہے۔ دل کا کیا ہے بہل جاتا ہے چار چھ دنوں بعد...... یہی سمجھایا اُس وقت پریا کو۔ وہ تو روگ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔

"اب دیکھو یہ لوگ رشتے کے لیے آئے تو دو گاڑیوں میں علیحدہ سے پھل پھول بھرے تھے۔ جوڑے، جوتے، تحفے علیحدہ! پورا برآمدہ بھر گیا۔ چوہدری صاحب کا مان بڑھایا نہ انہوں نے۔" سب کچھ تسلی سے سنتی فروا ذرا جز بز ہوتے بولی۔

"میں دراصل یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ تمہاری ایک ہی تو بیٹی ہے۔ تم بُرا نہ ماننا زارا......" فروا ہچکچاتے ہوئے ذرا خاموش ہوئی تو زارا بولی۔

"ہاں...... ہاں کہو۔"

"میں دراصل یہ کہنا چاہتی تھی کہ پریا کو اللہ نے اتنا نوازا ہے کہ وہ دنیا کی جو نعمت چاہے خرید سکتی ہے۔ لیکن...... خیال رکھنے والا اور پیار کرنے والا دل، خریدا تو نہیں جا سکتا نا تو؟ اُس لڑکے کا کیا نام تھا؟ ہاں! عمر...... پھر اُس سے رابطہ نہیں ہوا؟"

"لو! اُسے تو صورت گم کیے بھی دو ڈھائی سال ہو گئے ہوں گے۔ چوہدری صاحب نے رشتے سے انکار کے بعد شہر کے با اثر لوگوں سے تڑیاں جو لگوائی تھیں کہ بابا اِدھر کا دھیان نکال دو دماغ سے ہمیشہ کے لیے۔ اُدھر میں نے شاہ صاحب سے، وہ جو پیر ہیں نہ ہمارے گاؤں کے، اُن کے پاؤں پکڑے کہ ایسا کام کریں کہ بیٹی کے دل و دماغ سے اُس کا نام نشان مٹ جائے۔ ہائے! میری دھی تو مانو مرجھا کے رہ گئی تھی۔ شاہ جی

نے روپیہ تو سن دو سن لیا پر یہ بات ہے کہ پریا نے پلٹ کر نام نہ لیا۔ کیا کیا نہیں کرنا پڑتا اس اولاد کے واسطے، ہم نہیں سوچیں گے تو کون سوچے گا؟؟''

''ہاں! وہ تو ٹھیک ہے پر پریا بھی تو دل سے خوش ہو نا، چلو چلتے ہیں کسی دن بھر بات کرتے ہیں۔'' لیکن بات کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ مٹھائی آ گئی ڈھیروں ڈھیر...... زارا کے ساتھ۔ اور وہ بتانے لگی کہ پریا کی منگنی ہو گئی ہے۔ بس چند بڑوں کے بیچ رسم ہوئی۔ اب تین ماہ بعد شادی رکھی ہے۔''

منگنی کی ڈائمنڈ رنگ۔ سونے کے دو سیٹ اور بھاری کڑوں کے ساتھ ساتھ گیارہ کام والے جوڑوں کی خوشی اُس کے چہرے پر سنہری رنگ بن کر دمک رہی تھی۔ زارا اتنی خوش تھی کہ فروا کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔ وہ تھی بھی بڑی جلدی میں کہ اُسے آگے بہت سے گھروں میں مٹھائی بانٹنی تھی۔ مبارکباد اور دعاؤں کے الوداعی کلمات کے ساتھ اُسے رخصت کرتے فروا نے اُس کے پلٹتے پُر تیقن قدموں پر نگاہ کی تو اُسے خوامخواہ ہی زاہدہ کی دادی یاد آ گئی۔ زاہدہ اُس کے آفس میں کام کرتی تھی اور کبھی کبھار اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی ہوتیں تو وہ ایک لمبی سانس بھر کر کہا کرتی۔

''فروا میں نے یونیورسٹی سے پڑھا اِدھر کامیابی سے سوسائٹی میں موو کیا لیکن پتا ہے کیا یہ جو ہم اصلی نسلی دیہاتی ہوتے ہیں نہ اُن پر شہری ملمع کاری ڈھلتی عمر کے ساتھ ہی ڈھلنے لگتی ہے۔ کبھی کبھار جب مجھے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا ہے تو اُس فیصلے میں اتنی ٹھوس حقیقت پسندی، انا اور ڈھٹائی آ جاتی ہے کہ مجھے خود اپنے اتنے Stubbon ہونے پر حیرت ہونے لگتی ہے۔ میں خود کو بالکل اپنی دادی Feel کرنے لگتی ہوں۔

"But Farwa I Dont Want To Be My Grand Ma."

کام کرتے کرتے سکون سے سنتی فروا سر اٹھا کر بھنویں اوپر کرتی اور پر یقین ہو کر کہتی۔

"But You Are Going To Be Your Grand Ma"

زاہدہ کا چہرہ لمحوں میں سرخ ہو جاتا اور وہ زوردار قہقہہ لگا کر دیر تک سنتی۔

واپس جاتی، گاڑی میں بیٹھی ہوئی زارا بھی زاہدہ لگ رہی تھی۔ زاہدہ یا...... زاہدہ کی دادی فروا فیصلہ نہ کر سکی۔

☆......☆......☆

کچھ وقت گزرا، فروا کو سال بھر کے ریفریشر کورس پر ملائیشیا جانا تھا۔ اُس کی ندا اور داماد بھی اُن دنوں ملائیشیا میں تھے سو کورس کے بعد بھی اڑھائی تین ہفتے مزید لگ گئے۔ اُسے واپس آئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز صبح صبح زارا کا فون آیا۔ اُس نے بتایا کہ پریا کل سے لیبر میں ہے کچھ پیچیدگیاں ہو گئی ہیں۔ پلیز دعا کرنا اُس کی آسانی کے لیے تمہیں پتا ہے کہ اُس کے Nerves کا مسئلہ ہے۔''

زارا بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ فروا نے اُسے تسلی دی اور ہوسپٹل کا نام پوچھتے ہوئے کہا کہ وہ جلدی اُس کے پاس آ جائے گی۔

گھنٹے تک وہ ہوسپٹل پہنچ گئی۔ ڈاکٹرز نے پریا کو علیحدہ روم میں رکھا ہوا تھا فروا کو دیکھ کر پریا کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پسینوں میں شرابور، اُس کا چہرہ اوس میں بھیگے مرجھائے، سفید گلاب جیسا لگ رہا تھا۔ کرخت چہرے پر سلوٹیں بچھائے ساس نے گہری تنقیدی نظروں

سے فروا کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ بھاری آواز والی دو بھاری بھرکم عورتیں بیٹھی تھیں جو منہ سے ہلکی سی کراہ نکلنے پر بھی پریا کو ڈپٹ رہی تھیں۔ فروا کچھ دیر زارا اور پریا کے پاس ٹھہری اور ہمت اور صبر کی تلقین کرتی اٹھ آئی۔ تینوں سسرالی عورتیں منہ پر چادروں کی بکل مارے ساکت بیٹھی تھیں۔

رات ساڑھے گیارہ بجے زارا کا فون آیا کہ پریا کے بیٹی ہوئی ہے۔''

''پریا ٹھیک ہے نا؟'' زارا نے پوچھا تو وہ بولی۔

''بس اللہ نے اُسے دوسری زندگی دی ہے گھنٹوں موت اور زندگی کی کشمکش میں رہی اب بہتر ہے۔'' کچھ ہی دیر بعد فروا کو سیمیں کا فون آیا تو دونوں نے پروگرام بنایا کہ صبح اکٹھے ہوسپٹل چلیں گے پریا کو دیکھنے اور مبارکباد دینے۔''

صبح دونوں بڑے بڑے بوکے اٹھائے ہوسپٹل پہنچیں۔ کوریڈور میں بوسکی کے کرتا شلوار پر سونے کے بڑے بڑے بٹن لگائے خالد کھڑا تھا جس کے چہرے پر ان دونوں کو دیکھ کر غیر ارادی طور پر ایک ناگواری آئی جس پر اُس نے بڑی جلدی قابو پالیا۔ فروا اور سیمیں نے اُسے مبارکباد دی تو کہنے لگا۔

''ہمارے ہاں بیٹی ہونے پر مبارکباد دینے کو گالی سمجھا جاتا ہے۔'' سیمیں کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ فروا نے اُس کا بازو دباتے ہوئے منع کیا اور بہت دھیمے سے بولی۔

''ہمارے یہاں دراصل بیٹیوں کو رحمت سمجھا جاتا ہے اسی لیے مبارکباد دی۔ معافی چاہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر فروا آگے ہوئی۔

''پری اُدھر ہے سامنے کمرے میں۔'' پیچھے سے خالد کی آواز آئی۔ آگے چل کر سیمیں بولی۔

''کرنے دینا تھا مجھے اس بد دماغ کا دماغ درست، لحاظ کرلیا تمہارا۔''

''چھوڑو یار! پریا نے ویسے ہی ابھی اتنی تکلیف کاٹی ہے اسے ہی پریشان کرتا۔''

''وہ اب بھی اُسے پریشان ہی کرے گا۔ سنا نہیں کہ سیانے دیگ کا ایک دانہ ہی دیکھتے ہیں۔''

دونوں ہنستی ہوئی پریا کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ پیلی زرد پریا اُن دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بار بار منّی کے اوپر سے نرم گلابی چادر ہٹاتی اور کہتی۔

''دیکھیں آنٹی اس کی دونوں ٹانگیں بالکل ٹھیک ہیں۔ ہیں ناں؟'' اُس کی نقاہت بھری پرکشش آواز میں دبا دبا سا فخر تھا۔ سیمیں نے بڑھ کر منّی کو گود میں اٹھالیا اور فروا نے پیار سے پریا کے ماتھے پر آئی سنہری بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے کیا تو وہ معصومیت سے مسکرادی۔

دونوں تھوڑی دیر بعد اٹھنے لگیں تو پریا نے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ آتی رہیں گی۔ واپسی پر سیمیں فروا سے کہنے لگی۔

''فروا! مان لے خالد نے پری اس لیے کہا پریا کو کہ وہ پریا بول ہی نہیں سکتا ہوگا۔''

''توبہ! تم بھول بھی جاؤ خالد کو، زارا بھی تو کبھی کبھار اُسے پری کہہ کر بلاتی ہے۔'' فروا ہنستے ہوئے بولی۔

''زارا کی اور بات ہے ویسے...... چلو چھوڑو دفع کرو کیا ناگواری بیٹھ گئی ذہن میں۔'' سیمیں سر جھٹکتی ہوئی بولی۔

کچھ وقت کے بعد پتا چلا کہ پریا صحت مند ہوکر گھر گئی تو اُسے اور اُس کی منّی کو ایک بڑے پلاٹ کی ملکیت اور دیگر بھاری تحائف کے ساتھ رخصت کیا گیا۔

☆☆☆

اس بات کو چھ سات ماہ ہی گزر رہے تھے۔ سیمیں حیات کے گھر گیٹ ٹو گیدر تھا۔ فروا اور سیمیں حیات نے قریبی غریب آبادیوں کی عورتوں کے لیے چھوٹے پیمانے پر کچھ فلاحی پروگرام تیار کیے تھے۔ اسی سلسلے میں اپنی مدد آپ کے تحت کام کرنے کے لیے کچھ خواتین مدعو کی جاتی تھیں۔ فروا نے زارا کو فون کیا تو فون پریا نے اٹھایا۔

فروا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے خیر خیریت پوچھی تو پریا جھجکتے ہوئے بولی۔

''آنٹی جی! میری طبیعت کچھ سیٹ نہیں تھی تو کل سے امی کی طرف آ گئی تھی۔''

''کیوں پریا؟ تم ٹھیک تو ہونا؟''

''آنٹی جی! ڈاکٹرز میری اس دوسری پریگنینسی کے Against ہیں پر خالد مان کر نہیں دے رہے تو..... تو بس اپ سیٹ ہوں۔'' اس کھوکھلی سی ہنسی نے فروا کو سوچ کی ایک گہری چپ میں اُتار دیا۔ پریا بولی۔

''امی واش روم سے آتی ہیں تو میں آپ کی بات کرواتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ پر اپنا بہت خیال رکھو پریا۔ ابھی تو مُنّی بہت مُنّی سی ہے۔ یقیناً ڈاکٹرز نے تمہیں ریسٹ بتایا ہوگا؟''

''جی آنٹی جی!'' پریا خوشدلی سے بولی لیکن فروا کو اُس کا لہجہ بہت بجھا بجھا سا لگا۔ زارا نے شام کو فون کیا تو قدرے چپ چپ سی تھی۔ اِدھر اُدھر کا حال احوال پوچھنے کے بعد بولی۔

''خالد نے تو ہمیں بہت ہی پریشان کیا ہوا ہے۔''

''کیوں خیریت؟'' فروا نے فکر مندی سے پوچھا۔

''ہاں! خیریت ہی سمجھو بس کہہ رہا ہے کہ بزنس میں بہت زیادہ نقصان ہو گیا ہے۔ اُسے پیسے چاہئیں اور وہ بھی بہت ہی بڑا منہ کھولا ہے۔ کہہ رہا ہے ارجنٹ پیسے چاہئیں کہ دوسری پارٹی نے اُس کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔''

''تو زارا! وہ اپنے گھر والوں سے بات کرے نا۔''

''اُف! بس کیا کیا بتاؤں فروا سمجھو پورے کا پورا ہی دھوکہ ہوا ہے ہمارے ساتھ۔ اندر خانے برادری کے لوگ ہی ملے ہوئے تھے۔ خالد وغیرہ کی سب گاڑیاں بھی مانگے تانگے کی تھیں جو چھ مہینے کے اندر اندر ایک ایک کر کے واپس ہوئیں پریا، گڑیا کے پیدا ہونے کے بعد واپس گھر گئی تو برائے نام ہلکا پھلکا زیور پڑا تھا۔ جو گہنے زیور انہوں نے ڈالے تھے وہ تو سارے کے ساتھ غائب تھے۔ پریا نے جب خالد سے بات کی تو پیار پچکار کر کے بات ختم کر دی کہ میں جلد ہی تمہیں دوگنا بنوا دوں گا۔ بس ضرورت پڑ گئی تھی تو امی سے لے گیا تھا۔''

''زیور اُس کی ساس کے پاس تھا؟'' دکھ میں ڈوبی فروا نے پوچھا۔

''ہاں!'' زارا مری مری آواز میں بولی۔

''اِدھر ایسے ہی رواج ہیں۔ اُس کے زیور میں بیس بیس تولے کے سونے کے کڑے بھی تھے پریا کی دادی کے، خاندانی پرانا زیور تھا وہ کہاں بنیں گے دوبارہ..... اوپر سے لڑائی جھگڑے علیحدہ، ابھی پچھلے دنوں گاؤں میں شادی تھی تو خالد پریا کو کہنے لگا۔

''پریا تم برقعہ اوڑھ کر گاؤں جاؤ گی۔ فلاں فلاں کی نظر بہت خراب ہے اور دوسرے تمہیں خود

بھی ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی واہیات عادت ہے۔'' پریا نے یہ الزام بھی سن لیا اور اُسے سمجھانا چاہا کہ اُسے برقعے میں اپنا آپ سنبھالنا دشوار ہوگا۔ وہ چادر لے کر تو جاتی ہے گاؤں۔ پر خالد کی وہی ایک رٹ، وہ بھی اس تنبیہ کے ساتھ کہ نقاب نہ اٹھے چہرے پر سے۔

''لو جی! اتنا فساد بڑھا کہ بات اُن کی اماں جی تک جا پہنچی۔ انہوں نے وہ فتوے جاری کیے کہ الامان! کہنے لگیں۔ تم کو اتنا نہیں پتا کہ اگر اللہ کے بعد سجدہ جائز ہوتا تو وہ شوہر کو کرنا ہوتا۔ تم اُس کی اتنی سی بات نہیں مان رہیں۔ تمہارے بسنے کے ڈھنگ نہیں بی بی! پریا نے اتنا کہہ دیا کہ'' اماں جی! پردے کو تو چادر بھی کافی ہے۔ آپ کو پتا ہے مجھے چلنے میں دقت ہوتی ہے میں نقاب کر کے کیسے چلوں؟ آدھے منہ پر چادر کر لینا میرے لیے آسان ہوتا ہے۔ وہ پہاڑی راستہ بھی اتنا اونچا نیچا ہے اگر......''

اماں جی تو دو ہتڑ سینے پر مارتی ہوئی بولیں کہ'' بس پھر ماں باپ کے گھر رہنا تھا نہ میرے ہڈ پیر سلامت بیٹے کی زندگی برباد کرنے کیوں چلی آئیں۔ تم شادی میں نہ جانے کے لیے یہ سب ڈھونگ کر رہی ہو۔ صحیح کہتا ہے خالد، پیچھے بلانا ہوگا کسی کو تم نے۔''

''اُف بس کرو زارا میرے سے اور نہیں سنا جائے گا۔ تم نے کیسے لوگوں میں پریا کو بیاہ دیا۔''

''میں نے تو بہت دیکھ بھال کر اُس کی شادی کی تھی۔ بس اس کے مقدر۔'' فروا کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

زارا پہلے ہی سسکیاں بھر رہی تھی۔

''اچھا! رونا تو بند کرو زارا! اللہ سے دعا کرو بس۔''

''روؤں نہ تو کیا کروں؟ میں اور چوہدری صاحب تو بہت پریشان ہیں۔ نذیراں کی بیٹی نازو کو ساتھ گاؤں بھیجا کہ خود برقعہ سنبھالے گی کہ بچی؟''

یہ قصہ اور اسی نوع کے قصہ ہائے جات آنے والے اگلے برسوں پر محیط ہوتے چلے گئے۔ اگلے برسوں میں جب پریا کی یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں ہوگئیں اور مسلسل جسمانی و ذہنی شکست و ریخت کے باعث وہ اکثر دنوں نہیں، مہینوں کے لیے وہیل چیئر پر رہنے لگی تھی۔ پھر دوائیوں اور علاج کا لامتناہی سلسلہ چل نکلتا۔ کتنے برس اس کاوش مسلسل میں گزر رہے تھے۔ گھر بسائے رکھنے کی کوشش میں، لیکن زارا بتاتی رہتی تھی کہ ان سب کے باوجود خالد کا رویہ بد سے بدتر ہوتا جاتا ہے۔ اُس کی جھگڑالو، شکی اور وہمی طبیعت نے آہستہ آہستہ پریا کے سارے ہی راستے بند کر ڈالے تھے۔ نت نئے الزامات اور نئے سے نئی مالی ڈیمانڈز کے باعث پریا نے اب زارا کی طرف آنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ وہی بے سروپا باتیں کہ ماڈرن عورتوں سے سیکھ پڑھ کر یہ اپنا گھر بسانا ہی نہیں چاہتی۔ ایسی باتوں کو کوئی کتنا ہی بے سروپا کہے پر......ان سے فاصلے ضرور در آتے ہیں۔

ثمیں حیات اور فروا سے بھی پریا کا ملنا ملانا تقریباً ختم ہوگیا۔ وہ دونوں ہی نہیں چاہتی تھیں کہ پریا اُن کے حوالے سے اپنے مسائل بڑھائے۔ ثمیں ویسے بھی زیادہ تر ابوظہبی رہنے لگی تھی اپنے شوہر کی پوسٹنگ کے بعد، ان سارے حالات کے تناظر میں ایک جمود تھا بلکہ نحوست! جو سارے رشتوں کو آلودہ کیے تھی کہ ایک صبح اطلاع آئی کہ چوہدری صاحب ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں داغ مفارقت دے گئے ہیں۔

ایک طویل عرصے کے بعد فروا زارا کے گھر پر تھی۔ وہ گھر جس کے اردگرد کی زیادہ تر زمینیں بک چکی تھیں۔ اور باہر برآمدے کے بعد بڑے لان کا ایک ٹکڑا بچا تھا جس کے بے ترتیب درختوں کے بیچ اُجاڑ گھاس کے خطے تھے۔ ماتم گزیدہ در و دیوار کے اندر باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ اندر کے ہجوم کے بیچ سر پر سیاہ سادہ چادر اوڑھے پریا بیٹھی تھی۔ سادہ زرد چہرہ اور سونی کلائیاں وہ چوہدری صاحب کی میت کے پاس ایک قدرے اونچے اسٹول پر بیٹھی تھی۔ تینوں بیٹیاں نیچے قالین پر آس پاس بیٹھی تھیں جن کی معصوم حیران نگاہیں پلٹ پلٹ کر اپنی ماں کو تکتی تھیں۔

پریا کی متورم آنکھیں اپنے باپ کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ پر ان متورم آنکھوں میں کچھ پرعزم سی پرچھائیاں ٹھہری تھیں جو کچھ زیادہ پرانی نہیں تھیں تو ذرا اجنبی لگتی تھیں۔

☆......☆......☆

چوہدری صاحب کے سوئم کے بعد زارا کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ فروا اس کے لیے سوپ اور کچھ کھانے بنوا کر لے گئی۔ اُس وقت زارا کمرے میں تنہا تھی۔ فروا نے تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''زارا! میں جانتی ہوں کہ یہ بہت پرسنل ہے لیکن...... پر، جب ہر بچی کی پیدائش پر پریا زندگی اور موت کے انتخاب میں مبتلا رہی تو میں نہیں سمجھتی کہ اب اس کو کوئی اور رسک لینا چاہیے۔ پہلے اچھا بھلا چلا کرتی تھی پر اب تو اٹھتی ہے چار قدم چلتی ہے اور پھر وہیل چیئر تھام لیتی ہے۔ میں تو ان کچھ دنوں میں اُس کو دیکھ کر بہت پریشان ہوگئی ہوں۔'' زارا تھکاوٹ سے بھرپور لہجے میں بولی۔

''کیا کریں؟ بیٹی کا گھر بسائے رکھنے کو ہر جتن کیا پر خالد تو کسی طرح راضی نہیں۔ خوش نہیں۔ حالانکہ پریا کی خالہ نے تو شادی سے پہلے ہنستے ہنستے اُسے اشارتاً بتا بھی دیا تھا کہ پریا ازدواجی تعلقات نبھا ہی لے تو بڑی بات ہے۔ ڈاکٹرز نے اسے انتہائی احتیاط بتائی ہے اور یہ بھی کہ ایک بچہ بھی ہو گیا تو غنیمت سمجھیں۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ فروا کہ تین بیٹیوں پر اللہ نے جان بخشی کی۔ پر اُس وقت تو یہ خالد کسی کی مان کر نہیں دے رہا تھا۔ ہر ایک کے پاؤں تک پکڑنے کو تیار تھا۔ بات بے بات کہتا۔ وعدہ کرتا ہوں اسے بہت سکھ چین سے رکھوں گا۔ اب نیت کے بھید تو مالک جانے۔ اب بیٹے کی رٹ پکڑے ہے کہ بس ایک بیٹا ہو جائے تو لے جا کر خود آپریشن کروا دوں گا۔''

فروا نے ایک گہری سانس بھری اور بولی۔ ''بے شک بیٹے بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنی بیٹیاں پر یہ سب تو اللہ کی دین ہے کہ وہ کس کو کس نعمت کے قابل سمجھتا ہے اور پھر یہ کہ سب کیس ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ پریا کے پہلے ہی سیزیرین ہو چکے ہیں اگر وہ مستقل طور پر خدانخواستہ کسی Disability میں چلی گئی تو؟ اور صاف بات یہ ہے کہ خالد کو خوفِ خدا نہیں ہے۔ خوفِ خدا کا تعلق عمر، ذات، قبیلے، مذہب عالم اور جاہل سے نہیں ہوا کرتا۔ بس یا تو یہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ میں سمجھتی ہوں تمہیں صرف اور صرف پریا کی ہیلتھ کے بارے میں فکر کرنا چاہیے باقی سب چیزیں ثانوی ہیں۔ کیا حالات ہو چکے ہیں اس لڑکی کے۔'' فروا فکرمندی سے بولی۔

''پریا پریشان بھی بہت رہتی ہے۔ کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں؟'' زارا نے امنڈتے آنسو اپنی ہتھیلیوں سے پونچھے اور بولی۔

''جہاں پریا رہتی ہے اُسی کالونی میں ایک لڑکی سے خالد کا چکر چل رہا ہے۔ جانے کب سے؟ پراب تو ایسی ڈھٹائی ہے کہ اُسے کسی کی پروا ہی نہیں۔ اردگرد کے خاصے لوگوں کو خبر ہے اس بات کی۔ پر دُکھ تو یہ ہے۔'' زارا ٹشو سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی بولی۔

''سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اتنے برس ایک اپاہج سے نباہ کیا وہ بھی تو ظرف ہے اس کا، پر اس ظرف کی بہت بھاری قیمت ادا کی ہے ہم نے۔'' زارا ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے بولی۔

''پیار ویار سب ڈھونگ ہوگا۔ نہ اس کے میکے آنے پر خوش نہ اُس کے فون پر بات کرنے پر راضی۔ بالوں کی ٹرمنگ تک کے لیے پارلر نہیں جانے دیتا اور جو وہ ذرا اصرار کرے تو وہ گندے الزامات لگاتا ہے کہ توبہ...... ہاں جب پیسہ چاہیے ہو تو گاڑی اِدھر سے منگوا کر اُسے بھیج دے گا کہ جاؤ کسی نہ کسی بہانے رودھو اپنے باپ کے آگے اور خالی ہاتھ نہ آنا۔ پریا تھوڑا سا بھی کچھ کہے تو کبھی لڑکیاں چھیننے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ کبھی پوری برادری میں شور کرتا ہے چوہدری جی کے کانوں تک یہ اڑی اڑائی بھی پہنچتی تو وہ جھٹ کسی زمین کے ٹکڑے کا سودا کرتے اور......'' زارا کا گلا رُندھ گیا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو زارا۔'' فردا گہرے دکھ سے بولی۔

''سچ کہہ رہی ہوں۔ چوہدری صاحب اِس لڑکی کے غم کو سینے میں دبائے اس دنیا سے چلے گئے۔ جانا تو سبھی نے ہے پر؟'' زارا آواز پست کرتی بولی۔

''خاموش رہوں تو علیحدہ بات ہے ورنہ دل کو پورا یقین ہے کہ انہیں پریا کے مقدر نے پچھاڑ دیا۔ اچھی بھلی صحت تھی اُس کی شادی کے وقت۔ نہ اور کوئی مسئلہ تھا نہ پریشانی۔ بس پچھلے برسوں سے اندر ہی اندر گھلتے رہے۔ اِدھر پریا کا سوچتی ہوں اُس کا باپ اُس کی ڈھال بنا تھا اب تک۔ کچھ نہ کچھ خالد کو لحاظ تھا ہی۔''

''نہیں تم ایسا نہ سوچو۔ اللہ بہترین کارساز ہے۔ پر دفع کرو ایسے آدمی کو۔ اپنے برادری کے لوگ اکٹھے کرو۔ پنچایت بٹھاؤ جو بھی تمہاری برادری کا طریقہ کار ہے۔''

''میں کیا کروں؟ تھوڑا سا بھی شور کرتی ہوں تو اُلٹا سب مجھے کوسنے لگتے ہیں کہ کیسی ماں ہو اپنے ہاتھوں بیٹی کا گھر اجاڑ رہی ہو۔''

''زارا......!'' فردا نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''پریا تمہاری بیٹی ہے۔ فیصلہ بھی تمہیں کرنا ہوگا۔ گھر مثبت انسانی رویوں سے بنا کرتے ہیں۔ ہٹ دھری، دھونس، حق تلفی سے دیواریں تو کھڑی رہتی ہیں پر حقیقتاً چھت نہیں ہوتی سر پر اور نہ قدموں تلے زمین، میں تو عام زندگی میں بھی دیکھتی ہوں زارا کہ کسی بھی کلاس کی عورت ہو اور خواہ مسئلے کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ سب کی زبان پر ایک ہی جملہ ہوتا ہے۔ عزت بچی رہے گھر بنا رہے۔ کسی کی جان کی اہمیت ہی نہ ہو جیسے۔ اسی سے پتا چلتا ہے کہ صدیوں سے رائج رواجوں کا کتنا اثر ہے ہم پر اور بدنیت لوگ اسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں صدیوں پیچھے، It Was All Planned کے آدھی آبادی ناکارہ رہے اور اُسے اِس استحصال کا عادی بنا کر معاشرے پر اپنی دھونس برقرار رکھی جا سکے۔ ورنہ وہ بے مثال مذہب کہ جس کے نام پر انسانیت کا کشت وخون ہو رہا ہے زرا اس کے ڈانڈے تھامے نہ ایک

نسل تو اگلی نسل کو کچھ سکون ضرور ملے گا۔ پر......
عورت کو اپنا اصل مقام حاصل کرنے میں تو شاید اتنی ہی صدیاں لگ جاتیں جتنی غلام بنانے میں لگیں کہ آزادی کے نام پر ہم سرحد تو پار کر آئے پر غلامی کے طوق بھی ساتھ ہی لے آئے پر وہ جو کہا ہے نہ کسی نے کہ If You Want To Make Your Dreams True, The First Theif To Do Is, Wake Up۔

اسی اثناء میں بیچ کا پردہ ہٹا اور بیٹی کا ہاتھ تھامے پریا اندر داخل ہوئی۔ اُس نے روتی ہوئی زارا کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور پھر فروا کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''فروا آنٹی! مجھے گزرے وقت نے سمجھایا ہے کہ جان ہوگی تو جہان بھی ہوگا۔ یہ کسی اور کو سمجھ آئے نہ آئے......اب مجھے اس سے غرض نہیں۔''
وہ بدقت فروا کے پاس صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''جس باپ کے شملہ نیچے ہونے کے خوف میں پوری برادری واسطے دیتی تھی وہ باپ ہی نہیں رہا تو وہ شملہ بھی نہیں رہا۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو پری؟ باپ مر بھی جائیں تو اُن کے شملے اونچے رکھنے ہوتے ہیں۔''
زارا اگر جدار آواز میں بولی۔

''ایسا ہی ہوگا۔'' پریا رُک رُک کر بولی۔
''پر میری زندگی کی قیمت پر نہیں......اب نہیں!''

''تو کیا کرو گی تم؟''

''کچھ نہیں کروں گی۔ بس بہتر صحت کے ساتھ زندہ رہنے کی کوشش ضرور کروں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔'' پریا سپاٹ آنکھوں اور سپاٹ چہرے کے ساتھ زارا کو تکتے ہوئے بولی۔ فروا سر جھکائے رنجیدہ بیٹھی تھی۔ اُسی وقت تین چار عورتیں کمرے میں داخل ہوئیں اور افسوس کے اظہار کو ایک آہ و بکا شروع ہوگئی۔ واویلا آسمان کو چھوتا تھا پر......آنکھیں تو سب کی خشک تھیں۔

☆......☆......☆

دو اڑھائی ماہ گزر رہے ہوں گے کہ ایک شام پریا کا فون آیا۔ فروا نے خیر خیریت پوچھی تو کہنے لگی۔

''بس خیریت ہی سمجھیں۔ آنٹی جی، اگر آپ آ سکتی ہیں تو آ جائیں میری طرف میں ذرا اپ سیٹ ہوں۔ ماما کی طبیعت پہلے ہی گڑ بڑ ہے میں ویسے بھی اُن سے یہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی میں خود آ جاتی، آپ کی طرف لیکن آج آنا ذرا مشکل ہے۔'' فروا تسلی سے سنتی ہوئی بولی۔

''پریا جانی! میں آنے کو تو آ جاؤں پر، خالد کو تمہارا ہم لوگوں سے میل ملاپ اچھا نہیں لگتا۔ اُسے پتا چلے گا تو وہ تمہیں ہی پریشان کرے گا۔''

''آنٹی جی! آپ کی بات ٹھیک ہے پر گاؤں میں فوتگی ہوئی ہے۔ وہ گاؤں گئے ہیں ڈرائیور اُن کے ساتھ ہے۔ لڑکیاں امی کی طرف ہیں وہ دو اڑھائی گھنٹے کے بعد ہی آئیں گی۔ بس وہ ذرا......'' پریا کی دبی دبی آواز بھرانے لگی۔

''اچھا! تم فکر نہ کرو میں آتی ہوں تھوڑی دیر تک۔'' فروا نے سوچ میں ڈوبے ڈوبے فون بند کیا۔ بالوں کو پونی ٹیل میں کرتے ہوئے ربڑ بینڈ چڑھایا۔ اس کے اندر انجانی سی گھبراہٹ تھی۔ اُس نے جلدی جلدی پانی کے چھینٹے منہ پر مارے اور تیار ہو کر باہر نکلی۔ باہر مغرب کا ملگجا اندھیرا شام کو اُداسی میں لپیٹے کھڑا تھا۔ فروا نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بے چینی سے باہر اندھیروں میں ڈوبتے گھنے درختوں کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس بھرتے

ہوئے سوچا اللہ کرے کہ سب خیر ہو۔
ابھی سوچوں میں ڈوبتے ابھرتے کچھ دیر بعد وہ پریا کے گھر کے سامنے تھی۔ اُس نے ڈرائیور سے کہا کہ اُسے ڈراپ کر کے وہ قریبی مارکیٹ چلا جائے اُس نے جب بلانا ہوگا تو وہ فون کر دے گی۔

پریا کے گھر کی نیچی چوڑی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے فروا کو لگا کہ اندھیروں میں چھپی آنکھیں اُس پر گڑی جا رہی ہیں اور وہ آنکھیں..... متکبر، بے حس اور سفاک ہیں۔ فروا نے سر جھٹکا اور پریا کا فون ملایا۔ وہ بولی۔

''آنٹی جی مین ڈور کھلا ہے آپ اندر آ جائیں۔'' پریا اندر لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔ فروا نے وہیل چیئر پر جھکتے ہوئے اُسے پیار کیا اور صوفے پر قریب ہی بیٹھ گئی۔ ماحول میں ایک عجیب بے اطمینانی سی ٹھہری تھی۔ حالانکہ سادہ سا خوبصورت لاؤنج اپنی تزئین و آرائش میں پریا کے ذوق کی نمائندگی کرتا تھا۔ اردگرد پر اٹھی اُس لمحے بھر کی نگاہ میں فروا کا دل چاہا کہ وہ بڑھ کر سارے پردے ہٹا کر کھڑکیاں کھول دے کہ باہر تو فضا میں بڑی تازگی تھی اور اندر دم گھونٹنے والا ٹھہراؤ تھا۔ پریا کا چہرہ عجیب انداز میں سوجا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سوجنے کی وجہ تو کثرتِ گریہ ہو سکتی تھی پر..... ایک آنکھ قدرے مختلف سی سوجی تھی اور اس کے ہونٹ ...... گال!! فروا نے دھیرے سے پوچھا۔

''پریا یہ تمہارے چہرے پر کیسی سوجن ہے؟ خیریت تو ہے تم ڈاکٹر کے کب گئی تھیں؟''
وہیل چیئر پر بیٹھی پریا ایک پرنٹڈ سی میکسی میں ملبوس تھی جس کے اوپر اُس نے چھوٹی سی چادر لی ہوئی تھی۔ پریا نے چادر ہٹاتے ہوئے میکسی کے دو بٹن کھول دیے اور میکسی شانے سے نیچے کر دی، کافی نیچے......

''اوہ! مائی گاڈ!'' فروا کے منہ سے بے ساختہ نکلا اس کے شانوں اور گلے کے نیچے گہرے نشان تھے جو سرخی مائل نیلوں کی شکل میں تھے۔ کچھ گہرے زخموں پر برنول نما دوائی لگائی ہوگی۔ جس نے شفاف شیشہ بدن پر ابھرے سرخ، نیلے سیاہ داغوں کو پیلاہٹ کی آمیزش دے کر انہیں مزید بھیانک بنا دیا تھا۔ پریا نے ایک نظر فروا کی پھٹی پھٹی آنکھوں کی طرف دیکھا اور سسکتے ہوئے بولی۔

''آنٹی جی ایسے بہت سے پرانے، نئے زخم میری انڈر لیگز اور Thighs پر بھی ہیں کہ اب کچھ عرصے سے خالد مجھے Sexually Abuse بھی کرنے لگے ہیں۔ انہیں پتا ہے نہ کہ میں تو تیزی سے Move بھی نہیں کر سکتی۔'' آخری الفاظ پریا کے حلق سے بمشکل نکلے۔

''تو...... وہ، وہ میری لاچاری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔'' پریا رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''پہلے پہل جب میں نے انہیں منع کیا تو کہنے لگے کہ یہ تو میرے پیار کا انداز ہے۔ جب انہوں نے روٹین ہی بنالی اور تکلیف میرے اختیار میں نہ رہی تو میں نے ان سے اس بات پر جھگڑنا شروع کر دیا۔ وہ تو جیسے اس انتظار ہی میں تھے۔ اتنی سختی سے بولے کہ پھر اب اگر تم سنو کہ میں دوسری عورتوں کے پاس جاتا ہوں تو گلہ نہ کرنا۔ آنٹی جی! ان بچوں کی پیدائش نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے۔ جب میں بالکل بے جان ہو جاتی ہوں تکلیف سے تو یہ مجھے زیادہ سے زیادہ..... اُف! آپ دیکھیں یہ میرا جسم، میرا چہرہ

.... میری آنکھیں..... یہ ذہنی مریض ہیں۔ آپ تو سمجھ رہی ہیں نہ میری بات، سارے پاگل، پاگل خانوں میں تو نہیں ہوتے۔'' بے تحاشا بہتے آنسوؤں کے باعث اُسے بات جاری رکھنا مشکل ہوگئی۔ فردا نے فرج سے پانی لاکر اُسے پلایا۔ وہ خود بھی ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ کچھ دیر میں پریا سنبھلی تو فردا نے اُس سے پوچھا۔

''تم نے زارا کو بتایا ہے اِس بارے میں؟''

''جی!'' پریا مایوسی سے بولی۔

''تھوڑا بہت بتایا ہے۔ بار بار کیا بتاؤں؟ وہ یا تو میرے زخم دیکھ کر پھر چپ چاپ بیمار پڑ جائیں گی یا ایک لمبی سوچ میں ڈوبنے کے بعد کہیں گی شاید بیٹا ہوجائے تو یہ سنبھل جائے۔''

''آنٹی جی! آپ یقین کریں میری بات پر کہ انسان بڑھاپے میں وہی ہوجاتا ہے جہاں سے اس کی Roots ہوتی ہیں۔ ماما پہلے بہت مختلف ہوا کرتی تھیں۔ اپنے خاندان سے، پر اب تو چوہدرانی اور زمینداری کے گیٹ اب سے باہر ہی نہیں نکل پاتیں۔ برادری کیا کہے گی؟ لوگ کیا سوچیں گے۔ اتنا بڑا نام باپ کا اور ایسی بے مقدری بیٹی کی۔ اور وہ احمد بھائی اور حامد بھائی، میرے تایا زاد..... وہ ماما کی ہمت توڑنے میں سب سے آگے آگے ہوتے ہیں۔ نظریں میری جائیداد پر رہتی ہیں اور زور آوری یہ کہ چپ چاپ بیٹھے اپنے گھر اور جو بھی حالات ہیں ان میں گزارا کرے۔ آگے اس کی تین لڑکیاں بیاہنی ہیں ہمیں۔ میں تو مان گئی ہوں آنٹی جی کہ جاگیردارانہ مائنڈ سیٹ بدلنا بہت مشکل ہے۔ نہ ایجوکیشن ان کا کچھ بگاڑتی ہے نہ زمانے کا چلن اور تربیت، یہ سب چیزیں عمر کے تھرٹی، تھرٹی فائیو تک ملمع کاری کیے رکھتی ہیں۔ بس پھر یہ ہوتے ہیں اور ان کی روایتیں، کسی کو میری کوئی پروا نہیں کہ میں کیسے جیوں؟ جیوں یا بے شک مروں بس ان سب کے نام پر دھبہ نہ بنوں۔ یہاں ریت رواج مذہب پر بھاری ہیں اور معاشرے میں رائج اقدار عورت کے حقوق پر۔ یہاں سب معاشرے کے غلام ہیں کیونکہ اس غلامی میں مرد کی سرداری قائم و دائم ہے۔ اس اسلامی جمہوریہ میں کسی بے بس، بے کس عورت کی فون کال پر کوئی ایک ادارہ حرکت میں آتا ہے؟ ایسے کہ Self Respect کے ساتھ اُسے باعزت تحفظ ملے۔ میں کسی خیراتی ادارے میں نہیں، اپنے گھر میں رہتے ہوئے محفوظ رہنا چاہتی ہوں۔ پتا نہیں ہم کس منہ سے یورپی اقوام کو برا بھلا کہتے ہیں جو ہمارے دین کے اصولوں پر چلتے ہوئے وقت پڑنے پر ''انسان'' کو بچاتے ہیں۔ مرد اور عورت کے قضیے میں نہیں پڑتے۔'' پریا سسکارتی ہوئی بولی۔

''آنٹی جی! میں مرنے سے پہلے جینا چاہتی ہوں۔''

''اُف! کیسی بات کرتی ہو پریا۔ تم جیو گی صحت اور تندرستی کے ساتھ۔'' فردا نے پریا کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''سچ کہتی ہوں آنٹی جی، اب مجھ میں ایسے جینے کی اور سکت نہیں۔'' پریا نے پاس پڑے پانی کے کچھ گھونٹ حلق میں اتارے اور بولی۔

''پچھلے دنوں ہاسپٹل آئی تو نازو کا بازو پکڑے پکڑے میں نے ہمت دکھائی۔ کورٹ گئی اور ایک نامور وکیل سے ملی اور اپنا سب مسئلہ بتایا۔'' وہ اپنا مومی ہاتھ گردن سے ذرا نیچے زخم پر رکھتے ہوئے بولی۔

''یہ والا بھی...... اور اُس سے پوچھا کہ

قانون میرے، بچاؤ کے لیے کیا کرسکتا ہے؟'' گھنٹہ بھر بٹھائے رکھنے کے بعد، اِدھر اُدھر سے کتابیں اٹھا کر ورق گردانی کے بعد وہی گھسی پٹی باتیں کہ خلع تو آپ لے سکتی ہیں۔ وہ تو زیادہ لمبا پراسیس نہیں ہوتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے مسائل بڑھ جائیں گے۔ کیونکہ آپ نے تذکرہ کیا ہے کہ آپ کی والدہ اور برادری بے شک آپ کو مرجانے دے گی۔ پنچایتیں بٹھاتی رہے گی پر علیحدگی نہیں کروائے گی۔ تو پھر آپ کے تحفظ کے بارے میں مسائل بڑھیں گے۔ کیونکہ آپ نے بتایا کہ آپ کے شوہر اوباش طبع آدمی ہیں یہاں......''

میں نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا کہ اوباش مرد کی بیوی ہی ریاست سے تحفظ مانگے گی نہ؟ جو اپنے گھر سکون سے ہو وہ باہر نکلے گی ہی کیوں؟'' کہنے لگا میں اسی طرف آرہا ہوں کہ خلع کا کیس درج ہوجانے کے بعد آپ کے درخواست دینے پر آپ کو پولیس پروٹیکشن مل سکتی ہے پر نظام کی بے قاعدگیاں آپ بھی آئے روز میڈیا پر دیکھتی ہوں گی۔ یہاں پورے کے پورے تھانے بکے ہوئے ہیں اور اکثر ایسے فیملی کیسز میں عدالت آنے جانے کے دورانیے میں دوسری پارٹی کرائے کے بدمعاشوں سے فریق ثانی کو نقصان پہنچایا کرتی ہے۔ جبکہ آپ پہلے ہی کچھ جسمانی مسائل کا شکار ہیں۔ خیر وہ تو آپ ذاتی گارڈز رکھ سکتی ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی کا تو آپ کے ساتھ ہونا ضروری ہے ورنہ اکیلے؟ خیر اس معاملے کو بھی ڈسکس کرلیں گے اگلی میٹنگ میں، میں فی الحال تو یہی کہوں گا کہ آپ اپنی والدہ یا برادری کی بڑی بوڑھیوں سے بات کریں وہ اس مسئلے کو آگے آپ کے شوہر کے بڑوں تک پہنچائیں کہ انہیں احساس دلایا جائے کہ یہ ازدواجی حدود کی پاسداری کریں۔''

''آنٹی جی! سننے میں تو یہ الفاظ بہت اچھے لگتے ہیں پر آپ بتائیں کیا یہ ممکن ہے کہ خالد جیسا انتہا پسند آدمی صرف لوگوں کے سمجھانے سے سمجھ جائے گا اور اوور ری ایکٹ نہیں کرے گا۔ خیر! ساری بے نتیجہ گفتگو کے بعد وکیل مجھ سے کہتا ہے ویسے جب وہ جنسی تشدد کرتے ہیں تو اس کے بارے میں آپ ذرا مجھے کچھ تفصیل بتائیں گی؟ آنٹی جی! سوال اتنا تلخ نہ ہوتا اگر یہ پوچھتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں ہوس بھرا شوق نہ دہک رہا ہوتا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

بمشکل اٹھی اور نازو کا ہاتھ تھامے باہر نکل آئی۔ باہر سورج دہک رہا تھا اور میرے زخم انگارے بنے جارہے تھے۔ پر وہ اُس وکیل کی آنکھیں؟ اُف! وہ دہکتے انگاروں پر تیل چھڑک رہی تھیں۔'' فروا نے بھیگی پلکوں کو جلدی جلدی جھپکاتو پریا بولی۔

''آپ پریشان نہ ہوں یہ سب سُن کر، جو میں نے جھیلنا تھا جھیل چکی یہ تو ایک واقعہ ہے۔ لیکن آنٹی جی! ابھی تو میں نے آپ سے کچھ اور بات بھی کرنا ہے۔'' فروا نے جھکی گردن کو ذرا اونچا کیا اور پریا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''میرا پریشان ہونا ایک فطری عمل ہے پر مجھے اللہ کی ذات پر پورا بھروسا ہے۔ تم بات کرو بیٹا کم ازکم سنا دینے سے کچھ بوجھ تو ہلکے ہوں گے۔ ٹھہرو! میں ذرا لاؤنج کی کچھ اور بتیاں بھی جلادوں۔''

''جی...... جی...... ضرور۔'' فروا واپس آکر پریا کے پاس بیٹھی تو وہ بولی۔

''خالد کے اکثر رات کو بھی فون آتے رہتے

ہیں۔ میں بچوں میں مصروف ہوتی ہوں تو یہ سامنے گیلری میں چلے جاتے ہیں۔'' پریا لاؤنج سے باہر اشارہ کرتی بولی۔ جہاں کھڑکیوں سے آگے کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔

بچیاں ہمارے ساتھ والے کمرے میں ہوتی ہیں۔ خالد بچوں کو کمرے میں پسند نہیں کرتے۔ بس فزا چھوٹی ہے بہت، وہ سو جاتی ہے تو میں اسے ساتھ والے کمرے میں لٹا کر آتی ہوں۔''

پریا بول تو رہی تھی پر ایسے کہ جیسے آواز نہ نکلتی تھی بس کانچ ٹوٹتا تھا اور بکھرتے کانچ پر اُس کی روح ننگے پاؤں چلتی چلی جاتی تھی۔ وہ گیلری کی سمت تکتے ہوئے بولی۔

''خالد رات کو باہر گئے ہوئے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ واپس آکر اس گیلری میں بیٹھے فون پر بات کر رہے ہیں۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور لاؤنج کی لائٹ بند تھی۔ سوا دو کے قریب فزا کو اس کے بیڈ پر لٹانے گئی تو مجھے گیلری سے ان کے دھیمے دھیمے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آواز آئی۔ دو تین بار اپنے نام کی تکرار سنی تو غیر ارادی طور پر کھڑکی کے قریب ہوئی۔ وہ کہہ رہے تھے جو کچھ میں اس کے ساتھ کر رہا ہوں نہ تم دیکھنا یہ جلدی ہی اپنی موت آپ مر جائے گی۔ اسے کہتے ہیں سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ایک دبے دبے قہقہے کے بعد کہنے لگے۔

''واقعی! میرے تو دونوں...... ہاں...... ہاں تینوں کام پورے پر یار یہ اس کے باپ کے مرنے کی تمہیں کیا فکر؟ تمہارا باقی قرضہ بھی اتار دوں گا۔ وعدہ...... وعدہ ہے۔'' آنٹی جی! وہ تو ابھی آگے بھی کچھ بولتے تھے۔ پر مجھے بہت تیز چکر آیا۔ اتنا تیز کہ مجھے لگا جیسے نیم اندھیرے لاؤنج میں پڑی سب چیزیں اوندھی ہو گئی ہوں۔ دھڑ تو نیم مفلوج تھا ہی سر پورا مفلوج ہونے لگا۔ میں بہت احتیاط سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بمشکل بیڈ تک پہنچی اور سوتی بن گئی پر، اُس روز سے جاگ ہی رہی ہوں۔ جس عورت سے ان کا افیئر چل رہا ہے۔ بس میں کیا ہی کہوں اس کے بارے میں پر اصل میں یہ اُسی کے لائق ہیں۔ اس نے صرف دولت کی خاطر مجھ سے شادی کا ڈھونگ رچایا۔ پر میں اس ڈھونگ کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔ خواہ مجھے اکیلے ہی یہ جنگ کیوں نہ لڑنی۔ پڑے اپنے آپ سے، اپنی برادری سے یا سوسائٹی میں رائج گھناؤنے رواجوں سے۔''

پریا گالوں پر بے اختیار بہتے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے بولی۔

''اپنے کانوں سے سب کچھ سن کر مجھ سے برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ خود کو کیسے سنبھالوں۔ یہی سوچا کہ آپ سے بات کر کے دل ہلکا کر لوں۔'' پریا سسکنے لگی۔ فروا نے اُٹھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگایا اور بولی۔

''پریا! رو نہیں چندا...... تم دیکھنا اللہ اور اُس کی رحمتیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ ان باتوں کی تفصیل میں جا کر میں مزید تمہارے زخم ہرے نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنے طور پر بھی کسی وکیل سے مشورہ کر کے تمہیں بتاؤں گی۔ مجھے یقین ہے اللہ کوئی نہ کوئی بہتر حل ہی نکالے گا۔ لیکن تم ڈاکٹر سے باقاعدہ علاج تو کر لو مطلب یہ زخم...... تمہیں باقاعدہ چیک اپ کرانا چاہیے۔''

''جی! پہلے تو کافی وقت میں خود ہی ٹریٹ کرتی رہی پر اب...... جاتی ہوں ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس۔''

''ہاں! اور دوسرے یہ کہ تم اپنی ہر بات مجھ سے بلا جھجک کر سکتی ہو۔ انشاء اللہ جو کچھ مجھ سے بن پڑا میں تمہارے لیے کروں گی۔ سیمیں یہاں ہے نہیں لیکن ضرورت پڑی تو اُس سے بھی مشورہ کریں

گے۔ اور میں زارا کو بہر حال سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ تمہیں یہ کہنا کہ تم فکر نہ کرو۔ ایک بے معنی بات ہو گی۔ پر، پھر بھی یہی سمجھاؤں گی کہ بجائے قسمت کو رونے کے، خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔''

''جی! میں باقاعدگی سے دوائیاں لے رہی ہوں۔'' پریا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ضبط گریہ سے اُس کی آنکھیں گہری سرخ ہو گئی تھیں جیسے اندر کے سارے زخم اُس کی آنکھوں میں سما گئے ہوں۔ فروا نے اُسے پیار کیا تو وہ ہولے ہولے کپکپا رہی تھی۔ فروا نے اُس کے منع کرنے کے باوجود فرج سے کچھ فروٹ نکالے اور فریش جوس بنا کر اُسے پلایا۔ کچھ دیر بعد جب پریا تھوڑا سنبھلی تو فروا نے جانے کی اجازت چاہی۔ جاتے جاتے بھی اُس نے دوبارہ پریا کو تاکید کی کہ کسی بھی قسم کی کوئی ضرورت ہو تو وہ اُسے بلا جھجک فون کر سکتی ہے۔

☆......☆......☆

اُس روز کے بعد سے فروا مسلسل پریا سے رابطے میں رہی اور اپنے طور پر جو بھاگ دوڑ کر سکتی تھی اُس نے کی۔ ایک دو مرتبہ زارا سے مل کر اُس سے بات کرنے اور سمجھانے کی کوشش بھی کی پر، اُسے افسوس ہوا یہ جان کر کہ پریا ٹھیک کہتی تھی وہی روایتی باتیں اور وہی روایتی سوچ جس میں گھٹ کر انسانیت مر چکی۔ ایک روز تو موقع پا کر اُس نے کھل کر کہا کہ زارا ابھی بھی تمہارے پاس اتنا بچا ہے کہ تم پریا کو اِدھر اپنے ساتھ سیٹل کر لو۔ پر اُسے تو علیحدگی کے تصور سے غش پڑنے لگے۔

فروا نے بہت نرمی سے سمجھایا کہ دیکھو ایک عورت کے لیے ایک پیار کرنے والے شوہر اور گھر گرہستی سے بڑھ کر بھلا کیا ہے؟ پر اگر کسی کی زندگی میں کوئی ایسا امتحان آ جائے تو؟ یہ پریا کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔'' زارا زچ ہو کر بولی۔

''میں نے کیا کیا برداشت نہیں کیا۔ پیسے والے مردوں کے رنگ ڈھنگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''سب پیسے والے مردوں کے نہیں زارا اور پھر پیسہ کون سا اپنا ہے۔'' وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔

''اب تین بچوں کے ساتھ دوسری شادی تو ہو نہیں سکتی؟''

''ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اگر نیتیں صاف ہوں تو...... ہم وہ قوم ہیں جو نہ گھر کے ہیں نہ گھاٹ کے۔ جن عربوں کے عبائے پہن کر سب اتراتے پھرتے ہیں انہی سے کچھ سیکھ لیں کسی قوم کی خوبیاں لینا تو ہم نے سیکھا ہی نہیں۔ یہاں منہ بھر بھر کر ان پر ہنستے ہیں کہ عیاش مرد ہمیں چار چار بیویاں اور ان کے سابقہ بچے لے کر ساحل پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ پر، کوئی ایک بھلائی اِدھر بھی تو ہو...... نہیں! جُبّے پہننے میں دکھاوا جو ہے اور بچوں والی عورت سے نکاح کرنے میں عمل...... خیر چھوڑو۔ تم ٹھیک کہتی ہو زارا کہ اچھا تو چوہدری صاحب نے بھی نہیں کیا تمہارے ساتھ۔

عورت کا دل ہی پیار سے خالی ہو تو بھرے گھر کا کیا کرنا ہے۔ لیکن تمہاری اپنی سوچ بھی مختلف نہ تھی۔ پریا کا رشتہ طے کرنے لگے پر تم صرف یہ سوچو کہ کسی بھی نوعیت کا شدید اسٹریس اُسے دائمی اپاہج پنے کی طرف لے جا سکتا ہے۔ میں تو تمہیں صرف یہ سمجھانا چاہتی ہوں۔'' زارا اُلجھ کر بولی۔

''ہاں فروا تو وہ اسٹریس نہ لے، سمجھے اس بات کو اور سمجھائے خود کو کہ اُس نے ایسی زندگی ہی گزارنی ہے تو سکھی ہو جائے۔ وہ اپنے حالات سے سمجھوتہ کیوں نہیں کرتی۔ چوہدری صاحب نے بھی تو......''

''وقت بدل گیا ہے زارا' ماننے نہ ماننے سے

فرق نہیں پڑتا۔ کچھ جاگ گئے ہیں باقی نصف صدی یا ایک۔ اور صدی، سوتے رہیں گے۔ جاگنا تو پڑے گا۔ دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے اور زمانہ جیسا بھی ہے وہ قانونِ فطرت کے تحت ہی ہے، میں نہیں سمجھتی کہ پریا کسی کمپرومائز کی پوزیشن میں ہے۔''

''ہائے! شودی دھبہ نہ لاوے چوہدری جی دے شملے نوں۔'' زارا گلزاراں بی دونوں ہاتھوں سے ماتھا پیٹ رہی تھی اور فروا بے بسی سے اُسے دیکھتی سوچ رہی تھی۔ شملہ تو داغ دھبوں سے آلودہ ہی ہے پر دیکھنے والوں کی نظریں معترض نہیں کیونکہ ان کی نظر میں وہ ایک بارسوخ مرد کے سر کی شان ہے اور مرد کے کردار کی برائی کو برائی سمجھا ہی نہیں جاتا۔ صدیوں پیچھے اس رجحان کو پھیلایا گیا۔ ذہنی طور پر اس روایت کو مقبولیت کی سند دی گئی جیسے ایشیا کی نصف آبادی آج بھی بھگت رہی ہے اور سب اس معاشرتی دھند لاہٹ میں گم، بھولی بسری اُس نور کی لکیر تک پہنچنے میں بے مراد ہیں جو کہتی ہے۔ ''تم میں سے بہتر صرف وہ ہے جو تقویٰ میں بڑھ کر ہے اور جس کے اخلاق بہتر ہیں۔''

☆......☆......☆

وقت گزرتا رہا، پریا کی کال آجاتی کبھی کبھار، دبی دبی سی بھاری آواز مستقل بھرائی رہتی پر اس کے پیچھے......''

کہیں بہت پیچھے، جینے کا عزم، کھنکتا تھا اور یہی عزم اُسے زندہ رکھے تھا۔

محرم کی چھٹیاں تھیں جب پریا ہوسپٹل میں تھی۔ چیک اپ کے لیے بھی اکثر جاتی رہتی تھی اور جب کبھی اسے انڈر آبزرویشن رکھنا ہوتا تو ایک دو روز اُسے رُکنا بھی پڑ جاتا۔ فروا کو پریا کی کال آئی۔ اپنی میڈیکل کنڈیشن بتانے کے بعد کہنے لگی۔

''آپ آسکتی ہیں تو آجائیں تھوڑی دیر میرے پاس کافی دیر سے اکیلی ہوں تو تھوڑا گھبرا رہی ہوں۔''

فروا نے اُسے بتایا کہ کچھ مہمان ہیں اُن سے فارغ ہوکر آسکتی ہوں پر وہ...... خالد صاحب کدھر ہیں؟'' پریا نے بتایا کہ وہ شہر سے باہر ہیں آپ آجائیں اور ویسے بھی مجھے اب کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کو کس سے میرا ملنا پسند ہے اور کس سے ناپسند۔ میں اتنے برس انہیں خوش رکھنے کی چاہت میں...... خیر چھوڑیں! آپ آرہی ہیں؟''

''اچھا چلو ٹھیک ہے فارغ ہوکر تھوڑی دیر تک آؤں گی۔''

مہمانوں کے جانے کے بعد وہ چیزیں ملازم کے ساتھ سمیٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ لوگ خوامخواہ اپنے رویوں کی رکاوٹیں کھڑی کر کے جائز کو بھی ناجائز بنا ڈالتے ہیں۔ طبعاً اُسے پریا سے محتاط ہوکر یوں چھپ کر ملنا عجیب ناگوار گزرتا تھا۔ پر وہ اسے تنہا ہی نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔

کہتے ہیں رائٹرز آرٹسٹس کی کوئی عمر نہیں ہوا کرتی یہ Soul Level پر چلتے ہیں۔ ان کی اکثریت عمر جنس اور ذات پات سے ماورا ہوتی ہے دنیا میں انہیں Over Sencetive کہتے، اکثر کنارے کر دیتی ہے۔ پر وہ انسان ہی کیا جو دوسرے انسان کے دکھ درد کو محسوس نہ کرے۔ اپنا درد تو جانور بھی محسوس کرلیتا ہے۔ ایک مشفق بزرگ رائٹر کے الفاظ ذہن میں گونجے۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے اُس نے فوراً گاڑی نکالی اور ہوسپٹل کی طرف چل دی۔

اسپتال کی مخصوص بو سے دھیان جھٹکتے اور تازہ سرخ پینٹ شدہ گملوں پر ایک ناگوار نظر ڈالتے ہوئے وہ کوریڈور میں مڑ گئی۔ سرخ پینٹ زدہ گملوں سے اُسے ہمیشہ، اپنے بچپن کے وقت کے اسپتالوں

میں پڑے لال کمبل یاد آجاتے تھے اور ابحد از اں منٹو کی سینی ٹوریم کی دکھی ناقابل فراموش کہانیاں......
اور بھلا درد، آزار اور دکھن سے لپٹی چیزوں سے بھی کبھی اچھی یادیں وابستہ ہوتی ہیں؟ فروا نے پریا کا نمبر ملایا۔ اس کا کمرہ قریب ہی تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے نکلتی مدھم روشنی بہرحال ایک امید کی مانند روشن تھی۔

''السلام علیکم!'' فروا نے بوکے پریا کی طرف بڑھایا۔ پریا کے چہرے کی طرف دیکھ کر اگر کوئی ایک لفظ بولنے کو کہتا تو وہ Fading Rose ہی ہوتا۔

''آنٹی جی! آپ ہر مرتبہ یہ پھولوں کا تکلف نہ کیا کریں۔'' پریا پیار سے فروا کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

Thanks For Coming Aunty, But Dont Worry

بس بہت تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔ وہ بھی گزر جائے گا پھر آپ دیکھنا میں تمام اذیتوں سے نکل جاؤں گی۔ انشاء اللہ کہ مجھے جینا ہے۔ جس حال میں مجھے اللہ نے پیدا کیا ہے کم از کم اُس حال میں۔ اس سے بدتر میں نہیں، جو صرف اور صرف اس کے بندوں کا پیدا کردہ ہے۔ نازو تم آنٹی کو چائے ڈال کردو۔''

''نہیں ......نہیں میں ابھی تو چائے پی کر آئی ہوں۔''

''Are You Sure?''

''ہاں...... ہاں بتایا تو تھا کہ مہمان تھے۔ بس انہی کے ساتھ دوبارہ چائے پی لی۔ تم ریلیکس کرو۔''

''اچھا! ٹھیک ہے نازو اب تم کچھ دیر باہر ہو آؤ بلکہ یہ پیسے پکڑو کینٹےٹیریا چلی جانا۔ آنٹی بیٹھی ہیں میرے پاس۔''

پریا نے سائیڈ ٹیبل سے کچھ پیسے اٹھا کر نازو کو دیئے۔ اُس نے پیسے چھوٹے سے پرس میں رکھے اور دوپٹہ مزید کس کر سر کے گرد لپیٹتی باہر چلی گئی۔'' پریا دبے دبے جوش سے بولی۔

''آج آپ کو بہت خاص باتیں بتانی ہیں۔''
اس کے چہرے کی زردی میں ڈوبی سوجی سوجی آنکھیں جگمگا ئیں وہ چہرہ جو کبھی ماہتاب کو مات کیا کرتا تھا۔

''کدھر سے شروع کروں؟'' خود سے بات کرتی پریا ایک سوچ میں گئی اور پھر فروا کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''اچھا پہلے آپ کو بتاؤں کہ جس دن بابا نے اپنی سب سے قیمتی پراپرٹی کو فروخت کر کے خالد کو پیسے دینے تھے نہ، اُسی روز اُن کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی جو میں سمجھتی ہوں کہ میرے دکھ میں پریشان ہوئے ہوں گے۔ بابا اسپتال جانے لگے تو انہوں نے روپوں والا بریف کیس مجھے پکڑا دیا۔ آنٹی جی! میں بابا کے سیف میں پیسے رکھ رہی تھی ناں تو بس ایسے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ جیسے......
جیسے یہ میرے نیم مفلوج دھڑ کی قیمت ہے جو میرا باپ چکا رہا ہے۔ ایسے ہی بس بالکل غیرارادری طور پر میں نے اُس میں سے پانچ ہزار روپے نوٹوں کی کچھ گڈیاں نکال کر علیحدہ رکھ دیں۔ نامعلوم کیوں؟ اور ابھی اس گزرتے سال نے بتایا ہے کہ میرا وہ فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔ خالد دونوں ہاتھوں سے ہمیں لوٹ رہے تھے اور چپکے چپکے بابا کو نجانے کیا کھلواتے تھے کہ وہ چپ چاپ جا کر نسلوں پرانی پراپرٹی کھڑے کھڑے بیچ آتے۔ پر بابا کی بند ہوتی آنکھوں نے میری آنکھیں ضرور کھول دیں۔ جب بابا کی زندگی میں بھی پراپرٹی بکتی تو میں ماما سے کہا کرتی تھی کہ خالد کو اصل رقم کے بارے میں نہ بتایا کریں۔ پچھلے دنوں اسی گرتی پڑتی حالت میں، میں

۔ نیز باقی کی پراپرٹی بھی اپنے نام کروالی ہے۔ ذہنی، جذباتی، مالی اور جسمانی لحاظ سے یہ سب آسان نہ تھا پر کاش! خالد ایسے نہ ہوتے۔''

پریا نے لیٹے لیٹے سفید چادر تلے مزید کھسکتے ہوئے کہا۔ اُس لمحے اُس کی متورم آنکھیں کسی بے چین جھیل جیسی تھیں۔ وہ دھیرے سے بولی۔

''اس گزرتے سال میں، میں نے بہت سی رقم محفوظ کرلی ہے۔ جب خالد مزید سے بھی مزید تر کی ڈیمانڈ پر اترتے ہیں تو بھی کتنی ہوں کہ بہت سے پیسے میرے علاج پر لگ گئے۔ جب عادت شور مچانے کی ہو پر اب میں پر بستر میں نہیں آتی۔ آپ دیکھنا میں نے ان کی پہنچ سے عنقریب دور چلے جانا ہے بہت... دور!''

''کیا مطلب؟'' فروا نے چونک کر کہا۔ پریا نے ایک گہرا سانس لیا اور ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

''میں نے بہت سوچا اور اب ان سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جب میری زندگی کے لیے کوئی سوچنے والا نہیں تو ... تو مجھے بھی سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ جان پر بنے تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔ میں تو پھر......'' پریا سسکنے لگی۔ فروا نے بمشکل اُسے چپ کروایا۔ وہ ذرا سنبھلی تو بولی۔

''آنٹی جی! مجھے عمر ملا تھا۔ عمر کا پتا ہے نہ آپ کو؟ ''پریا کے کملائے چہرے پر ایک بھولی بسری مسکراہٹ بکھری اور بولی۔

''وہ، جو ترنگ میں ہوتا تھا تو کہا کرتا تھا 'عشق ہے پروا کرنا' وہ ملا تھا مجھے، اسی اسپتال میں۔'' پریا بھاری پلکیں اٹھائے کھڑکی سے باہر بکھرے اندھیروں میں نجانے کیا کھوجتی ہوئی بولی۔

''وہ جو پہلے اُن موسموں میں ملا تھا جب لمبی دُموں والے رنگین پرندے نیلے شفاف پانیوں میں اپنی چونچیں ڈال ڈال کر سیراب ہوتے تھے اور ہم کنارے لگے، دم سادھے انہیں تکا کرتے تھے۔''

فروا کی آنکھوں میں اٹھتے سوالیہ تحیر کو دیکھ کر بولی۔

''نہیں...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ جو بہت سی آباد بستیاں اپنے منہ زور ریلوں میں بہائے تنکا تنکا کر چکا ہے۔ وقت نے کس کا انتظار کیا۔ اُس کی شادی کو بھی کافی وقت گزر چکا ہے۔ اُس کی بیوی اسی اسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ وہ جب نئے زخم نہیں آتے تھے، دکھ درد اور...... وہ جھاڑا تو میں اسپتال آتی تھی۔ ایک روز کار پارکنگ میں پہنچ کر ناز وہ میری ہیل چیئر چوری کے قریب کھڑی کر کے ذرا ڈیوٹی کو دیکھنے چلی گئی۔ قریب سے سلام کی آواز آئی اور میرے جواب سے پہلے کسی نے ہولے سے سرکا کے میری ہیل چیئر چھاؤں میں لگادی۔ میں نے ذرا پلٹ کر دیکھا وہ عمر تھا جو ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ پہلے تو ہنستے ہنستے مجھ سے ملا پھر ذرا حیرت میں پٹی سے باہر خون رستا دیکھ کر اُس نے بے ساختہ چادر کے کھردرے کنارے زخم سے پرے کردیے۔ اُس گھڑی، اُس لمحے بے اختیار میرے دل سے نکلا۔

''رفوگر دھیان سے...... یہ زخم خنجر کے نہیں۔''

فروا کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ پریا دھیمے سے بولی۔

''محبت ختم ہوجائے یا ختم کرنی پڑجائے تب بھی کہیں نہ کہیں کوئی نرم گوشہ تو باقی رہتا ہے۔ کوئی مانے نہ مانے وہ علیحدہ بات ہے۔ وہ اپنی بیوی کو پک کرنے آیا تھا۔ جب وہ پارکنگ میں آئیں تو وہ میری ہی ڈاکٹر تھیں۔ ڈاکٹر سارہ! عمر نے تعارف کروایا تو مسکراتے ہوئے بتانے لگیں کہ وہ مجھے پہلے سے جانتی ہیں یہ آتی جو رہتی ہیں اسپتال۔ جب وہ یہ بولیں تو عمر نے اس گھڑی مجھ سے آنکھیں

چرالیں پر میرے، جو زخم مندمل بھی ہو گئے تھے وہ بھی، ہرے ہرے سے ہو گئے۔ انسان ایسا ہی ہے۔ کتنا مضبوط بن جائے ایک گلیشیئر کی طرح جما کھڑا ہو۔ اندر ہی اندر جانے کب؟ کہاں؟ برفیں پگھلیں اور جھیلیں بہنے لگیں۔ کب کیا ہو، کسے معلوم۔'' پریا نے ایک گہری سانس بھری اور بولی۔

''عمر کا فون آیا تھا مجھے بعد میں۔ اُس نے بتایا کہ سارہ نے اُسے میری تمام ہسٹری بتائی۔ بس ہمت بندھاتا رہا میری اور میں اپنے آنسوؤں کی بارہ دری میں کھڑی نمکین پانیوں میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ بعد میں بھی کبھی کبھار رابطہ ہوا تو ایک روز پوچھنے لگا کہ کیا میں تمہارے لیے کچھ کرسکتا ہوں۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''میں جانا چاہتی ہوں یہاں سے دور...... بہت دور......!'' وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''تم تو کینیڈین نیشنل ہو۔ تمہیں کیا فکر؟ یاد ہے جب تم یورپ کا ٹرپ کر کے آتی تھیں تو ہم سب نے کتنا رشک کیا تھا۔ اُس وقت تو کوئی، کوئی ہی یورپ جایا کرتا تھا۔'' میں بولی۔

''ہاں مجھے یاد ہے۔ سب یاد ہے اور میں نے جب بھی کہا تھا ماما اور بابا کے بارے میں کہ یہ بھلے یورپ گھوم لیں، کینیڈین نیشنلٹی لے لیں۔ بیس بیس تولے سونے کے کڑے اور ست لڑا ہار سے آگے کی نہیں سوچیں گے۔'' وہ ہنسنے لگا اور بولا۔

''تو تم آگے چلی جاؤ اب تو فاصلے ویسے بھی سمٹ گئے ہیں۔'' میں بولی۔

''سوچتی تو ہوں کہ میں جاسکتی ہوں پر اتنے برس کی قید تنہائی نے سوچوں، ارادوں کو زنگ آلود کردیا ہے۔ خود کو بھلا ہی بیٹھی ہوں بس اکیلے حوصلہ نہیں پڑتا کہ چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے دور دیس میں اکیلے...... سب کچھ کیسے کرپاؤں گی؟ ابھی تو بابا کی ڈیتھ کے بعد پھر بہت سنبھال لیا ہے خود کو لیکن......!''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اب تو وہی اکیلا ہے جو اکیلے رہنا چاہے۔ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ انٹرنیٹ سے پل پل کا ساتھ ہے۔ خیر! تم سوچ لو۔ احمد سے بات کرتے ہیں اب تو اُسے کینیڈا گئے بارہ تیرہ سال ہو گئے ہیں۔ وہ بہتر گائیڈ کردے گا تمہیں۔'' بس اسی بات سے سلسلہ بنا ہے۔ احمد بھی ہمارا کلاس فلو تھا اُس کے ابو بیرسٹر ہیں اِدھر اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔ بعد میں عمر نے مجھے اُن کے پاس بھیجا تھا۔ بلکہ عمر اتنا اچھا ہے آنٹی جی کہ اُس نے ڈاکٹر سارہ کو میرے ساتھ بھیجا تاکہ وہ انہیں پراپر طریقے سے کیس خود سمجھا سکیں۔ بیرسٹر صاحب نے مجھے بہت تسلی دی ہے۔ ابھی ہم صرف ایک پوائنٹ پر رُکے ہوئے ہیں کہ میں پہلے کینیڈا چلی جاؤں اور کچھ عرصے بعد واپس آکر خلع اپلائی کروں یا پہلے اِدھر بیرسٹر صاحب کے گھر شفٹ ہوجاؤں اور خلع لے کر ہی کینیڈا جاؤں۔ اُن کا بہت اثر ورسوخ ہے۔ گھر پر بھی گارڈز وغیرہ رکھے ہوئے ہیں ورنہ بھلا اس سوسائٹی میں مجھ جیسی عورت کی کیا بساط؟ تو آنٹی جی! میں عنقریب کینیڈا چلی جاؤں گی۔ ہمارے علاقے کی روایتی زبان کے مطابق بھاگ جاؤں گی۔ ویسے، ایک نیم اپاہج عورت کے ساتھ بھاگنے کا لفظ کیسا لگے گا پر یہ سب لگائیں گے اور خالد؟ وہ مجھ پر اتنے اتنے بھیانک الزام پہلے ہی لگا چکے ہیں کہ مجھے اب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے لگا۔'' پریا نے آخری جملہ ایک ٹھہراؤ میں کہا تھا۔ ''میں نے سوچ لیا ہے اور پکا فیصلہ کرلیا ہے۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''اجنبی منظر اجنبی لوگ جنہیں میرے نیم مفلوج دھڑ کو کیش کروانے کی کوئی خواہش نہیں

ہوگی۔ اب میری بیٹیاں میری چیخوں پر اپنے کانوں پر ہاتھ نہیں رکھا کریں گی۔''

''اور زارا؟'' دُکھ میں ڈوبی فروا کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''خدا چھوڑ جاؤں گی اُن کے لیے۔ آ جائیں گی کچھ عرصہ رونے پیٹنے کے بعد میرے پاس، ورنہ ہر وقت نگہت آنٹی مارکہ عورتوں میں گھری تو رہتی ہیں۔''

''ہاں بچے! لیکن؟'' آنٹی جی آپ نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ بس ذہن میں اٹھتے کب؟ کیوں؟ کیسے؟ کو دفعان کر کے سب اللہ پر چھوڑ دیں میری طرح۔ ویسے آپ کی تسلی کو بتاؤں احمد نے سب ارینج کر دیا ہے زیادہ چانس اسی بات کا ہے کہ میں یہاں سے ڈائریکٹ کینیڈا کے لیے نکلوں۔ ہماری غلام روحوں پر گوروں کا رعب تو ہے نہ؟ اسی کارڈ کو چلنا چاہیے۔ پر ابھی بیرسٹر صاحب فائنل بات کریں گے۔ ویسے احمد نے ایک مضافاتی علاقے میں اپارٹمنٹ لے لیا ہے بلکہ نیٹ پر مجھے دکھا بھی دیا ہے۔ بس آنٹی یہ سب عمر اور سارہ کی محنت سے ہوا ہے۔ اللہ کرے گا انشاء اللہ آگے بھی بہتر ہوگا۔'' فروا کو فکر مند دیکھ کر پریا اُس کے ہاتھ تھامتی ہوئی بولی۔

''یہ فیصلہ آسان نہیں تھا آنٹی جی! پر میری زندگی کے بارے میں عملی قدم اٹھانے والا کوئی ایک بھی نہیں تھا۔ صرف تنہائی ہوتی تھی، خوف ہوتا تھا اور زندہ رہنے کی تگ و دو، میں سمجھتی ہوں جان سلامت ہوگی تو ایمان بھی سلامت رہے گا۔ دیکھ لیا ہے میں نے دین والوں کو بھی اور دنیا والوں کو بھی۔ اپنے بے مثل و بے مثال دین کی بدترین شکل دیکھنی ہو تو اس وقت کوئی ہمارے خطے میں دیکھے یا کسی مصیبت زدہ سے پوچھے تمہیں واعظ درکار ہے ہے کہ عملی مدد؟ اور یہ تو پیسہ پاس تھا تو عملی مدد میں بھی آسانی ہوئی ورنہ؟'' تکنی سے سر جھٹکتی پریا کی پلکیں نم تھیں۔

''اُف! تم کن کن مرحلوں سے گزریں پریا۔ اللہ پاک تمہیں ہمت اور آسانیاں دیں۔ سب ٹھیک ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جسٹ ریلیکس!'' کچھ دیر بعد پریا سنبھلی تو فروا بولی۔

''پچھلے ہفتے ابو ظہبی بات ہوئی تھی سیمیں سے اس ٹاپک پر، وہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ ہمارے ادھر جو لڑکیاں قسمت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں اُن کے پہلے دس بارہ سال تو اسی بہکاوے میں رکھ کر تباہ کردیں گے کہ ٹھیک ہو جائے گا۔ سنبھل جائے گا۔ میں نہیں سمجھتی کہ فطرت بدلتی ہے ہاں! کوئی معجزہ ہو جائے تو علیحدہ بات ہے اور اُن جیسے صبح کے بھولے، شام کو گھر لوٹ بھی آئیں تو بھولے ہی کہلائیں گے۔ اُن کی بھول میں عورت کن کن بھول بھلیوں کی بھینٹ چڑھتی ہے اس کا ازالہ ہو جانا ہے اُن کے شام کو لوٹنے سے؟''

''سچ کہتی ہیں آنٹی جی' آپ کا فون بار بار بلنک کر رہا ہے آپ پلیز اٹینڈ کریں۔ اور یہ اس ڈائری میں اپنا پوسٹل ایڈریس لکھ دیں ذرا۔ میں جانے سے پہلے کسی دوسرے نمبر سے آپ کو کال کر دوں گی۔'' فروا ڈائری میں ایڈریس لکھنے لگی۔ اُس کا فون پھر بجا اُس نے رُک کر مختصر بات کی اور بولی۔

''گھر سے فون تھا اب، احسان پوچھ رہے تھے اتنی دیر کیوں لگا دی ہوسٹل میں؟ پریا جانی تم میرے گلے لگ جاؤ بس اٹھو نہیں ایسے ہی بیٹھے بیٹھے۔'' فروا نے اسے اپنے ساتھ لگاتے پیار سے بھینچا اور دھیمے سے بولی۔

''تم ہمیشہ میری دعاؤں میں رہتی ہو اور رہو گی بہادر لڑکی۔'' اُس نے پرس میں سے کچھ پیسے نکالے۔ پریا کے سر پر وارے اور اس کے تکیے کے

نیچے رکھتے ہوئے بولی۔
''اپنے ہاتھ سے کسی کو دے دینا۔''
''یہ سب بہت زیادہ ہیں آنٹی۔''
''Please Be So Care Full۔'' فروا ان سنا کرتی فکرمندی سے بولی۔
''جی! میں آپ سے بھی کہنے والی تھی کہ آپ بھی محتاط رہیے گا۔ میں کسی وقت، کسی طریقے سے دو بڑے بوکسز آپ کی طرف بھجوادوں گی۔ پھر ہو سکتا ہے بیرسٹر صاحب کے گھر سے، بعد میں کوئی لینے آجائے۔''
''نو پرابلم!'' فروا نے پاس پڑے قرآنِ پاک سے اُس کو ہوا دی اور اُس کا ماتھا چومتی خدا حافظ کہتی باہر نکل آئی۔
اُس کے قدم بھاری تھے اور آنکھیں نم اُسے پتا تھا پریا بھی رو رہی ہوگی۔ فروا نے اپنے چہرے سے آنسو صاف کیے اور گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ قریبی جھاڑیوں کے نم اندھیرے سے جگنوؤں کا قافلہ نکلا اور اجنبی سمت میں روانہ ہوگیا۔

☆......☆☆......☆

دواڑھائی ماہ کے بعد فروا کو D.H.L سے ایک لفافہ موصول ہوا۔ اُسے کھولا تو پریا کی تحریر تھی۔
''آنٹی جی! میں بخیریت پہنچ گئی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے سب کچھ اُسی بہترین طریقے سے ہوگیا جیسے سوچا تھا۔ میں یہاں محفوظ ہوں۔ ہم خوش ہیں، بہت سکون سے عافیت تو ہے ہی اور ہاں! بہت سبزہ ہے۔ جھیل کے پاس جہاں میرا گھر ہے۔ مجھے جھیل کنارے ہی رہنا تھا کہ کسی ایک وقت کچھ رنگین پرندے اپنے موسموں سمیت میرے اندر اتر گئے تھے۔ اور سب سے بڑی بات کہ اس سبزے پر گھنٹوں آنکھیں موندے بیٹھے رہو اکیلے، بلکہ لیٹے ہی رہو تو کوئی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ ہم دوسری نگاہ جھکنے کے منتظر ہیں صدیوں سے اور یہاں...... آپ ہنس لینا اس بات پر کسی کو کہنا نہیں کہ شخصی آزادی؟ اس لفظ سے دانستہ نصف آبادی کو ناآشنا رکھا گیا ہے۔ ہاں! کبھی جو وطن کی مٹی کی خوشبو یاد آنے تو اُس کے باسیوں کے لیے گنگناتی ہوں۔

انہیں ان واہموں میں رہنے دو
وہ ہمارے سر کے کاسے چور کردیں
بجا
وہ ہماری ہڈیوں کو سرمہ بنادیں
درست
مکتبوں اور عبادت گاہوں کے ذریعے
وہ ہمارے نوخیز ذہنوں کو
گمراہ بنادیں
تسلیم
لیکن
ہمیں یقین ہے
کہ ہمیشہ کے لیے روتے رہنا
ہمارا مقدر نہیں
(افریقی گیت کا ترجمہ)

آنٹی جی! میں اور بچے تھوڑے اور سیٹل ہوجائیں تو میں انشاء اللہ احمد کے ساتھ مل کر ایک فلاحی تنظیم بناؤں گی۔ بابا کے نام سے اپنے وطن کی اپاہج بے سہارا لڑکیوں کے لیے۔ اُن لڑکیوں کے لیے جن کے باپ اُن کے لیے وراثت بھی نہ چھوڑ سکے۔ بابا نے ماما کے ساتھ جتنا، جو برا کیا اس سے کئی گنا میرے مقدر کی شکل میں جھیل لیا۔ جو جائیداد بنا کر میرا بھلا کیا اب اُس کا اجر بھی پالیں گے کہ صوفیاء کی تعلیمات میں یہی لکھا ہے کہ ''دنیا گنبد کی آواز ہے۔''

☆☆......☆☆

افسانہ

مینا تاج

کباڑی کی جورو

''ہیں اتنی ٹیپ ٹاپ بنی سنوری۔ ایک ہم ہیں جیسے بھی حلیے میں چل پڑتے ہیں۔ بھاگم بھاگ ہے اپنی زندگی، سنورنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔'' ''کیا بکواس ہے یار، کچھ بھی کرلے۔ رہے گی تو کباڑی کی ہی بیوی نا۔'' ''کھی کھی...... مشترکہ ہنسی نے صغریٰ کو......

کئی دنوں کے حبس کے بعد مینہ برسنے نے ماحول میں ٹھنڈک اور سکون بسا دیا تھا۔ پر گھٹا ٹوپ اندھیرے اور جھینگر کی جھائیں جھائیں، مینڈک کی ٹرٹراہٹ نے سارا دھیان اپنی طرف لگا رکھا تھا۔

توبہ ہے اب ذرا گرمی سے نجات ملی تو اس شور نے دماغ بجا رکھا ہے۔ صغریٰ دماغ تو تیرا اب بجے گا جب قدیر نال اُس کے گھر جائے گی۔ ساری اکڑ دھری رہ جائے گی۔ جو بڑا اتراتی پھرتی ہے نا پنج جماعتاں پڑھ کر، صغریٰ سے بڑی نذیراں نے اپنے ایک سالہ پہلوٹھی کے بچے کو گود میں چڑھاتے طنز کیا۔

''اری اتار اسے تو پیٹ سے ہے۔'' صغریٰ کی ماں نے گڈو کو نذیراں کی گود میں چڑھتے دیکھ کر ٹوکا۔

''اماں اس کا پیٹ تو ہمیشہ ہی بھرا رہتا ہے۔''

''چپ کر بے شرم کنواری لڑکی ہو کر ایسی بات کرتی ہے۔ کسی نے سن لیا تو......''

''کہہ لینے دو اماں اب اس کی بھی باری آنے والی ہے۔''

''کیوں ڈرا رہی ہے اسے اپنے چاچے کے گھر ہی تو جا رہی ہے بیاہ کر، ہونہہ تو میں بھی تو ماسی کے گھر گئی ہوں کسی غیر کے گھر نہیں۔ ہائے سارا دن ماسی اور اُس کے بچوں کے لیے مشقت کروں اور رات میں شوہر کے ساتھ کسرت۔

''کھی کھی اور اس کے نتیجے میں یہ بھرا پیٹ۔''

''صغریٰ اب کی بار کچھ بولی تو بھول جاؤں گی کہ تجھے تین روز بعد رخصت ہونا ہے۔ دو ہاتھ لگاؤں گی۔''

''اچھا ہوا اماں ابا جی نے آگے پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ تین سالوں سے گھر بٹھائے رکھا پر......''

''پر کیا اب میں قدیر سے کہوں گی وہ مجھے آگے پڑھائے گا۔''

''ہاہاہا جھلی ہے تو صغری وہ تو تجھے کچھ اور ہی

پر چل پڑی۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ کھیتوں سے کام کاج کی واپسی پر گھر پر صغریٰ نام کا کھلونا قدیر کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اور اس کھلونے سے کھیلتے کھیلتے ایک نئے کھلونے نے اپنی آمد کی اطلاع دی۔

گھریلو کام کاج سے منہ موڑتے پلنگ پڑے رہنے کا نادر موقع پورے دس مہینے دس دن پر محیط رہا۔ اُس کے بعد بھی ننھے کھلونے کا بہانہ وقتاً فوقتاً کام کاج سے مکتی دلانے کا سبب بنتا رہتا۔

سال گزرنے نہ پایا تھا کہ پھر ایک نئے پودے کی آمد نے کروٹ لی۔ پر برسات کے نہ ہونے کے سبب زمینوں کو خشک سالی کا مہینہ دیکھنا پڑا۔

گھریلو زرخیزی اور مالی خشک سالی کے درمیان جھولتے صغریٰ نے قدیر کو کوچ کرنے کا مشورہ دے ڈالا۔

والدین کی اجازت ملتے ہی قدیر نے کراچی کے لیے رختِ سفر باندھا۔ جہاں اس کے دور کے چچا اپنے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔

☆......☆......☆

اسٹیشن پر گاؤں بھر کے لوگوں کا ہجوم لگا تھا۔ قدیر اور صغریٰ پر اپنی اپنی نصیحتوں کا پلندہ ڈالتے شہر کی رنگینیوں میں گم نہ ہونے کی تاکید بھی جاری کیے ہوئے تھے۔

ٹرین کے آتے ہی مختصر سا قافلہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہوا۔

''کی سوچ رہی ہے صغریٰ؟'' بیٹی کو صغریٰ کی گود میں ڈالتے قدیر نے پوچھا۔

''کی سوچنا ہے کراچی کا آرام، رونق، اور سکون ہی سکون۔'' کینٹ اسٹیشن پر معمول کا رش تھا۔ مسافروں کی دھکم پیل کے درمیان قدیر صغریٰ اور بچوں کو گھسیٹتے باہر نکلا۔ جہاں اپنے دور کے رشتے دار چاچا فضل جو کہ حالات کے پیش نظر سب سے قریبی رشتے دار بن بیٹھا تھا۔ گرمجوشی سے ملتے عزت و مرتبہ کے اعلیٰ سنگھاسن پر بٹھائے سر جھکائے مظلوم رعایا کی صورت لیے اپنے کنبے کے ساتھ کھڑا۔ گاؤں کی بدحالی اور اپنی مفلسی کا حال مختصراً بیان کر ڈالا۔

''کوئی گل نئی پتر...... چل باقی گلاں گھر وچ کرینگے۔'' مین روڈ سے ٹیکسی سے اتر کے چاچا کی ہمراہی میں خوبصورت بنے گھروں سے گزرتے ایک زندگ آلود لوہے کے بڑے سے گیٹ کے آگے چاچا رُک گیا۔ جس کا صرف ایک چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ آمد و رفت کے لیے۔

صغریٰ حیرت زدہ سی ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ رستے میں گزرتے اتنے گھروں کے درمیان جانے چاچا کا گھر کون سا ہوگا پر یہاں تو......''

بڑے سے پلاٹ پر قطار در قطار کپڑوں اور چٹائی سے بنی جھگیاں، غلیظ اور ننگے بچے آس پاس بیٹھی عورتوں کے درمیان بیٹھے روٹی کھانے میں مصروف تھے۔ جو روٹی کھانے کے قابل نہ تھے وہ ماں کی چھاتی سے، مریل وجود سے اپنی غذا حاصل کرنے کی ناکام کوشش میں لگے تھے۔ کونے میں بیٹھے مردوں کے ٹولے بیڑی سے لطف حاصل کر رہے تھے۔ جو ماحول کو کسیلا کرنے کے لیے کافی تھا۔

''او سکینہ اِدھر کو آ...... دیکھ مہمان آ گئے۔ چاچا کی آواز پر ایک چٹائی سے بنی جھگی سے چاچی سکینہ اپنے وجود کو دھکیلتے باہر آئی۔ صغریٰ اور بچوں کو پیار کر کے قدیر سے گاؤں کی روداد سننے لگ گئی۔

''کیا مصیبت ہے، میرے خوابوں کی تعبیر اتنی بھیانک ہوگی تو کبھی گاؤں سے نہ نکلتی۔ یہاں

تو گاؤں سے بدتر ماحول ہے۔''

''صغریٰ کی سوچ میں ڈوبی ہے؟ چل ہاتھ منہ دھولے فر کھانا کھاتے ہیں۔''

''جی چاچی......'' صغریٰ فرنبرداری سے اٹھ گئی۔

سورج ڈوبتے ہی اردگرد بنے اونچے مکانوں کی جھلمل کرتی بتیاں روشن ہوکر پلاٹ کی جھگیوں کے سروں پر منڈلاتے گھور اندھیرے سے بچانے کی کوشش کررہی تھی۔ اِس ٹمٹماتی روشنی میں پتلی سی دال اور موٹی موٹی روٹی کے ساتھ پیاز کو حلق سے اتارا۔

''پتر تو وہ جو کونہ ہے نا دروازے نال...... اِس پر اپنا بستر لگالے۔ صبح اپنی جھگی ڈال لینا۔''

''ٹھیک ہے چاچا بڑی مہربانی۔'' قدیر ایک بار پھر انکساری کی تصویر بن گیا۔

''ہونہہ کی مہربانی؟ اتنا برا کھانا کھلانے پر یا اس طرح بے شرموں کی طرح سب کے سامنے پڑ کر سونے پر۔ دیکھ تو ذرا پلنگ پر عورت مرد ساتھ ہی پڑے ہیں۔ کسی کی الگ چادر کسی نے ایک ہی چادر میں پڑے رہنے کی ٹھان لی ہے۔ توبہ توبہ کیسی بھکاری جیسی زندگی ہے۔''

''دشش آہستہ بول صغریٰ، کسی نے سن لیا تو بُری بات ہوگی۔''

''قدیر جلد یہاں سے نکلنے کا بندوبست کرو ورنہ میں گاؤں واپس چلی جاؤں گی۔''

☆......☆......☆

چل صغریٰ سامان باندھ لے۔ دو دن اور تین راتوں کی اذیت سے گزرنے کے بعد قدیر مزید بیوی بچوں کو آزمائش سے گزارنے کے حق میں نہ تھا۔

''پر کدھر؟'' چاچا نے ڈاکٹر صاحب کے اسپتال کی چوکیداری پر رکھوادیا ہے۔ اسپتال ابھی بنا نہیں آدھا بنا ہے۔ پہلا چوکیدار گاؤں چلا گیا ہے۔ قسمت اچھی تھی میری کہ کام مل گیا اور میں نے اپنے بچوں اور بیوی کو ساتھ رکھنے کی بھی بات کرلی ہے۔ گلشن اقبال میں ہے اسپتال۔

چل تھوڑے دن عائشہ منزل میں رہنے کا مزا بھی دیکھ لیا اب گلشن اقبال بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہی ہی......قدیر خوشی خوشی سامان سمیٹنے لگا۔

☆......☆......☆

قدیر بڑا سکون ہے اِدھر بچے بھی سارا دن اتنے بڑے پلاٹ کی باؤنڈری میں کھیلتے رہتے ہیں۔ میں بھی اِدھر اُدھر کا نظارا کرتی رہتی ہوں بڑی سوہنی زندگی ہے یہاں کے لوگوں کی۔

''ہاں بھئی تو مزے کر آرام نال میرا کی ہے......''

''کیا بولا تو بھی تو مزے کرتا ہے۔ سارا دن میں دیکھتی ہوں کبھی چوکیداروں سے کبھی کباڑی سے تو کبھی ڈرائیور نے جو سامنے بنگلے میں صاحب کی گڈی چلاتا ہے۔ خوب دوستیاں نبھاتا ہے۔

تو بڑی نجر رکھتی ہے۔ چل اچھا جیسے تو خوش رہے۔ میں اُسی میں خوش۔

☆......☆......☆

''صغریٰ جلدی آ ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ سلام کرانہیں۔''

''ہیں آج ڈاکٹر اِدھر کدھر آگیا پانچ مہینے گزر گئے۔ تنخواہ بھی ڈرائیور دے کے جاتا ہے آج مصیبت ہے توبہ اسپتال کے ایک کمرے کو صغریٰ بنا پوچھے بیڈ روم بنانے پر مجل ہوتے بڑبڑائی۔

''قدیر اسپتال کی تعمیر رک گئی ہے۔ پاٹنر سے

میرا جھگڑا ہو گیا ہے۔ جب تک دوسرا بندوبست نہیں ہو جاتا۔ کام شروع نہیں کر سکتے۔ تم کو صرف یہ بتانا ہے کہ تم کو تنخواہ ملتی رہے گی۔ یہاں سے جانا نہیں۔ جلد یا بدیر کام دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ تم دھیان رکھنا سریا دروازے چوری نہ ہونے پائیں۔''

بڑی سی کالی جیپ میں بیٹھے بیٹھے ہی ڈاکٹر صاحب حکم نامہ جاری کیے ہوئے تھے۔

'' آپ فکر ہی نہ کریں ڈاکٹر صاحب۔۔ اپنی جان لگا کر اس کی حفاظت کروں گا۔''

''او کے کل دوبئی جا رہا ہوں۔ تنخواہ تم کو ملتی رہے گی۔''

''شکر ہے ڈاکٹر صاحب اسپتال کے اندر نہیں آئے۔'' صغریٰ ڈاکٹر کے جاتے سکون کا سانس لیتے ہوئے بولی۔

''اب تو کن سوچوں میں گم ہے۔''

''سوچ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب کا کام تو رُکا ہے۔ کوئی مزدور بھی ادھر نہیں آئے گا کیوں نہ اپنا کام بھی شروع کر ڈالوں۔''

''کون سا کام؟''

''کباڑ کا، بڑا منافع ہے۔ ایک دو کباڑیوں سے دوستی ہوئی سارے گن پتا لگ گئے ہیں۔ کل ہی ایک ٹھیلے کا بندوبست کرتا ہوں۔ پھر بسم اللہ کرتا ہوں کام کی۔''

☆......☆......☆

یہ لے صغریٰ یہ پیسے سنبھال کر رکھ دیکھ تو دُگنا فائدہ ہوا ہے۔ یہ تو بڑے منافع کا کام ہے۔ صغریٰ پیسے رکھ کر آ ہاتھ میں لیے بیٹھی کیا سوچ رہی ہے؟''

''کچھ نہیں قدیر آج میں چوتھے مرلے جو فلیٹ ہے نا۔ جو بھربڑھی مائی رہتی ہے۔ اس نے اپنے گھر بلایا تھا اس کی بیٹیاں دیکھی بڑی سوہنی ایسی ہی بنجی گھوم رہی تھیں گھر پر، پر کام کوئی نہ کر رہی تھی۔

''اچھا فر کی ہویا؟''

''میں نے کم واسطے انکار کر دیا۔ نہ جی ہم کوئی کم کرنے والی ذات نہیں۔ میں نے تیرا نام لگا دیا قدیر نہ مانے گا۔''

''کی کمی...... اچھا تو نے ایسا کیوں کیا؟ اچھا تھا چار پیسے مل جاتے۔''

''او ہنھ پرے۔'' قدیر بات کرتے کرتے اس کی کروٹ سے لگ گیا تھا۔

''اگر پڑھا ہوتا تو میری گل سمجھ آندی۔ سن میں نے اتنے عرصے ان شہری لوگوں کو جانا ہے۔ کم والیوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں۔ بس کم تک واسطہ، عجت کوئی نہیں، کم ہوا تو سر پر بٹھا لیا کم کے بعد توبہ توبہ، میں نے اپنی انکھوں سے ویکھا ہے۔ سامنے بنگلے والی بیگم نے انی بیستی کی کہ کی دسوں۔ اب کم اج کم یہ فلیٹ والے کم والی تو نہ سمجھے ہمیں۔''

''ہاں یہ تو نے بڑی سوہنی گل سوچی۔ اچھا اب سو جا۔ بہت تھک گیا ہوں۔''

☆......☆......☆

قدیر تو تو بڑا ماہر ہو گیا ہے اپنے کام پر...... اور عقل مند بھی، چوکیداری کے پیسے بیٹھے بٹھائے ملتے ہیں اور دو چار پھیروں سے اچھی رقم مل جاتی ہے کباڑ سے۔''

''اپنی نہیں کہے گی، فلیٹوں والیوں سے تعلقات بناتے بناتے اب تو تو بنگلوں میں بھی آنے جانے لگی ہے۔ ویسے وہاں تیری دوستی کس سے ہوئی ہے۔''

''کس سے ہوگئی کسی کی ماں کسی کی ساس کے پاس بیٹھ جاتی ہوں۔ اتنا مصروف جمانا ہے کسی کے پاس فرصت نہیں بڈھوں کے پاس بیٹھنے کی۔ میں دلجوئی کرتی ہوں وہ لوگ خوش ہوکر پاس بٹھاتے چائے پلاتے ہیں۔ سچ بڑی عجت ہوتی ہے میری۔ دوروز بعد عید ہے۔ دیکھنا میں سب کے گھروں میں سوئیاں لے کر جاؤں گی۔''

☆......☆......☆

اہتمام کے ساتھ تیار ہوکر عید ملنے کا ارادہ بیگ صاحب کے گھر سے کرنا چاہیے۔ صبح تڑکے اٹھتے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچتے جلدی جلدی کام نپٹانے لگی۔

''عید مبارک اماں جی!'' کہتے بڑی بی کے کروٹ لگ کر بیٹھی تھی کہ مہمان خاتون بول اٹھی۔

''یہ کون ہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا؟''

''ارے یہ سامنے جو کباڑی ہے نا اُس کی جورو ہے۔ بڑی نیک بچی ہے۔ میرا بڑا خیال کرتی ہے۔'' بڑی بی اپنے پوپلے منہ سے اُس کا تعارف کرارہی تھی۔ چور نگاہوں سے صغریٰ نے دیکھا تو مہمان خاتون کے چہرے کا زاویہ تمسخر لیے ہوئے تھا۔

''کیا ہوا جو اتنے دنوں عزت بنانے کے غرض سے اتنی دلجوئی اور خدمت کی۔ بدلے میں کیا سننے کو ملا۔ کباڑی کی جورو، بوجھل دل سے واپسی کی راہ لی۔ اور اگلے گھر عید ملنے کا ارادہ ملتوی کرتے گھر لوٹ آئی۔

☆......☆......☆

''صغریٰ کی گل ہے؟'' بڑی اداس دکھتی ہے۔ فلیٹوں میں بھی آنا جانا ختم کردیا ہے۔ بس اوپری منزل کی کھڑکی سے لگی رہتی ہے۔ کی دیکھتی رہتی ہے۔''

''قدیر بڑا سوہنا منظر لگتا ہے بچوں کو لاتی لے جاتی اسکول کے لیے مائیں۔ قدیر میں نے کمال کو اسکول داخل کرانا ہے۔ کیسے بھی کر کے۔''

''ٹھیک ہے جیسی مرجی پر......''

''آگے کچھ نہ بولیں۔ بس ڈاکٹر صاحب سے کہہ کر اسکول داخل کرادے۔ آخر کو چوکیداری بھی تو کرتے ہیں اُس کی اس بلڈنگ کی۔ اتنا سا کم نہیں کرینگے۔''

☆......☆......☆

''صغریٰ اری او صغریٰ۔''

''کی گلاں ہے جو یو گلا پھاڑ ریا ہے؟''

''کمال کا داخلہ ہوگیا ڈاکٹر صاحب نے اسکول ہیڈ ماسٹر سے فون پر بات کرلی ہے۔ یہ لے کورس اور یونیفارم بھی مل گیا ہے۔''

''چل یہ ہوئی نا بات۔ میں بھی اب تیاری کرلوں۔''

''کس بات کی تیاری؟''

''ارے کمال کو لانے لے جانے کے لیے ٹھیک طرح کپڑے پہن کر جانا ہوگا نا۔ جیسے اور مائیں جاتی ہیں۔''

''چلو جی تیرے ہاتھ تو شغل لگ گیا۔ میں ذرا دکان سے سامان لے آؤں بس شام کو اچھا سا کھانا پکانا۔ کمال کے داخلے کی خوشی میں۔''

☆......☆......☆

قدیر آج شام کو منگل بازار لے چلنا مجھے۔ وہ جو پرانے کپڑے کی کہتے ہیں ہاں لنڈا بازار وہاں سے کچھ کپڑے لے کر آؤں گی۔''

''ٹھیک ہے لے چلوں گا۔ پر تو کہاں چلدی؟''

''لے کمال کو اسکول سے لانا ہے نا۔''

''ہاں مجھے بھی پتا ہے پر بچوں کی مائیں آتی

جاتی ہیں ان سے بھی دو چار گل کرنی ہوتی ہیں نا۔ تو نہیں سمجھے گا کبھی۔''

''صغریٰ بس کر شیشہ ٹٹ جائے گا۔''

''ہونہہ قدیر دیکھ تو یہ لنڈا بازار سے لیا جوڑا کتنا سج رہا ہے مجھ پر۔''

''لگتا ہے میرے واسطے ہی بنا ہے۔ سیاہ سلک کے سوٹ پر سنہرے بٹن پر ہاتھ پھیرا۔ قدیر سچ بتانا یہ جو فلیٹ والی عورتیں ہیں۔ کسی چیز میں مجھ سے بڑھ کر ہیں۔''

''او کی.....'' قدیر کی گردن فخر سے تن گئی۔ یہ تو رب سوہنے کا کام ہے جو مجھے اتنی سوہنی وہٹی نصیب میں لکھ دی۔

''اچھا اب میں چلی دیر ہو جائے گی چھٹی ہونے والی ہے۔''

☆......☆......☆

''کہاں جا رہی ہو باجی؟ بڑی جلدی میں ہو۔''

''او صغریٰ کیسی ہو؟ بس گھر جانا اور کہاں۔'' مختصر سے جواب کے بعد خاتون ساتھی چلتی عورت کی ہمراہی میں قدم بڑھا گئی۔

''کون تھی یہ؟'' لہجہ تو بڑا گنوار تھا۔ دوسری خاتون کی قدرے تیز آواز نے پیچھے آتی صغریٰ کی سماعت کو تیز کر دیا۔

''کباڑی کی بیوی ہے۔''

''ہیں اتنی ٹپ ٹاپ بنی سنوری۔ ایک ہم ہیں جیسے بھی حلیے میں چل پڑتے ہیں۔ بھاگم بھاگ ہے اپنی زندگی، سنورنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔''

''کیا بکواس ہے یار، کچھ بھی کر لے۔ رہے گی تو کباڑی کی ہی بیوی نا۔''

''ہی ہی....'' مشترکہ ہنسی نے صغریٰ کو ندامت کی گہری کھائی میں لا دھکیلا۔

''کمال پکڑ اپنا بستہ مجھے دروازہ کھولنا ہے۔'' اپنا غصہ کمال پر نکالنا ضروری سمجھا۔

''ذرا سنیے کیا قدیر گھر پر موجود ہے؟'' دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی تھی کہ ایک جوان اور مناسب شکل صورت کے حامل شخص نے اسے مخاطب کیا۔

''جی وہ تو گھر پر نہیں پر آپ؟''

''میرا نام راحیل ہے قدیر نے مجھے بجلی کا کام کرنے کو کہا تھا۔''

''آپ کون ہیں؟''

''جی جی میں اُس کی بیوی ہوں۔''

''اچھا لگتا تو نہیں ہے خیر آپ کہہ رہی ہیں تو مان لیتا ہوں۔ یہ میرا فون نمبر رکھ لیں۔ قدیر آئے تو مجھے فون کر دیجیے گا۔'' معنی خیز مسکراہٹ لیے پرچی تھما دی۔

''جی ٹھیک ہے۔'' کچھ دیر قبل کی ساری کوفت بس ایک جملے میں کھو گئی۔ ''لگتا تو نہیں آپ قدیر کی بیوی ہیں۔'' الفاظ کی بازگشت تلے دن ڈھلا۔

''کمال امی کدھر ہے تیری؟ بول.....''

''ارے قدیر آ گئے۔ دوپہر کو ایک بندہ آیا تھا۔ ارے یہ تو وہی ہے جو دن میں.....''

''راحیل یار یہ میرا کام کر دے گرمی کے دن ہیں پنکھا تو چلا سکیں۔''

''فکر نہ کرو۔ بس تھوڑی دیر کا کام ہے۔''

''صغریٰ یہ راحیل ہے۔ تو ایسا کر روٹی پانی کا انتظام کر، راحیل کھانا کھا کر جانا۔'' قدیر بیک وقت صغریٰ اور راحیل دونوں سے مخاطب تھا۔

تھوڑی بہت تکلفات کی دیوار کھانا کھانے اور چائے پینے کے درمیان گر گئی۔ راحیل نے کنڈا ڈال کر پورا کمرہ روشن کر دیا تھا۔ قدیر کے

ضد کرنے کے باوجود کنڈا ڈالنے کی اجرت نہ لی۔
''اچھا راحیل تیرا بہت شکریہ۔ پر تو جب بھی اس علاقے میں کام کرے گا۔ چائے کھانا ہماری طرف ہی ہوگا۔''
''ٹھیک ہے قدیر بھائی۔ پر جب بھی گھر میں کوئی کام ہو بلا تکلف مجھے یاد کرنا۔''

☆......☆......☆

ہفتے میں ایک دو بار راحیل کی قدیر کے گھر آمد ہو ہی جاتی۔ زباں پر بھابی کی تکرار اور نگاہوں کی زباں کچھ اور کہتی۔
''صغری بڑی موڈ میں نظر آ رہی ہے بڑے گانے گنگنائے جا رہے ہیں۔''
''نہ نہیں تو، قدیر تو بھی نا۔ کیا بندہ گانے ......''
''ناراض کیوں ہوتی ہے۔ کل تک ٹی وی گھر میں آ جائے گا۔ بس یہی بتانا تھا۔ پھر خوب دل بھر کے گانے دیکھتی رہنا۔ صغری دیکھ تو اب ضرورت کی ہر شے ہمارے پاس موجود ہے۔ بچوں کے کھلونے' فریج' پلنگ اور اب ٹی وی بھی آ جائے گا۔''
''ہاں ہے تو پرانی، نوی تھوڑی......''
''او ناشکری نہ بن، گاؤں میں تو یہ بھی......''
''بس کر قدیر میرے سر میں درد ہے۔ فالتوں باتاں کی ضرورت نہیں۔'' کہتے چادر منہ پر تان لی۔
''ہائے کتنا اچھا ہو اگر راحیل مجھے اپنا لے، گول مول باتاں کرتا ہے۔ کبھی صاف صاف بول دے تو، اوی اللہ اگر کہہ دیا تو میرا کی جواب ہوئیگا۔ جو بھی ہو پر میرا جواب ہاں شاید ہاں...... کباڑی کی جورو تو نہ کہلاں گی الیکٹریشن کی جورو کی تو پھر بھی عزت ہوگی۔ کروٹ لیتے میٹھی نیند کی وادی میں پہنچ گئی۔
پرانا فریج خراب ہوئے دو روز گزرے تھے۔ راحیل کو بلانے کا نادر موقع پھر ہاتھ لگ گیا۔
''بھابی ذرا راستہ دینا میں فریج مکینک کو لایا ہوں۔ قدیر بھائی تم کہاں چل دیے۔ یار تو گھر کا بندہ ہے میں ذرا پھیری لگا کر آتا ہوں۔''
''بھابی ذرا میرے لیے اسٹرانگ سی چائے بنانا۔ سر میں درد ہے۔ اب سر کا درد چائے سے ہی نکالنے کی کوشش کرنا پڑے گی۔''
''سر درد کی گولی دوں؟''
''آپ کی چائے ہی دوا ہے میرے لیے۔''
صغریٰ شرماتے لجاتے چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔
''کیا بات ہے یار بڑا انداق ہنسی چل رہا ہے، خیریت تو ہے کہیں کوئی سیٹنگ ویٹنگ تو نہیں بنا رکھی ہے قدیر کی بیوی سے۔ شہری نہ سہی پر کچھ کچھ شہری روپ بنا رکھا ہے پھر......''
''شش...... آہستہ بول باؤلا ہوا ہے کیا اب میرا اسٹینڈرڈ اتنا بھی نہیں گر گیا ہے کہ ایک کباڑی کی بیوی سے سیٹنگ بناتا پھروں۔''
''تو پھر یہ تو اتنا جو فری ہو کر ہنسی مذاق کیوں کر رہا ہے۔''
''اچھا سمجھ آیا یہاں وہ مثال چل رہی ہے 'غریب کی جورو سب کی بھابی' تو تجھے کسی نے منع کیا ہے تو بھی کر لے مذاق۔''
''یہ میں چائے لائی تھی۔''
''آں ہاں کام ہو گیا ہے شام کو چیک کرنے آ جائے گا یہ۔'' کہتا ہوا خجل سا ہوتا راحیل باہر نکل گیا۔
''تو یہ اوقات ہے میری۔ قدیر کا پیشہ تو میری

زندگی سے جڑ کر عذاب بن گیا ہے ورنہ میں تو اس قابل ہوں کہ......'' دماغ سن ہو گیا ایک بار پھر زندگی اداسیوں کی نظر ہو گئی۔

☆......☆......☆

''صغریٰ طبیعت تو ٹھیک ہے تیری دو روز ہو گئے تو نے بچوں کو نہلایا نہیں دیکھ کتنے گندے پھر رہے ہیں اور اسکول بھی پابندی نال نہیں بھیج رہی۔ بڑی شوق سے داخل کرایا تھا تو نے کمال کو......''

''کی فائدہ، رہے گا تو وہی......''

''تیری گلاں سمجھ نہ آندی۔ اور ہاں سن چاچی جی کا فون آیا تھا۔ تجھ سے باتاں کرنا چاہ رہی تھی۔ صغریٰ یہ موبائل فون رکھ لے۔ اور یہ پیسے بھی رات ہو گئی تھی بیلنس ڈلوانا رہ گیا تھا۔ تو خود بیلنس ڈلوا لینا۔ اور ہاں اج اتوار کا دن ہے۔ شام میں سیر کو چلیں گے کمال کی بھی چھٹی ہے۔ تیرا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔ میں ذرا دو چار پھیری لگا لوں۔ اتوار کو لوگ زیادہ کباڑ کاٹھ نکالتے ہیں۔'' طبیعت میں چھائی مایوسی نے چولہا ٹھنڈا کر رکھا تھا۔

''امی بھوک لگی ہے۔ ہاں مجھے بھی بھوک لگی ہے۔''

''چپ کر جا کما لے پیچھے پیچھے بولنا شروع کر دیتا ہے۔ چل گڑیا ہوٹل سے پراٹھا دلا لاؤں۔ بیلنس بھی ڈلوانا ہے۔ اماں کو بھی جانے کیا پریشانی لگی ہے۔ جو فون کرے جاتی ہے ذرا احساس نہیں بیٹی کس مشکل میں ہے۔''

''امی کیا ہوا کس سے بول رہی ہو؟''

''کچھ نہیں میرا متھا خراب ہو گیا جو اکیلے بولے جا رہی ہوں اب چلو دونوں۔'' گھریلو استعمال کے کیمیکل اور سٹیل برتن سے سجی دکان میں ہی پی سی او کھلا ہوا تھا۔

''کیا زاہد نہیں ہے؟'' دوکاندار کی جگہ اجنبی شخص کو اس کی دکان پر بیٹھا دیکھ کر واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اجنبی بول پڑا۔

''زاہد کام سے گیا ہے ابھی آنے والا ہے۔ آپ کو جو چیز چاہیے لے لیں۔''

''مجھے بیلنس ڈلوانا ہے۔''

''اپنا نمبر لکھ دیں۔ ابھی بیلنس ڈال دیتا ہوں۔''

''یہ لو پراٹھا یہ لو چائے اب شور نہ کرنا سکون سے کھاؤ اور......''

''امی فون بج رہا ہے۔''

''ہاں تمہاری نانی کو پریشانی لگی پڑی ہے۔ تم لوگ ناشتہ کرو میں فون پر بات کر کے آتی ہوں۔''

''ہیلو......!''

''کیسی ہو؟ اوہ غلط کہہ دیا ظاہر ہے بہت اچھی جبھی تو فون کرنے میں دیر نہ لگائی۔'' اجنبی مردانہ آواز نے جہاں چونکایا وہیں آواز کو مزید دھیما بناتے پوچھ بیٹھی۔

''کون ہیں آپ؟ میں انجان لوگوں سے بات نہیں کرتی، رکھتی ہوں فون۔''

''ارے سنیں فون مت رکھیں میرا نام صفدر ہے۔ آپ اچھی لگیں تو سوچا آپ سے بات بھی کر لی جائے۔ محض دس منٹ کی گفتگو کے بعد مصنوعی حیا کی چادر بھی اترتے دیر نہ لگی۔

قدیر کے جاتے ہی فون پر گھنٹوں باتیں کرنے کا دلچسپ شغل ہاتھ لگ گیا۔ ایک بار پھر خوابوں کا سہانا سفر شروع ہو گیا۔ بلکہ اب کی بار کا سفر زیادہ خوش گوار احساس لیے تھا کہ صفدر کباڑی کی جورو کا احساس دلائے بغیر صرف اُس کی

ذات میں دلچسپی رکھتا تھا۔

''صفدر معمولی شکل کا بندہ ہے۔ پر بات بڑی اچھی کرتا ہے۔ اجلے چٹے کپڑے پہنتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات میری کتنی تعریف کرتا ہے۔ کتنا پسند کرتا ہے۔ اتنے اچھے طریقے سے رہتا ہے۔ یقیناً بہت اچھا کام ہوگا کبھی بتایا تو نہیں کہ کیا کام کرتا ہے۔ پر پوچھنا بُری بات ہوگی آخر وہ بھی تو جانتا ہے کہ میں کباڑی قدیر کی بیوی ہوں۔ پر کبھی منہ سے نہ بولا۔

''صغریٰ او صغریٰ..... !'' ایک تو قدیر میری جان کا دشمن گھر آتے نعرہ لگانے لگ جاتا ہے۔ مجال ہے جو بندہ اپنے خیالوں میں ہی من پسند بندے کا تصور کر لے۔ خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت میں آتے صغریٰ تلملا گئی۔

☆..........☆..........☆

صغریٰ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ نہیں میں مذاق نہیں کر رہا۔''

''صفدر پر.....''

''کچھ نہیں تم اگر چاہتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ یہ سلسلہ ختم کر دو۔'' صفدر کے اسرار نے قدیر سے بے زاری کو ہوا دے دی۔ زندگی میں اور کیا چاہیے کباڑی کی جورو ہونے سے جو ذلت ملی اس سے کہیں بہتر زندگی صفدر کے پاس عزت کے نام کے ساتھ گزر سکتی ہے۔

''کمال جا اپنی ماں کو بُلا لا، دیکھ میں اس کے لیے کیا لایا ہوں۔ اوپر کھڑکی میں کھڑی ہوگئی۔''

کئی کئی دن کی خاموش جنگ اور بات کرنے پر اُلجھتے بے کیف دنوں نے قدیر کو بڑھاپے کے اور نزدیک کر دیا تھا۔

''صغریٰ کیوں ناراض رہتی ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو دیکھ میں ہتھ جوڑ کہ معافی مانگتا ہوں۔ بچوں کو دیکھ کیسے اُداس رہنے لگے ہیں۔ چل کہیں باہر چل گھوم کر آتے ہیں۔

''کھوں کھوں..... کھانسی کا دورہ پڑتے بلغم کے ساتھ خون کی باریک دھاری نے قدیر کو اضطراب میں ڈالا وہیں صغریٰ کو فرار کا رستہ بھی نظر آ گیا۔

''اے ہے اب تو میں کبھی نہ رہوں تیرے ساتھ۔ تیرے بڑھاپے کے ساتھ اب اس موذی بیماری بھی تھپادوں۔''

''نا بابا نا..... میں نہ مرنے کی تیری بیماری مجھے لگ گئی تو میری تو زندگی ختم نا، صغراں اتنی بے رحم نہ بن۔ میرا کی قصور میں اپنا علاج باقاعدہ کرواؤں گا۔ میں تیرے قریب بھی نہ پھٹکوں گا۔ بس تو اپنے بچوں کا.....''

بچوں کا بہانہ مت لگا قدیر۔ بچے میرے ساتھ رہیں یا تیرے، یہ تیرا فیصلہ، میرا ارادہ پکا ہے تو مجھے آزاد کردے اگر ایسا نہ ہوا تو دیکھ میں اپنی زندگی تیرے سامنے ختم کرلوں گی۔ اور تیزی سے تیزاب کی پرانی بوتل کی طرف لپکی۔

''صغریٰ یہ کی بے وقوفی ہے؟''

''قدیر ابھی کے ابھی مجھے طلاق دے ورنہ یہ اپنے اوپر گرالوں گی۔ پھر لگاتے رہنا جیل کے چکر۔''

''ٹھیک ہے جا میں نے تجھے آزاد کیا۔''

شکستہ حال ایک ایک لفظ آنسوؤں میں بھیگا ہوا بے حال کر رہا تھا۔

''چل گڑیا کمال۔''

''ہاتھ مت لگانا صغراں بچوں کو۔ اب ہمارا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں، تجھے آزادی مل گئی اب جا یہاں سے۔''

'' میرے بچے لمحے بھر کو ممتا قیدی پنچھی کی

طرح پھڑ پھڑائی۔ پر اگلے ہی لمحے صفدر کی شبیہہ نے کوکھ کی آگ کو محبت کی برسات سے بجھا دیا۔ جیسی تیری مرضی، چادر اپنے گرد لپیٹ کر قدیر کی چوکھٹ پار کر گئی۔

☆......☆......☆

وہی علاقہ وہی لوگ، پر آج سماں بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا۔ سکون اور اطمینان کی لہر پورے وجود پر حاوی تھی۔ اوہ قسمت یوں بھی مہربان ہوتی ہے آج اس کا پتا لگا۔ سامنے سے آتا صفدر موٹر سائیکل دوڑاتا اس کے قریب تھا۔

''کدھر جا رہی ہو؟''

''اگلی گلی چلو میں وہیں ملتی ہوں۔''

''کیا بات ہے صغراں اِدھر کیوں بلایا اور بچے کدھر ہیں آج ان کے بغیر نظر آ رہی ہو؟''

''صفدر میں نے قدیر سے طلاق لے لی ہے اب چلو کہاں چلنا ہے؟''

''اوہ صغریٰ کیا خبر سنائی ہے۔ چلو اپنے گھر چلتے ہیں۔ بیٹھو۔'' موٹر سائیکل فراٹے بھرتی قدیر کے علاقے کی حدود سے باہر صفدر کے علاقے میں داخل ایک چھوٹے سے کوارٹر کے آگے رکی۔

''آؤ بھئی صغریٰ یہ آ گیا اپنا آشیانہ جہاں ہم سکون سے زندگی گزاریں گے۔ دو روز بعد اماں بھی آ جائے گی۔''

ڈیرہ غازی خان گئی ہے ماسی کی فوتگی میں۔ پر فکر نہ کر چار مہینے یا شاید پانچ مہینے کی مدت بتائی تھی مولوی صاحب نے طلاق کے بعد۔ اس کے بعد ہم شادی کر لیں گے۔ دیکھو میں نے پوری معلومات اکٹھا کر رکھی تھی۔ کھی کھی' مجھے پتا تھا تم ایک روز مجھے ضرور ملو گی۔'' اور اندر دروازہ کھلتے ہی مخصوص سی بو نے استقبال کیا۔ چھوٹے سے کچے پکے صحن کے کونے میں پرانے ٹین ڈبوں کاٹ کباڑ کا انبار لگا ہوا تھا۔ ساتھ میں پڑے بورے میں بوسی ٹکڑے اٹے ہوئے تھے۔ جن سے دو روز قبل کی برسات کی وجہ پھپھوند پڑنے سے سڑانڈ آ رہی تھی۔

''یہ...... یہ سب منظر؟''

''آرام سے ...... تھک گئی ہو جو کھڑے کھڑے جھول گئی ابھی گرتی زمین پر آؤ چلو کمرے میں چل کر آرام کر لو۔''

''کمرے کا منظر قدیر کے گھر جیسا کیوں لگ رہا ہے؟'' حیرانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ سیکنڈ ہینڈ چیزوں سے مزین کمرہ، دیوار پر لگا دھندلا شیشہ ساتھ لگے ریک پر پرانی ادھوری پرفیوم کی بوتلیں جا بجا سجی ہوئی تھیں۔ جیسی قدیر کباڑ کے سامان کے ساتھ لایا کرتا تھا۔ صرف ایک چیز مختلف تھی وہ تھی کھونٹی جس پر قدیر کی میلی دھوتی اور بنیان کے بجائے سلیقے سے کلف لگے صفدر کے کپڑے ہینگر کیے تھے۔

''بیٹھو بھی کیا استانیوں کی طرح اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہی ہو۔ چلو میں بٹھاتا ہوں۔'' اسے کندھے سے پکڑ کر پلنگ پر بٹھایا ہی تھا کہ پلنگ کا ایک پایا چرچراہٹ سے ڈھے گیا۔

''کھی کھی...... اواس کمبخت کو بھی آج ہی ٹوٹنا تھا پر کیا کیا جائے کباڑ کا مال تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ کب دھوکا دے جائے۔ تم کو تو پتا ہی ہو گا۔''

''کباڑ کا......؟''

''ہاں پچھلے ہفتے اتوار بازار کے پھیرے میں ہاتھ لگا تھا ٹھونک ٹھاک کر گزارے لائق بنایا تھا۔''

''ت...... تم کیا کام کرتے ہو؟''

''وہی جو قدیر کرتا ہے۔ ارے بابا کباڑی ہوں جمعہ بازار' اتوار بازار' اور جتنے بازار لگتے ہیں کباڑ کے وہاں اپنا سیٹ اپ چل رہا ہے۔

ردی ٹکڑے وغیرہ علاقے کے لوگ کہہ دیتے ہیں جا کر اٹھالیتا ہوں۔ پھر سارا وقت فارغ، اور اسی فارغ وقت میں دوستی یاری نبھالیتا ہوں۔ اور اسی دوستی یعنی زاہد کی دکان نے مجھے تم سے ملایا...... ہی ہی......''

☆......☆......☆

دو روز ہوگئے قدیر تمہاری بیوی نظر نہیں آرہی؟'' آخر بلڈنگ کے ساتھ والی پڑوسن پوچھ بیٹھی۔

''وہ جی وہ دراصل بیمار ہے۔ پنجاب بھیجا ہے۔علاج کے لیے۔''

''اچھی بھلی تو تھی لوگ شہر آتے ہیں علاج کے لیے اور تم نے پنجاب بھیجا ہے آخر ایسا کون سا مرض ہے جس کا علاج گاؤں میں ہے؟''

''کیسی مصیبت آن پڑی ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی صغراں کا پوچھے جارہا ہے۔

''قدیر...... میاں کب آرہی ہے تمہاری جورو؟ دیکھو ہم اکیلے آدمی کو محلے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہاں فیملی والے رہتے ہیں لوگ تمہارے بارے میں شک و شبہات میں پڑرہے ہیں۔''

''جی...... جی...... بڑے صاحب آپ درست کہہ رہے ہیں۔ بس علاج مکمل ہوتے صغراں واپس آجائے گی۔ یا اللہ یہ کیسی سزا مجھ کو ملی ہے۔ گھر گرہستی اجڑنے کا غم ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ مزید زمین تنگ ہونا شروع ہوگئی۔

☆......☆......☆

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' سفید لباس میں ملبوس نرس کے چہرے کو نبض چیک کرتے دیکھ کر حیرانگی سے دیکھا۔ اٹھنے کی کوشش میں دوسرے ہاتھ میں لگی ڈرپ نے کوشش ناکام کردی۔

''لیٹی رہو۔ میں ڈاکٹر صاحب کو بلاتی ہوں۔''

''ارے ہوش آ گیا بے چاری کا شوہر کتنا پریشان تھا۔ آس پاس آتی آوازوں کی سمت نظر دوڑائی۔ قطار در قطار لگے بیڈ اس پر دراز عورتوں کے ساتھ تیمار دار عورتیں نرس کے جاتے اس کے بیڈ کے پاس جمع ہونا شروع ہوگئیں۔

''کیا ہوگیا تھا بیٹی؟''

''ارے کوئی صدمہ ہوگا جبھی پورے پانچ دن تک بے سدھ پڑی تھی۔ ہوش آتا پر نیند میں چلی جاتی۔ آج نظر نہیں آیا اس کا شوہر روز صبح آجاتا ہے۔ بھانت بھانت کی بولیوں سے دماغ کی رگ پھٹی جارہی تھی۔ لو آ گیا اس کا شوہر چلو بھئی مل لینے دو اسے اپنی بیوی سے۔''

''شوہر......؟ کیا قدیر؟'' سامنے کھڑے صفدر نے دماغ کو مزید تھکانے سے روک دیا۔

''کیسی ہو صغریٰ؟ تم نے تو آتے ہی مجھے اپنی خدمت میں لگا دیا ویسے اچھا ہے یہ تجربہ بھی۔ ویسے اگر تمہاری طبیعت خراب تھی تو پہلے بتانا تھا۔ گھر لے جانے سے پہلے ڈاکٹر کے پاس ہی لے جاتا۔''

''خیر اب مکمل ٹھیک ہونے پر ہی گھر لے چلوں گا۔ اماں کو بھی اطلاع کردی ہے کل آرہی ہے کراچی۔ اس دن فون پر اماں سے بات کراتا پر تمہاری اچانک طبیعت خراب ہوگئی اور کمرے میں دیکھا تو تم بے ہوش پڑی ہو۔

''او میں بھی کتنا پاگل ہوں اتنے دنوں بعد تمہیں ہوش آیا ہے اور لگا اپنی باتیں کرنے۔ تم آرام کرو۔ میں شام کو آتا ہوں۔''

صفدر کے جاتے ہی ذہن بازگشت کی زد میں تھا۔ پانچ روز قبل کا منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔

''سلام اماں، ہاں ہاں بالکل ٹھیک!''

''بس اب جلدی واپس آ جاؤ۔ شادی کی تیاری بھی تو کرنی ہے۔ ارے اماں تیری بھانجی نوری سے کہیں بہتر تیری بہو لایا ہوں۔ بالکل شہری گڑی جیسی۔ ہاں ہاں وہی جس کا بنایا تھا۔ اوہ تو چھوڑ نا بچوں والی بات۔ اس کے بچے اپنے باپ کے پاس ہیں۔''

''بھئی کباڑی ہوں۔ تھوڑا بہت نقص والا مال چلا لیتا ہوں۔ پھر یہ میری پسند بھی ہے۔''

''او خدایا یہ کیا ماجرا ہے۔'' دماغ میں ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔

''کباڑی...... کھی کھی کھی...... کباڑی کی جورو۔''

''کیسا سماں ہے سارے کمرے میں سارے جہاں کی ہنسی سمٹ آئی ہو۔ اور اس ہنسی میں سارا وجود کھو گیا۔

☆......☆......☆

گندے کمرے میں گندے برتنوں اور کپڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔

''ابوامی کدھر گئی ہے؟ گندی سی نیکر پہنے کمال ہزار بار پوچھے گئے سوال کے ساتھ ایک بار پھر حاضر تھا۔

''بیٹا چپ کر بہن نال کھیل مجھے پریشان نہ کر۔ مجھے کچھ سوچنے دے۔ کیا مصیبت ہے کیا کروں؟ اگر صغریٰ کے کرتوت کا پتا چل گیا اس محلہ والوں کو تو ایک منٹ نہ لگائیں مجھے اور بچوں کو نکال باہر کرنے میں، کتنا خیال کیا تھا جب گڑیا بیمار تھی محلے والوں نے علاج کے پیسے بھی دیے تھے۔ اور یہاں اب تو ایسا کوئی معاملہ ہی نہیں ہے۔ سوائے ذلت کے صغریٰ نے حرکت ہی ایسی کی ہے کہ میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ ابھی تو صرف بشو اڑی نے دیکھا تھا صفدر کے ساتھ اسکوٹر پر جاتے اس کا منہ بند رکھنے کو منت کی ہے۔ لوگوں کو پتا چلے گا تو یہی کہیں گے نا کہ میں نے ڈھیل دے رکھی تھی۔ کیا جواب دوں گا؟ کیا دوبارہ گاؤں کا رستہ دیکھنا پڑے گا۔''

☆......☆......☆

''ہائے ربا کیسا غضب ہو گیا۔ جلد بازی میں اپنا ٹھکانا اور بچوں کو بھی کھو دیا۔ ایک بار پھر وہی کباڑی کا نام میرے ساتھ جڑے گا۔''

اسپتال کے جنرل وارڈ میں نیم تاریکی اور گہرے سناٹے کے راج نے تھک کر واپسی کا قصد کیا۔ پرندوں کی حمد وثنا نے صبح کی نوید دی۔

''اُف تھوڑی دیر بعد صبح کی سفیدی کے ساتھ صفدر کی آمد ہو گی اور کچھ عرصے بعد ایک بار پھر کباڑی کی بیوی...... نہیں اب نہیں۔''

''کیا کروں قدیر سے طلاق ہو گئی ہے۔ گاؤں شاید گاؤں واپس جانا چاہیے بعد میں سوچوں گی کیا کرنا ہے۔'' بیڈ سے اتر کر چپل پیر میں اڑستے وارڈ سے باہر نکلنا دوبھر ہو گیا۔ کتنا مشکل ہو رہا ہے چلنا۔

''کہاں جا رہی ہو بی بی......'' صدر دروازے پر اونگھتا چوکیدار اٹھ بیٹھا۔

''بابا جی دل گھبرا رہا تھا، اندر ٹہل لگا رہی ہوں۔''

''اچھا اچھا......'' چوکیدار ایک بار پھر آنکھیں موندھ کر بیٹھ گیا۔

نظر بچا کر گیٹ کے باہر قدم نکالے۔ سنسان سڑک پر اِکا دُکا گاڑیاں چل رہی تھیں۔ صفدر کے آنے کا خوف قدم گھسیٹنے پر مجبور کیے جا رہا تھا۔

''آہ...... مرگئی...... ہائے...... آہ۔'' چر چر بریک لگنے کی آواز کے ساتھ انسانی چیخ اور کراہ

بھی شامل ہوگئی۔

''او بھاگ بے وقوف، ایکسیلیٹر دبا، اترنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ روڈ سنسان ہے بھاگ۔''

''یار کہیں مر نہ جائے آخر کو ہماری گاڑی کے نیچے آئی ہے۔''

''ابے بکواس مت کر اگر اسے اٹھایا تو ہم مر جائیں گے۔ سالی نے ساری رات کا نشہ کر کرا کر دیا۔ سالی کو ہماری ہی گاڑی ملی تھی نیچے آنے کو۔''

☆......☆☆......☆

دھڑ دھڑ...... دھڑ...... او قدیر ......قدیر دروازہ مسلسل بجتے جا رہا تھا۔

''یا اللہ کیا صبح صبح علاقے والوں نے بے گھر کرانے کی ٹھان لی۔''

''آتا ہوں جی او شوکت کی ہویا؟'' سامنے کھڑے سعید صاحب کے چوکیدار کو حیرانگی سے دیکھا۔

''یار وہ بھابی جی نہیں......'' نظریں جھکائے زمین کو تکتے شرمندگی کا بوجھ اٹھائے سوچ میں ڈوب گئی۔

''اوہ تو شوکت کو بھی آخر پتا چل گیا صغریٰ کی بے وفائی کا۔''

''ک...... کیا؟''

''قدیر بھائی میں صاحب کو ایئر پورٹ چھوڑ کر آ رہا تھا کہ رستے میں رش دیکھ کر رُکا۔ دیکھا بھابی جی سڑک پر خون میں لت پت پڑی ہیں۔ بہت بُرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ جو جان لے گیا۔''

اسپتال کے مردہ خانے میں میت رکھی ہے۔ میں بتا کر آیا ہوں کہ اس کے گھر والے کو لے کر آتا ہوں۔

''ہونہہ...... میں کیوں جاؤں اُس کی میت اٹھانے جس کے ساتھ گئی تھی وہ اٹھائے میت۔ ایک اور خرچہ کفن دفن کا۔ سوچوں کے سمندر میں شوکت کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔

''صبر کر یار اللہ کی جس میں مرضی، ویسے بھابی آ کہاں سے رہی تھی وہ تو گاؤں......''

''ارے یہ تو بہترین موقع ہے لوگوں کی ہمدردی سمیٹنے کا پھر مجھے کوئی یہاں سے نکالے گا بھی نہیں۔ اور پھر مجھے اب کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کس کے ساتھ بھاگی تھی۔

اب تو وہ دنیا میں نہیں رہی۔ پر اس کی موت میری زندگی آسان کر گئی۔

''آں ہاں وہ گاؤں سے تو واپس آ رہی تھی۔ میں نے کہا بھی تھا کہ لینے آ جاؤں گا۔ پر کہنے لگی بچوں کو لے کر مشکل ہوگئی ابا جی گڈی میں بٹھا دینگے۔ تو لینے آ جانا۔

پھر وہ شام تک آنے والی تھی۔ کیا پتا تھا کہ سویرے والی گڈی اس کی جان لے ڈالے گی۔ ہائے ربا میری تو دنیا ہی لٹ گئی برباد ہوگیا۔ عقل کے گھوڑے دوڑاتے بین کی صدا بھی شامل کرنا ضروری سمجھا۔

کفن سے لے کر قبرستان تک کے اخراجات علاقہ مکینوں نے کر دیے ساتھ ہی بچوں اور قدیر پر ہمدردی کا ہاتھ رکھتے صبر کی تلقین جاری رکھی۔

قدیر سر جھکائے لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے لگا تھا۔

اور سفید کفن میں لپٹی صغریٰ کی میت کرب کی تصویر بنی اذیت جھیل رہی تھی جس کی زندگی سے موت تک کے سفر میں بس ایک ہی نام جڑا رہا۔

''کباڑی کی جورو۔''

☆☆......☆☆

بنتِ حوا

کچھ رقم تو میرے پاس ہے کچھ زیورات بھی ہیں انہیں فروخت کردوں گی میرا خیال ہے اتنی رقم پارلر کے لیے کافی ہوگی ورنہ اپنی بہن سے ادھار مانگوں گی ہوسکتا ہے وہ میری مدد کردے۔ کوشش کرا تو مگر میرے خیال میں یہ بہت مشکل ہے پوش ایریا میں پارلر کے لیے جگہ ہی......

دوسرا حصہ ایک ایسا یادگار ناولٹ جو دلوں سے مکالمہ کرے گا

"جاب کیوں چھوڑ دی؟"

اس کے بدترین اندیشے کی تصدیق ہوگئی تھی اسے پہلے ہی لگ رہا تھا شرجیل کوئی جاب وغیرہ نہیں کرتا۔

بس یار مینیجر سے پھڈا ہو گیا تھا اس نے اوپر شکایت لگا دی ایم ڈی کے پاس پیشی ہوئی اس

نے منیجر کی غلط باتیں سن کر بھی اسی کا ساتھ دیا بس میں اسی وقت دو ٹکے کی اس ملازمت پر لات مار کر چلا آیا یہ ہی وجہ تھی جس کی بنا پر میں تم سے پورے ایک ماہ رابطہ نہ کر سکا۔ دراصل میں ان دنوں بہت پریشان تھا۔ تفصیل کے ساتھ ہی اپنی ایک ماہ کی غیر حاضری کا جواز بھی اس نے پیش کر دیا۔

تو پھر تمہارے گھر کے اخراجات کیسے پورے ہو رہے ہیں۔

وہ اٹھ بیٹھی اسے اپنا سکون درہم برہم ہوتا ہوا نظر آیا۔

''آپا اور راجیہ پورے کر رہی ہیں تم فکر نہ کرو'' وہ بے فکری سے بولا۔

پھر بھی شرجیل اس طرح گھر کیسے چلے گا تمہیں جلد از جلد کوئی ملازمت ڈھونڈ لینی چاہیے۔ تمہاری دونوں بہنیں یہ سارا بوجھ کس طرح اٹھائیں گی۔

اتنی مہنگائی کے دور میں بھلا دو عورتوں کی معمولی تنخواہ سے کیا بنتا تھا جو بھی تھا اور ایک پر آسائش زندگی چھوڑ کر آئی تھی۔

ویسی نہ سہی مگر کچھ بہتر زندگی تو اس کا حق بنتی تھی اور وہ صرف اسی صورت ممکن تھا جب شرجیل صاحب ملازمت ہوتا ورنہ تو وہ آگے سوچ کر گھبرا گئی۔

''ڈھونڈ لوں گا ملازمت تم کیوں خواہ مخواہ کی ٹینشن لے رہی ہو۔

بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ تم کسی اچھے سے پارلر میں جاب کرلو تا کہ تمہاری اپنی ضروریات تو آسانی سے پوری ہوں اور جب مجھے ملازمت مل جائے تو بے شک اپنی نوکری چھوڑ دینا۔

ظاہر ہے اس کی بہنیں برسر روزگار تھیں اس کا گھر چلا رہی تھیں ایسے میں بیوی کی ملازمت اس کے لیے کسی عیب کا سبب نہ تھی۔ اسی سوچ نے اسے کسی لاحاصل بحث سے باز رکھا پارلر سے مجھے کیا تنخواہ ملے گی؟ دس، پندرہ یا بیس ہزار روپے صبح سے لے کر رات تک کی خواری الگ۔

وہ اپنے بال لپیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سوچ رہی ہوں خود اپنا پارلر ہی شروع کردوں بس ذرا ڈپلومہ مل جائے شاید اسی ہفتے میں مل جائے گا، پھر کچھ پیسوں کا انتظام کرتی ہوں۔

اپنے پارلر کے لیے لاکھوں روپیہ کہاں سے لاؤ گی، پارلر تھوڑی رقم میں نہیں چلتے وہ اسے دیکھتا ہوا بولا۔

کچھ رقم تو میرے پاس ہے کچھ زیورات بھی ہیں انہیں فروخت کردوں گی میرا خیال ہے اتنی رقم پارلر کے لیے کافی ہوگی ورنہ اپنی بہن سے ادھار مانگوں گی ہوسکتا ہے وہ میری مدد کردے۔

کوشش کرلو مگر میرے خیال میں یہ بہت مشکل ہے پوش ایریا میں پارلر کے لیے جگہ ہی بہت مہنگی ملے گی اور اگر کرایہ پر لوگی تو ایڈوانس اور کرایہ میں ہی کافی رقم نکل جائے گی پھر باقی کام کیسے کروگی۔ فی الحال پارلر والا خیال تم رہنے دو البتہ جاب کے لیے کوشش کرو دیکھو کتنی سیلری ملتی ہے۔

وہ اسے مشورہ دیتا ہوا باتھ روم کی جانب بڑھ گیا جبکہ وہ وہیں کھڑی اس کی پشت تکتی رہی پندرہ دن بعد بھی اپنی تلخ ترین حقیقتوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

☆......☆......☆

دیکھو غلام حسین تم میرے بہت اچھے دوست ہو اور میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ اپنے گھر کی طرف تھوڑی توجہ دو۔

نورالدین کیا کہنا چاہتا تھا غلام حسین کی سمجھ میں نہ آیا۔

''میں تمارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''حقیقت ہے سچ بہت کڑوا ہوتا ہے مگر بھلائی اسی میں ہے کہ اس کی کڑواہٹ سمیت گھونٹ گھونٹ پی لیا جائے۔'' وہ تمہید باندھتا ہوا، وہ غلام حسین کا ایک ہمدرد دوست تھا مانتا تھا کہ اسے ہر بات سے آگاہ کردے۔

''تمہیں جو کہنا ہے کھل کر کہو میں برا نہیں مانوں گا۔''

''غلام حسین اپنی بیوی کا دھیان رکھو محلے والے اس کے بارے میں کچھ اچھے خیالات نہیں رکھتے۔'' وہ ذرا سا جھکتے ہوئے اپنی بات مکمل کر گیا حالانکہ یہ ایک مشکل عمل تھا دوست کے سامنے اس کی بیوی کا ذکر کرنا۔

کیوں ایسا کیا کردیا ہے اسنے؟ فرحین کے بدلے ہوئے انداز واطوار پچھلے کئی دنوں سے غلام حسین کو الجھن میں ضرور ڈال رہے تھے مگر اسے یہ امید نہ تھی کہ اس کے بارے میں محلے میں غلط باتیں بھی کی جارہی ہوں گی۔ اصل میں وہ کبھی اتنا فارغ ہی نہ ہوا تھا کہ کسی چوراہے پر بیٹھ کر لوگوں سے یہاں وہاں کی معلومات لیتا وہ تو ایک مزدور آدمی تھا جو سارا دن مشقت کی چکی میں پس رہا تھا۔ دنیا کی گندگی نے اس کے گھر کی راہ کب دیکھ لی اسے پتہ ہی نہ چلا وہ تو بے خبری میں ہی مارا گیا

نورالدین جو کہنا چاہتا تھا وہ بنا سنے ہی سمجھ گیا۔ پھر بھی چاہتا تھا کہ نورالدین ہر بات مکمل کر بتائے تا کہ اس کا مغالطہ دور ہو سکے اس نے کیا کر دیا جو تو یوں بول رہا ہے۔ خیر میں تمہیں نہیں بتا سکتا بہر حال وہ جو کچھ کر رہی ہے تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس پر نظر رکھو اس طرح کم از کم تم اپنی بچیوں کو اس دلدل میں جانے سے بچا سکو جس میں تمہاری بیوی پھنس چکی ہے۔

نورالدین کے الفاظ نے اسے شرم سے زمین میں گاڑ دیا نورالدین صحیح کہہ رہا تھا اسے فرحین کی صحبت سے اپنی بیٹیوں کو محفوظ رکھنا تھا وہ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہو شرم کے مارے وہ کچھ بول ہی نہ پایا دیکھو غلام حسین میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہ تھا بلکہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی بیوی کو بھی برائی کے راستے سے بچا واپس لانے کی کوشش کرو چاہے اس کے لیے تمہیں اس پر سختی کیوں نہ کرنی پڑے، اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو اسے طلاق دے دو بد چلن عورت کی محبت تمہاری بیٹیوں کا مستقبل تباہ کر دے گی۔"

نورالدین نے ہر بات واضح کر دی تھی اب مزید کچھ کہنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی اور جب وہ وہاں سے اٹھا تو شرم کے مارے گردن ہی نہ اٹھا سکا۔

☆......☆......☆

دیکھو بیٹا میری ایک بات مانو اسے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔

کمال ہے اماں حد کرتی ہیں بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے سچائی بتانے کا۔

وہ کس قدر برا مانتے ہوئے بولا۔

جتنا دھوکہ محبت کے نام پر تم اسے دے چکے ہو وہ کافی ہے یقین جانو میں جب بھی اس سے ملتی ہوں شرم کے مارے نظریں نہیں ملا پاتی وہ بے غرض تمہاری مدد کر رہی ہے تم پر بھی فرض بنتا ہے کہ ہر بات اس پر واضح کر دو پھر اس کا دل چاہے تو ہماری مدد کرے ورنہ بے شک نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے کوئی دوسرا راستہ نکالے گا۔

ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

وہ ہماری مدد بے غرض نہیں کر رہی ہے اپنی محبت کی تسکین کے لیے کر رہی ہے ایسے میں اگر اسے اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں تو یقیناً اس کے دل میں موجود ہماری تمام ہمدردی ہوا بن کر اڑ جائے گی۔

لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ فی الحال ہم اپنی زبانوں کو بند رکھیں۔

اس وقت تک جب تک ہمارے سارے مسئلے حل نہ ہو جائیں۔

اور آپ اب اس مسئلہ پر مزید کوئی بات نہ کیجیے گا۔

وہ حتمی لہجہ میں بات ختم کرتا ہوا بولا اب مزید کسی بحث کی گنجائش باقی نہ رہتی تھی لہٰذا وہ خاموش ہو گئیں۔

☆......☆......☆

یہ پرفیوم کس کا ہے؟

وہ قیمتی بوتل کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوا بولا۔

ظاہر ہے میرے پاس ہے تو میرا ہی ہوگا۔

جانے آج غلام حسین کو کیا ہو گیا تھا وقت بے وقت گھرانے لگا تھا کونے کھدروں میں چھپی کوئی نہ کوئی قیمتی چیز روز ہی برآمد کر لیتا اور پھر ایک لمبا تفتیشی عمل جس سے اب اسے چڑ ہونے لگی تھی کچھ دن قبل ہی فرحین کی وہ قیمتی انگوٹھی جو اسے کسی جیولر نے دی تھی غلام حسین کے ہاتھ لگ گئی۔ پھر

کیا تھا بڑی مشکل سے اس نے جھوٹ بول کر جان چھڑوائی کہ انگوٹھی نقلی ہے اور اسے نشا نے گفٹ کی ہے۔

نشا کا تمہیں اس طرح تحائف دینا مجھے بالکل پسند نہیں ہے تم آئندہ احتیاط کرنا اور ہو سکے تو یہ انگوٹھی بھی اسے واپس کر دینا اب ایسے میں اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ اس پرفیوم کے بارے میں کیا وضاحت دے گی جبکہ وہ پہلے ہی اسے نشا سے کوئی تحفہ لینے سے منع کر چکا تھا۔

یہ آیا کہاں سے ہے؟

وہ بوتل کا ڈھکن کھول کر خوشبو سونگھتا ہوا بولا۔

میں نے خریدا ہے۔

وہ ڈھٹائی سے بولی کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

تم نے اتنا مہنگا پرفیوم کیسے خریدا تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی میرے دیے ہوئے پیسوں میں تو گھر کی دال روٹی مشکل پوری ہوتی ہے چار چار بچوں کے ساتھ تم یہ عیاشیاں کیسے پوری کر رہی ہو۔

وہ غصہ سے تنتناتا ہوا اس کے سامنے آن کھڑا ہو گیا۔ فرحین کو لگا اسے فرحین پر شک ہو گیا ہے۔

تم نے کبھی خریدا ہو تو تمہیں پتا ہونا اس کی قیمت کیا ہے؟ جاؤ جا کر دیکھو کسی بچت بازار میں دیکھو زمین پر ڈھیر لگا ہوتا ہے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے میں بکتے ہیں ایسے پرفیوم دہاں غلام حسین اب تمہیں میرا یہ ڈیڑھ سو کا شوق بھی برداشت نہیں اسی گھر میں ساری زندگی میں نے اپنی خواہشوں کو مار کر ہی گزاروی۔

کبھی جو غلطی سے کسی فٹ پاتھ سے بھی کچھ خرید کر لے آؤ تو تمہیں تکلیف شروع ہو جاتی ہے خود لے کر دینے کی اوقات نہیں، لے لو تو برداشت نہیں۔

چیخنے کے ساتھ ساتھ اس نے رونا بھی شروع کر دیا غلام حسین گھبرا گیا خاموشی سے ہاتھ میں پکڑی بوتل چارپائی پر پھینکی نہایت سست روی سے چلتا باہر گلی میں آ گیا۔ کیا صحیح تھا اور کیا غلط تھا اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا مگر کوئی ایسی الجھن ضرور تھی جو اس کے دماغ کو الجھا رہی تھی۔

☆......☆......☆

کاش اس رات میں نے اسے قتل کر دیا ہوتا۔

اس کا گلا ہی دبا دیا ہوتا تو ساری زندگی کی بے سکونی سے نجات مل جاتی۔

وہ مسلسل اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے ایک ہی بات سوچ رہا تھا اسے اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی افسوس تھا کہ اس نے اس عورت کو موقع پر ہی قتل کیوں نہ کر دیا، اس کا قتل شاید اسے اس ذہنی اذیت سے نجات دلا دیتا، جس میں وہ پچھلے کئی سالوں سے گرفتار تھا آج بھی وہ اس امید میں زندہ تھا کاش وہ اسے کہیں مل جائے اور وہ اس ناپاک وجود کو دھرتی سے خالی کر دیتا اور اس کے قتل کے بعد تمہارے بچوں کا کیا بنتا؟ کون ان کی دیکھ بھال کرتا؟ تم تو پھانسی چڑھ جاتے اور اپنی بیٹیوں کو اس دنیا کے جنگل میں بھیڑیوں کے حوالے کر دیتے اور تن تنہا اور بے یار و مددگار کسی نے اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کی اس نے چونک کر سر اٹھایا ساری کوٹھڑی میں کوئی نہ تھا سوائے اس کی اپنی ذات کے تو اب وہ کون سا محفوظ ہیں جانے کن حالوں میں جی رہی ہوں گی کاش میں اس عورت کے ساتھ باقی سب کو بھی مار ڈالتا تو کم از کم اس احساس سے نجات تو حاصل کر لیتا کہ میری بیٹیاں جانے آج کس محفل کی رونق بنی ہوں گی، جانے کیسے کیسے لوگوں سے ان کا

واسطہ پڑا ہوگا۔

کاش میں اتنا بزدل نہ ہوتا وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا باہر کھڑے گارڈ نے ٹارچ سے اندر روشنی ڈالی اس کے آنسوؤں سے سفید داڑھی بھیگ چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی ٹارچ بند کر کے آگے بڑھ گیا۔

کیا وہ اس تمام تماشے کا عادی ہو چکا تھا کیونکہ وہ اس بابا کو پچھلے پانچ سالوں سے اسی طرح دیکھ رہا تھا جب سے اس نے یہاں ملازمت شروع کی تھی۔

☆......☆......☆

اسے چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ شادی سے پہلے وہ چائے کی اس قدر عادی نہ تھی لیکن یہاں روزانہ شام کو پانچ بجے ملنے والی چائے نے اسے کچھ عادی سا کر دیا تھا چھ بج چکے تھے جانے آج اجیہ اسے چائے دینے کیوں نہ آئی تھی بالآخر اس کی ہمت جواب دے گئی وہ خاموشی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر چھوٹے سے صحن میں آ گئی جہاں آپا بچوں کو ٹیوشن پڑھانے میں منہمک تھیں آج کل امتحانوں کا زمانہ تھا اس لیے ان کا ٹیوشن ٹائم بھی طویل ہو گیا تھا۔ اجیہ مشین پر جھکی معمول کے مطابق سلائی کے کپڑے سی رہی تھی۔ وہ بنا کسی سے کوئی بات کہے صحن میں بنے چھوٹے سے کچن میں آ گئی۔ آج وہ پہلی بار کچن میں آئی تھی اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ چائے کا سامان کہاں ڈھونڈے بھابھی آپ کو کچھ چاہیے؟ اجیہ نے اسے دیکھتے ہی کچن کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔

آں...... ہاں۔

وہ کچھ شرمندہ سی ہوگئی، سمجھ ہی نہ آیا کیا کہے۔

وہ دراصل میرے سر میں درد ہو رہا تھا اس لیے چائے بنانے آئی تھی لیکن چائے کا سامان نہیں مل رہا۔

جھجکتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی۔

چائے کا سامان ختم ہو یا ہے ورنہ میں آپ کو خود ہی بنا دیتی۔

اپنی بات ختم کر کے وہ رکی نہیں اور تیزی سے پلٹ کر واپس چلی گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر کیبنیٹ میں رکھے ڈبوں کے ڈھکن اٹھا کر ان میں جھانکا تقریباً سارے ہی خالی تھے۔ اسے ایک پل لگا فیصلہ کرنے میں اور وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی الماری کھول کر یہاں وہاں ہاتھ مارا اپنے پیسوں کی چھوٹی سی پوٹلی برآمد کی یہ رقم وہ اپنی ماں کی الماری سے بنا گنے ہی نکال لائی تھی اسے اندازہ نہ تھا کہ رقم آج کتنی شدید ضرورت پوری کرے گی۔ پوٹلی کے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے کچھ نوٹ گنے اور چادر اوڑھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

اجیہ تم میرے ساتھ مارکیٹ تک چلوگی؟

وہ اجیہ کے سامنے کھڑی سوال کر رہی تھی۔

اجیہ مارکیٹ نہیں جاتی اگر کوئی کام ہے تو میں چلتی ہوں۔

آپا نے بچوں کی کاپیاں چیک کرتے ہوئے نظر اٹھائی اور اس کے اثبات میں گردن ہلانے پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور پھر وہ ان کے ساتھ قریبی مارکیٹ سے ضرورت کی اشیاء خرید لائی دودھ کے ڈبے، چینی، چائے کی پتی، نمک مرچ، دالیں ان سب کے علاوہ اس نے کچھ چکن بھی خرید لیا اسے کبھی کبھی تو شرجیل کی ماں بہنوں پر حیرت ہوتی جب گھر میں پکائے جانے والے گوشت کی ساری بوٹیاں شرجیل کی پلیٹ میں ڈال کر وہ شوربے سے روٹی

ڈبو کر کھاتیں اپنے دو عدد جوڑوں کو باری باری دھو کر استعمال کرتیں اور شرجیل کی ہر ضرورت پوری کرنے کے لیے دل و جان سے حاضر رہتیں جانے یہ کیسی خواتین تھیں جن کی اپنی کوئی خواہش ہی نہ تھی سچ تو یہ تھا ان تینوں خواتین کے بے جا لاڈ پیار نے ہی شرجیل کو اس قدر کام چور اور نکما بنا دیا تھا کہ اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہی نہ رہا تھا انہیں سودے سمیت گھر آتی دیکھ کر مانو شرجیل تو کھل ہی اٹھا۔

''واہ یار گڈ یہ تم نے اچھا کیا جو آڑو خرید لائیں، جانتی ہو یہ میرا فیورٹ فروٹ ہے۔'' تھیلے سے آڑو نکال کر اس نے جلدی جلدی پلیٹ میں ڈالے یہ دیکھے بنا کہ پیچھے کسی کے لیے بچے ہیں بھی یا نہیں، جوہی کو اس کی یہ حرکت سخت بری لگی دل تو چاہا ٹوک دے مگر دیگر باتوں کی طرح یہ بھی برداشت کر گئی اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆......☆......☆

تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے ملک امان اللہ کس قدر ناراض ہو رہا ہے تم سے پورے پندرہ دن سے اس سے نہیں ملی ہو۔

وہ کچھ دنوں سے نشا کی طرف نہ جا سکی تھی یہ ہی وجہ تھی جو آج نشا خود اس سے ملنے آ گئی۔

تم سوچ نہیں سکتیں میں آج کل کتنی پریشانی میں مبتلا ہوں، غلام حسین تو جیسے سارا دن میری نگرانی پر مامور ہو گیا ہے وقت بے وقت گھر کے چکر دن میں کئی بار لگاتا ہے کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے اسے مجھ پر شک ہو گیا ہے وہ دبی دبی آواز میں بولی۔

اس لیے تم سے کہتی ہوں اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لو۔

اس کی بات پر فرحین نے گھبرا کر سامنے دیکھا جہاں فیھا دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی گڑیا سے کھیلنے میں مصروف تھی اس کے براؤن بال اڑ اڑ کر منہ پر آ رہے تھے گڑیا سے کھیلتی وہ خود بھی گڑیا لگ رہی تھی۔ یہ بھی تمہاری بیٹی ہے؟ نشا نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا ہاں احسن سے دو سال بڑی ہے۔

بڑی خوبصورت ہے جس ماں کے پاس ایسا قیمتی خزانہ ہو وہ کبھی بھوکی نہیں مر سکتی۔ وہ معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

بحر حال سب سے پہلے تو غلام حسین کا کوئی بندوبست کرو ابھی تو وقت ہے تھوڑے سی کوشش کر کے تم ماریہ کو ٹاپ کی ہیروئن بنوا سکتی ہو یہ وقت نکل گیا تو پھر اس کی جوانی کے انتظار میں انگلیوں پر سال گنوں گی۔'' اس کا واضح اشارہ فیھا کی طرف تھا فرحین کی طرف سے جواب نا پا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

چلو میں چلتی ہوں مگر تم ملک امان کے لیے کوئی راستہ نکالو وہ تو اتا ؤلا ہوا جا رہا ہے تمہارے لیے ایک ہی دفعہ کی ملاقات نہیں بھول پا رہا وہ آنکھ مارتے ہوئے بولی۔

بہت مشکل ہے نشا اس سے کہو تھوڑا صبر کر لے۔ اس کی آواز اب بھی دھیمی تھی۔

ویسے ایک مشورہ دوں اگر تم مانو تو......

ہاں بولو...... نشا اس کے کان کے قریب آہستہ آہستہ کچھ منمنائی۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ یک دم بدک گئی۔

''غلام حسین کو پتہ چل گیا تو مجھے جان سے ہی مار دے گا نہ بابا نہ میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی۔'' خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

دیکھو فرحین یہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں ہے بس ذرا ہمت کی ضرورت ہے پر...... وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

پھر بھی نشا۔

کچھ نہیں ہوگا میں تمہیں نیند کی گولیاں لا دوں گی روزانہ رات کو کسی طرح دو گولیاں اسے کھلا دیا کرنا بڑی گہری نیند سوئے گا اسے پتہ بھی نہ چلے گا گھر میں کون آیا ہے اور چلا گیا میری کئی دوستیں ایسے کام کر رہی ہیں وہ کون سا زیادہ وقت لے گا زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے اور تم فارغ کچھ نہ سہی تو کم از کم ملک صاحب سے تو ایک آدھی ملاقات کر لو پھر آگے تمہاری مرضی۔

وہ اسے ایک نیا راستہ دکھاتے ہوئے بولی یہ سب تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا اسے لگا نشا جو کچھ کہہ رہی ہے بالکل درست ہے ویسے بھی گناہ کی لذت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین کر انسان کو حیوان بنا دیتی ہے ایسا ہی اس کے ساتھ ہوا ہاں البتہ اپنے چھوٹے کمرے کی حالت کچھ درست کر لو پھر بتاؤ جو میں کہہ رہی ہوں صحیح ہے یا غلط اگر غلط کہہ رہی ہوں تو تمہاری مرضی نہ مانو۔ شیطان راستہ سے بھٹکا کر دور کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

ہے تو ٹھیک ہی پر......

وہ ابھی بھی خوف زدہ تھی۔

ڈرو مت صرف ایک آدھ بار کا خوف ہوتا ہے پھر سب کچھ آسان ہو جائے گا۔'' وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی اندر آتے ہوئے غلام حسین کو حیرت ہوئی کہ گولڈن بالوں میں بغیر آستین کی قمیض پہنے یہ عورت کون تھی جو اس کے گھر سے پورے اشتیاق کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ یہ یقیناً نشا تھی بغیر فرحین سے پوچھے ہی وہ جان گیا تھا یہ اور بات تھی اسے یہ عورت پہلی نظر میں بالکل اچھی نہ لگی مگر اس نے اپنی اس رائے کا اظہار فرحین سے نہ کیا۔

☆......☆......☆

ذرا ایک ہزار روپے تو دے دینا۔

کپڑے تہہ کر کے الماری میں رکھتی جوہی نے پیچھے مڑ کر اپنے عقب میں دیکھا جہاں سجا سنورا سا شرجیل کھڑا تھا۔ اسے شرجیل سے اپنے کسی مطالبے کی فی الحال امید نہ تھی۔

کیونکہ اس نے کل ہی اسے ہزار روپے دیے تھے جو ایک دن میں ختم ہو گئے۔

ایسے کیا دیکھ رہی ہو جاب ملتے ہی تمہارا سارا قرض واپس کر دوں گا۔

وہ بالکل خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی ایسے جیسے کچھ سن نہ رہی ہو اسے یہ سب کچھ سنتے آج کئی ماہ بیت گئے تھے اب شرجیل کی ان باتوں کا جوہی پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

جلدی کرو یار باہر زوہیب میرا انتظار کر رہا ہے خالی ہاتھ گیا تو کیا سوچے گا اس کے گھر میں ایک ہزار کی معمولی رقم بھی نہیں ہے۔

اس کی ڈھٹائی پورے عروج پر تھی۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی ایسے شخص سے کوئی بحث کرنا بے کار تھی جیسے خود کوئی احساس نہ ہو۔ اس نے خاموشی سے الماری کھول کر ایک ہزار روپے نکالے یہ آخری ہزار ہے جو میں تمہیں دے رہی ہوں اب میرے پاس مزید رقم نہیں ہے تمہیں دینے کے لیے اس لیے بہتر ہوگا اپنی ملازمت کا بندوبست کرو۔'' نوٹ پلنگ پر پھینک کر وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی جب پتہ تھا پیسے ختم ہو رہے ہیں تو کیا ضرورت تھی شاپنگ کرنے کی۔ کون سی شاپنگ......؟'' شرجیل کی بات سن کر وہ حیرت سے پلٹی۔

لان کے دو، دو معمولی سوٹ جو میں اپنے اور تمہاری بہنوں کے لیے خرید کر لائی ہوں اسے تم شاپنگ کہتے ہو۔'' اس کے لہجہ میں کڑواہٹ گھلی ہوئی تھی۔

اس لیے کہتا ہوں اب ڈپلومہ مل گیا ہے تو کسی پارلر میں جاب شروع کر دو، کچھ پیسے ملیں گے تو تمہارے ہی کام آئیں گے میں نے ان کا کیا کرنا ہے۔

تم اچھی طرح جانتے ہو میں دو تین پارلرز سے ہو کر آئی ہوں، ابھی تک کہیں سے مجھے کال نہیں آئی اور تمہارے علاقے کا کوئی پارلر تین، چار پانچ ہزار سے زیادہ سیلری نہیں دیتا اور ویسے بھی یہ چھوٹے موٹے گلی محلے کے کھلے ہوئے پارلر میرے اسٹینڈرز کے مطابق نہیں ہیں۔

تو پھر خود اپنا کام شروع کرو۔

اپنے کام کے لیے اتنی رقم کہاں سے آئے گی وہ تو جو کچھ میرے پاس تھا اب تھوڑا تھوڑا کر کے وہ بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اصل میں، میں تم سے کئی دنوں سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اپنے مقصد کی جانب آ رہا تھا۔

میرا ایک دوست ہے اس کی بیوی بھی بیوٹیشن ہے مگر نہ تو وہ کسی پارلر پر جاب کرتی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی پارلر ہے پھر بھی مہینے میں ہزاروں روپے کما رہی ہے اور خوب عیش کی زندگی گزار رہی ہے۔

کوئی کوئی جادو ہے کیا اس کے پاس؟ وہ قدرے چڑ کر بولی۔

اسے اپنے سامنے کھڑے اس شخص پر حیرت تھی جو بجائے خود اپنی بیوی کی ملازمت کے لیے سرگرداں تھا۔'' کاش یہ اتنی کوشش اپنے لیے کرتا تو آج حالات کس قدر مختلف ہوتے۔'' اس نے یہ سب کچھ سوچا ضرور مگر کہا نہیں کیونکہ اس سے اس کا فساد کرنے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔

نہیں خیر جادو تو کوئی نہیں ہے اس کے پاس اصل میں وہ بڑے بڑے بنگلوں میں جا کر ان بیگمات کو سروس فراہم کرتی ہے جو پارلر میں جا کر کام کروانا پسند نہیں کرتیں اور یقین جانو وہ ماہانہ ہزاروں روپے کما رہی ہے جبکہ اس نے یہ کام چند ہزار روپوں سے شروع کیا تھا اب تو کہو تو میں بھی رضا سے کہہ کر تمہیں دو چار بیگمات کا کام دلوا دیتا ہوں اور اگر نہیں تو پھر تمہاری مرضی جو دل چاہے کرو۔

رضا غالباً اس کے دوست کا نام تھا جس کی بیوی پارلر کا کام کرتی تھی اور جس کی تقلید میں شرجیل نے بھی یہ آسان راستہ ڈھونڈا تھا۔

میں تمہیں سوچ کر جواب دوں گی۔

''جیسی تمہاری مرضی۔''

پلنگ پر پڑا ہزار کا نوٹ اٹھا کر اس نے جیب میں ڈالا اور گنگناتا ہوا باہر نکل گیا جویریہ کو اپنے انتخاب پر کوئی افسوس نہ تھا، وہ جانتی تھی اس جیسی لڑکیوں کا نصیب ایسے ہی مرد ہوتے ہیں اچھے نصیب تو شاید ان لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنے ماں باپ کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں اور وہ تو بالکل تہی دامن تھی۔

☆......☆......☆

افوہ اماں مجھ سے نہیں کھایا جا رہا یہ بدمزہ سالن روٹی۔

ماریہ نے اپنے آگے رکھی سالن کی پلیٹ پرے کھسکا دی اور برا سا منہ بنا کر اٹھ گئی۔

لو تو میں کون سا بڑی خوشی سے یہ سب کچھ کھا

رہی ہوں مجبوری ہے پیٹ تو بھرنا ہے نا تم تو جانتی ہو مجھے اچھے اچھے کھانوں کا کس قدر شوق ہے وہ تو جانے تمہارے باپ کو سامنے والے پلازہ میں جس نے مزدوری دلوادی ہر دو گھنٹے بعد پانی پینے کے بہانے گھر آجاتا ہے۔ میں تو خود تنگ آ گئی ہوں یہ دال روٹی کھا کھا کر۔

''بس اماں اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی ابھی سعد کو فون کرتی ہوں مجھے کچھ اچھا سا کھانے کو دے کر جائے۔

''سعد غالباً اس کا کوئی نیا بوائے فرینڈ تھا وہ تو ٹھیک ہے پر سوچ لو اگر اس دوران تمہارا باپ آ گیا تو۔''

''پلازہ بھی تو بالکل سامنے ہی ہے بابا تو وہاں کے کام کے دوران بھی پوری نظر گھر پر رکھتا ہے۔ چلو خیر میں میسج کرتی ہوں پہلے وہ کچھ خرید لے مجھے بتائے پھر جا کر لے آتی ہوں۔

تم خود لینے جاؤ گی......

جواہر نے بھی اچھے کھانے کی لالچ میں سالن اٹھا کر رکھ دیا۔

ہاں برقعہ پہن کر جاتی ہوں کیا پتا چلے گا کون ہے پندرہ منٹ کی تو بات ہے پچھلی گلی میں تو اس کا اسٹور ہے وہاں سے گھر آنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے بس دعا کرنا کھانے کے دوران بابا نہ گھر آ جائے ورنہ پھر ایک لمبی تفتیش کا عمل شروع ہو جائے گا اور میں تو آج کل اس عدالتی کارروائی سے بڑی تنگ آئی ہوئی ہوں۔

تم سے زیادہ تو میں تنگ آ گئی ہوں صرف اس ناکارہ شخص کی وجہ سے ملک امان جیسی موٹی آسامی ہاتھ سے نکل گئی۔

ارے چھوڑو اماں تمہیں ملک سے بھی بڑی پارٹی ہاتھ لگ جائے گی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔

ابھی تو یہ بتاؤ تم نے کھانا کیا ہے۔

وہ پیچ تاب کرتے ہوئے بولی۔

☆......☆......☆

پتہ نہیں آج کل اسے کیا ہوتا جا رہا تھا ہر وقت غنودگی سی طاری رہتی شام چھ سات بجے جو گھر آ کر کھانا کھاتا اور ایک کپ چائے کا پی کر ایسی مدہوشی والی نیند سوتا کہ عشاء کے ساتھ ساتھ فجر بھی رہ جاتی اسے یاد نہ پڑتا تھا کہ اس نے کبھی زندگی میں اپنی نماز چھوڑی ہو مگر اب تو روز ہی عشاء اور فجر رہ جاتیں وہ از حد پریشان تھا پہلے سوچا فرحین سے ذکر کرے مگر پھر اپنے اس خیال کو خود ہی جھٹلا دیا ویسے ہی بہت کم صرف ضرورتاً اس سے بات کرتی تھی، ایسے میں بھلا وہ اس سے کیا اپنی کیفیت بیان کرتا مگر نورالدین سے وہ اپنی حالت چھپا نہ سکا۔

مجھے لگتا ہے میرے اندر کوئی بیماری پرورش پا رہی ہے ہر وقت تھکن طاری رہتی ہے نیند کا یہ عالم ہے کام کے دوران بھی جھونکے آتے رہتے ہیں ڈر لگتا ہے کہیں چھت بھرائی کے دوران گر ہی نہ جاؤں۔

آج کل پلازہ میں چھت بھرائی کا کام جاری تھا۔

میری بات مانو تو کھانے کے بعد چائے پینا بالکل چھوڑ دو تم چند دنوں میں ہی چنگے بھلے ہو جاؤ گے۔'' نورالدین نے ساری بات سن کر اسے مشورہ دیا بھلا! میری بیماری سے چائے کا کیا تعلق ہے؟

نورالدین کا مشورہ اسے کچھ عجیب سا لگا۔

تمہاری ساری بیماری کی جڑ وہ چائے ہے جو تم گھر جا کر پیتے ہو۔

مطلب......؟ وہ واقعی نہ سمجھ پایا نورالدین کیا

کہنا چاہتا ہے۔

مطلب، ہے کہ مجھے لگ رہا ہے جیسے تمہاری بیوی تمہیں چائے میں کوئی نشہ آور دوا دے رہی ہے جس سے تمہارے اعصاب سن ہو رہے ہیں۔

ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ بے یقینی کی کیفیت میں گھبرا کر بولا۔

بھلا وہ مجھے نشہ آور دوا کیوں دے گی؟ میرا خیال ہے تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

اس نے نورالدین کی بات کو حتمی طور پر جھٹلا دیا۔

ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو مگر پھر بھی میرا مشورہ ہے دو چار دن گھر جا کر چائے پینے سے گریز کرو اگر پھر بھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہ ہو تو میرے ساتھ چلنا میرا ایک جاننے والا کسی سرکاری اسپتال میں ملازم ہے اس سے بات کر کے تمہارا چیک اپ کروا دوں گا۔

مگر میں تو کھانے کے بعد چائے ضرور پیتا ہوں اس کے بغیر مجھے نیند ہی نہیں آتی چلو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے نیند نہ آنے کی صورت میں تمہیں ساری صورتحال کا بہتر طور پر پتہ چل سکے گا۔

کون سی صورتحال؟

وہ پھر سمجھ نہ پایا نورالدین کیا کہنا چاہتا ہے۔

وہ میں بعد میں بتاؤں گا بہر حال تم آج رات کے بعد اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھ کر سونے کی کوشش کرنا فائدے میں رہو گے۔

اسے نورالدین کی باتیں سمجھ نہ آ رہی تھیں پھر بھی وہ جان چکا تھا کہ نورالدین کیا کہنا چاہتا ہے وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے گھر آ گیا۔

☆......☆......☆

ایکسکیوزمی مس۔

اجنبی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔

وہ اجنبی یقیناً پاکستانی تھا اس کی اردو خاصی صاف تھی وائے ناٹ شیور۔''

اپنے سامنے رکھے ہاٹ اینڈ سار میں چیچ ہلانے کا شغل مستقل جاری رکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں تو۔

جی پندرہ منٹ کی خاموشی کے بعد اس کی آواز پھر سے سنائی دی۔

''جی ضرور......'' اس کی نظروں میں جانے ایسا کیا تھا جو اس جیسی بولڈ اور کس قدر آزاد خیال لڑکی بھی نروس ہو گئی۔

آپ اپنے باقی اسٹاف کو چھوڑ کر یہاں تنہا کیوں بیٹھی ہیں۔

وہ ڈائننگ فلور کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

ویسے ہی میرا موڈ نہ تھا۔

اسے کیسے پتہ چلا کہ میں اپنے اسٹاف کے ساتھ ہوں۔'' اس نے دل میں سوچا ضرور مگر بولی نہیں وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی سنگاپور کے اس مشہور چائنیز ریسٹورینٹ میں ڈنر کے لیے آئی تھی۔ یہاں آتے ہی اس کے تمام ساتھی یہاں وہاں اپنی اپنی موج مستیوں میں گم ہو گئے کیونکہ اسے ان سب سے کوئی دلچسپی نہ تھی یہ ہی وجہ تھی جو وہ اپنے لیے سوپ کا آرڈر دے کر ایک تنہا گوشے میں آ بیٹھی۔

آپ ضرور سوچ رہی ہوں گی کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ آپ ایک ایئر ہوسٹس ہیں اور اپنی فلائیٹ کے ساتھ کل شام ہی یہاں پہنچی ہیں دراصل میں کوئی نجومی نہیں ہوں۔ سامنے والا شخص خاصا

باتونی تھا۔

شاید آپ کو یاد نہیں ہے میں بھی کل آپ کی فلائیٹ میں تھا میری کل یہاں ایک میڈیکل کانفرنس ہے اسی ہوٹل میں وہ کانفرنس ہے جہاں ہمیں بریفنگ دی جائے گی یہی وجہ ہے جو آج آپ کو یہاں دکھائی دے رہا ہوں۔ انشاء اللہ ایک ہفتہ تک واپس پاکستان لوٹ جاؤں گا۔

بنا کچھ پوچھے ہی وہ ایک کے بعد ایک تمام تفصیل بتاتا چلا گیا حالانکہ اس کی یہ تمام تفصیل اس کے لیے بالکل بے کار تھی۔

آپ کھانا کھائیں گی؟

کھانے کا آڈر دیتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا نو تھینکس.....

جواب دے کر اس نے ہینڈ بیگ سے اپنا موبائل نکال لیا، اس شخص کو نظر انداز کرنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ خود کو انٹرنیٹ پر مصروف کر لیا جائے اسی خیال کے تحت وہ نیٹ ان کر کے فیس بک پر آ گئی، مکمل انہماک کے ساتھ اپنی نوٹیفکیشن چیک کر رہی تھی جب اسے سامنے بیٹھے شخص نے ایک بار پھر سے پکارا۔

''او کے مس تھینک یو سو مچ آپ کی کمپنی کا یقین جانیں میں نے بہت انجوائے کیا۔'' وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

مگر میں نے تو آپ کو کوئی کمپنی نہیں دی پھر آپ نے انجوائے کیسے کیا؟

وہ اس شخص کے طنز کو سمجھتے ہوئے بولی۔

وہ آپ نہیں سمجھ سکتیں لہذا جانے دیں اور اگر ایک بات پھر آپ برا نہ مانیں تو میرا یہ وزیٹنگ کارڈ ضرور رکھ لیں شاید زندگی میں کبھی آپ کے کسی کام آ سکوں۔ اس پر میرا نام، ایڈریس، سب کچھ ہے آپ جب فون کریں گی میں ضرور پہچان جاؤں گا کیونکہ کل آپ کے یونیفارم پر لگے بیج کی بدولت میں آپ کا نام جان چکا ہوں اور یقین جانیے نہ صرف آپ بلکہ آپ کا نام بھی بہت خوبصورت ہے۔ اپنی پروفیشنل لائف میں وہ اس طرح کی تعریف کئی بار سن چکی تھی۔ لہذا بنا کوئی دھیان دیے خاموشی سے اس کے ہاتھ میں دبا وزیٹنگ کارڈ تھام لیا۔

اسے پھاڑ کر مت پھینک دیجیے گا کبھی کبھی ایسی بے کار چیزیں بھی کار آمد ثابت ہوتی ہیں۔

وہ شاید خیالات پڑھنے کا ماہر تھا۔

''اچھا جی اللہ حافظ زندگی رہی تو مجھے امید ہے آپ سے پھر دوبارہ ملاقات ضرور ہوگی۔''

اپنی بات ختم کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

عجیب بے وقوف آدمی تھا نہ جان نہ پہچان خواہ مخواہ ہی فری ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ٹیبل پر رکھا ہینڈ بیگ اٹھایا نظر سامنے رکھے وزیٹنگ کارڈ پر پڑی۔

ڈاکٹر عبدالصمد جلی حروف میں لکھے اس کے نام کے آگے کئی ڈگریاں درج تھیں۔ اس نے کچھ دیر ہاتھ میں لے کر کارڈ دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔

☆......☆......☆

کہیں کوئی کھٹکا ہوا ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی نور الدین کی ہدایت کے مطابق وہ شام کی چائے تقریباً ترک کر چکا تھا۔ جس کا علم فرحین کو اب تک نہ ہوا تھا شروع کے کچھ دن سابقہ بے خودی اس کے حواس پر سوار رہی وہی بے خبری کی نیند جو نماز فجر کی قضا کا سبب بنتی تھی، کام کے دوران بھی ہلکی ہلکی غنودگی کا شکار رہا تو یہ احساس شدت سے اس کے ذہن پر سوار ہوا کہ نور الدین

کا تجزیہ بالکل غلط تھا، اس کی غنودگی کا سبب جائے ہرگز نہیں تھی بلکہ شاید وہ کسی بیماری کا شکار ہوگیا تھا۔ اس نے جمعہ کو تو نورالدین کے پاس جانا تھا اور جمعرات کی ساری رات کروٹیں بدلتے بدلتے گزر گئی نیند، غنودگی، بے خودگی یہ سب کی سب ایسے اڑن چھو ہوئیں جیسے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا تھا اس دن وہ تھوڑا سا کھٹکا اور پھر ایک کے بعد دوسرے دن بھی معمول کی نیند آئی جس سے اسے لگا شاید نورالدین نے جو کہا تھا وہ کسی حد تک درست تھا اب وہ جاننا چاہتا تھا اگر فرحین اسے نشہ آور دوا دے رہی ہے تو کیوں؟ یہ سوال اسے شدت سے اس کے ذہن پر سوار ہو کر بے چینی کا سبب بن رہا تھا یہ ہی وجہ تھی جو بہت محتاط سوتا تھا کہیں باہر بھی ہونے والے کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل جاتی اس کی مکمل کوشش تھی کہ اس کی اس کیفیت کا علم فرحین کو نہ ہو اسی سبب جب بھی وہ جاگتا خود کو نیند میں ہی ظاہر کرتا ابھی بھی ایسا ہی ہوا کھٹکے سے آنکھ کھلنے کے باوجود وہ کچھ دیر دم سادھے اپنی چارپائی پر پڑا رہا پانچ دس منٹ کے انتظار کے بعد اس نے دھیرے سے کروٹ بدل کر ساتھ والی چارپائی پر نظر ڈالی فرحین اپنے بستر پر موجود نہ تھی۔ غالباً وہ باتھ روم گئی تھی بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے اس کی حساس سماعتوں نے مدہم سی ہنسی کی آواز سنی رات کے تین بجے سنائی دینے والی ہنسی کی آواز اندر کمرے سے آئی تھی وہ بغیر آواز پیدا کیے نہایت خاموشی سے اٹھا چپل پہنے بنا ہی کمرے کے دروازے پر جا پہنچا جو کھلا ہوا تھا۔ چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر اندر جھانکا، جہاں مکمل سکوت طاری تھا ایک چارپائی پر ماریہ اور جواہر تھیں دوسری پر احسن جبکہ فیصا نیچے بچھے بستر پر سوئی تھی۔ فرحین کمرے میں نہ تھی کسی غیر معمولی

احساس کے تحت اس نے ساتھ والے چھوٹے سے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا۔ یہ کمرہ پہلے اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا، گھر کے بستر، ٹرنک اور فالتو سامان یہاں ہی جمع تھا، کچھ عرصہ قبل فرحین نے اس کی صفائی کر کے یہاں ایک چارپائی رکھ دی تھی۔ اس کے خیال میں احسن کو اپنی بہنوں سے الگ سونا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کاٹھ کباڑ سمیٹ کر ایک ٹیبل اور دو کرسیاں بھی وہ کہیں سے لے آئی تھی۔ جس دن سے اس نے پرفیوم پر ایک ہنگامہ کھڑا کیا تھا اس دن سے غلام حسین اس کے کسی بھی مسئلہ میں بہت کم بولتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی جو وہ اس سارے عمل کے دوران خاموش تماشائی بنا رہا اب جو فرحین کو غائب پایا تو سارا دھیان اسی کمرے کی جانب چلا گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر ہلکا سا دھکا لگایا، اندر سے بند کنڈی اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ فرحین اندر ہی ہے مگر اندر سے دروازہ بند کیوں ہے؟ غلام حسین بے چین ہو اٹھا ایسے میں اگر وہ دروازہ بجاتا تو فرحین ہوشیار ہو جاتی اسی خیال کے زیر اثر اس نے بنا سوچے سمجھے دروازے پر ایک زوردار ٹکر ماری ایک کے بعد ایک دوسری پھر تیسری ضرب جو کمزور دروازہ بالکل برداشت نہ کر سکا اس کا ایک پٹ ٹوٹ کر دور جا گرا سامنے نظر آنے والے منظر نے غلام حسین سے اس کے حواس چھین لیے اس کا خون گردش کرتا کنپٹیوں میں آ کر جم سا گیا۔ سامنے فرحین تنہا نہ تھی اس کے ساتھ ایک انجانا سا شخص بھی تھا جسے اس سے قبل غلام حسین نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دروازے پر پڑنے والی مسلسل ضربوں نے دونوں کو ہوشیار کر دیا تھا جیسے ہی دروازہ کھلا وہ شخص غلام حسین کو دھکا دیتا باہر کی سمت بھاگا اس

کا تعاقب کرنا سوائے بے وقوفی کے کچھ نہ تھا، اصل فساد کی جڑ تو وہ عورت تھی جو اس وقت غلام حسین کے سامنے کھڑی تھی فرحین کو امید نہ تھی کہ غلام حسین ملک الموت کی طرح اچانک اس کے سر پر آن کھڑا ہوگا وہ تو جانے کب سے یہ گھناؤنا کھیل رہی تھی اور اب جو کچھ ہوا اتنا تیزی سے ہوا کہ وہ سمجھ نہ پارہی تھی کہ اپنا بچاؤ کس طرح کرے اسے غلام حسین کی آنکھوں میں خون اترتا ہوا محسوس ہوا۔

بے غیرت عورت نورالدین سچ کہتا تھا تو اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے یہاں وہاں منہ مارتی ہے، جوان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے تو گھر پر میری موجودگی میں غیر مرد بلاتی ہے۔میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

دیکھو غلام حسین میری بات سنو۔

غلام حسین نے اسے جملہ مکمل کرنے کی بھی مہلت نہ دی اور ایک ہی جست میں چھلانگ لگا کر اس کا گلا دبوچ لیا بے شک وہ کمزور سا شخص تھا مگر پھر بھی مرد تھا اور جانے اس وقت اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ فرحین کو لگا اس کی زندگی صرف چند سانسوں کی محتاج رہ گئی ہے اس نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے اس شور شرابے میں چاروں بچے بھی جاگ گئے اور اب وہ حواس باختہ سے کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے یہ منظر دیکھ کر فیما اور احسن رونے لگے جبکہ جواہر اور ماریہ غلام حسین سے فرحین کو چھڑوانے کی کوشش کرنے لگیں فرحین نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے آخری کوشش کے طور پر اپنا گھٹنا غلام حسین کے پیٹ پردے مارا ایک سیکنڈ کے لیے غلام حسین کی گرفت ڈھیلی پڑگئی وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کی گرفت سے باہر نکلی وہ سمجھ گئی تھی آج غلام حسین اسے زندہ نہ چھوڑے گا، ایک نظر اس نے ماریہ پر ڈالی جو اپنے ماں باپ کو روکنے کے لیے اس سے گتھم گتھا تھی اور پھر ایک ہی پل میں اس کے شیطانی دماغ نے ایک منصوبہ تیار کرلیا۔نشا صحیح کہتی تھی غلام حسین سے نجات ہی اس کی زندگی میں بہار لاسکتی تھی۔ورنہ ساری زندگی اس ڈربہ نما گھر میں گزر جاتی۔اور آج کا دن غلام حسین سے نجات پانے کا دن تھا وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ایک ہی سیکنڈ میں ماریہ کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اس کی قمیض سامنے سے پھٹ گئی ماریہ کی سمجھ میں نہ آیا اس کی ماں نے ایسا کیوں کیا جبکہ غلام حسین مکمل طور پر اپنے حواس کھو چکا تھا، فرحین تیزی سے باہر نکلی اور صحن میں جاتے ہی شور مچا دیا کیونکہ وہ جانتی تھی اس شور شرابہ سے کم از کم ساتھ والے گھر کی خالہ سلمی ضرور جاگ جائیں گی ویسے بھی اس چھوٹی سی کالونی میں جہاں ایک دیوار سے دوسری دیوار ملی ہو رات کے اس سمے شور کی آواز دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔

ارے کوئی جلدی سے آؤ میری بیٹی کو بچاؤ اس ظالم کے ہاتھوں۔

وہ چیختی جارہی تھی اس کی چیخ و پکار سن کر غلام حسین کی نظر جو ماریہ پر پڑی وہ اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ماریہ زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔اس کا حلیہ پھٹے کپڑے، بکھرے بال لیکن شاید وہ اب بھی نہ جان پاتا کہ اس شیطان عورت نے کیا منصوبہ تیار کرلیا ہے وہ تو یک دم اپنے گھر میں داخل ہونے والے محلے داروں کی یلغار دیکھ کر حیران ہوگیا وہ سب اس کی طرف عجیب و غریب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ان سب کے آگے فرحین تھی زور زور

سے روتی ہوئی فرحین۔ یہ شیطان اپنی سگی بیٹی کو زبردستی گھسیٹ کر اس کمرے میں لے گیا اس نے اندر سے کنڈی بھی لگائی تھی وہ تو شکر ہوا دروازہ کمزور سا تھا ہم سب نے مل کر زور لگایا تو ٹوٹ کر گر گیا۔

فرحین کے الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ جو کسی نے اس کے کانوں میں ڈال دیا تھا کاش زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتا کسی عورت نے آگے بڑھ کر بستر کی چادر روتی ہوئی ماریہ پر ڈال دی۔ غلام حسین نے ایک نظر اپنے بچوں پر ڈالی جو اہرا اپنی ماں کے ساتھ کھڑی رو رہی تھی۔ احسن اور فیہا جانے کہاں تھے اسے نظر ہی نہ آئے وہ تو اپنے گھر میں موجود لوگوں میں سے بھی صرف چند ایک سے ہی واقف تھا۔

''یہ عورت جھوٹ کہہ رہی ہے یقین نہ آئے تو میری بیٹی سے پوچھ لو۔''

اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا وہ لڑکھڑاتے لہجہ میں بولا فرحین کے الزام نے اسے زندہ درگور کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ لوگوں کو صحیح اور غلط کا پتہ چل سکے۔ اس کی آخری امید ماریہ تھی اسے امید تھی کہ کوئی بیٹی اپنے سگے باپ پر اتنا گھناؤنا الزام نہیں لگائے گی۔ اسی امید نے اسے مجبور کیا کہ وہ ماریہ کی گواہی طلب کرے۔

''میری ماں نے جو کہا بالکل سچ تھا یہ شخص ایک شیطان ہے یہ تو باپ کہلانے کے لائق ہی نہیں ہے۔''

روتی ہوئی ماریہ کے لفظوں نے غلام حسین سے اس کا سب کچھ چھین لیا، وہ کہاں کھڑا تھا سامنے کھڑے لوگ کون تھے اسے کچھ یاد نہ رہا اسے لگا شاید وہ واقعی شیطان ہے جس نے اپنی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے کیونکہ دنیا کی کوئی بیٹی اپنے سگے باپ پر ایسا الزام نہیں لگا سکتی۔

''اب بولو کیا کہتے ہو ابھی بھی کہو گے کہ تمہاری بیوی جھوٹی ہے۔

پولیس کو کس نے بلایا اسے پتہ نہ چلا سوال کرنے والے شخص پر جو نظر ڈالی تو وہ شاید کوئی انسپکٹر تھا۔

''نہیں میری بیٹی نے جو کہا وہ سچ تھا۔''

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا۔

اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا وہ جان چکا تھا اب کچھ بھی کہنا بے کار ہے اس نے ایک نظر ماریہ پر ڈالی اور وہ جملہ ادا کیا جس نے اسے کھڑے کھڑے زندہ دفن کر دیا۔

بے غیرت آدمی شرم نہیں آتی، اتنی گھناؤنی حرکت کرنے کے بعد بھی اسے اپنی بیٹی بولتے ہوئے۔

انسپکٹر کے زوردار تھپڑ نے اس کے ہونٹوں کو خون سے بھر کر رکھ دیا اور پھر دوسرے ہی پل کئی لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔

اس نے اپنے بچاؤ کی کوشش نہ کی وہ روتا ہوا زمین پر گر گیا۔

چھوڑ دو میرے بابا کو مت مارو چھوڑ دو۔ انہوں نے کچھ نہیں کیا۔

وہ آخری الفاظ جو اس کے کانوں نے سنے فیہا کے تھے۔ اس کی روتی کرلاتی آواز آج بھی غلام حسین کو یاد آتی تھی۔ وہ آج بھی ہر چھوٹی بچی میں فیہا ڈھونڈتا تھا اور ہر جوان لڑکی اسے ماریہ کا چہرہ دکھتا تھا ہر گزرتا دن کے ساتھ اس کے دل میں ماریہ اور فرحین کے قتل کی خواہش زور پکڑتی جا رہی تھی وہ پچھتاتا کہ اس رات اس نے ان دونوں کو زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ اے کاش!

☆......☆......☆

ایک بات کہوں نوفل؟

حرم نے پرسوچ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟

تم اسے ساری بات بتا کیوں نہیں دیتے۔اس کا اشارہ کس سمت تھا،نوفل فوراً ہی سمجھ گیا۔

تم اچھی طرح جانتی ہو اس کی کیا وجہ ہے میں اب لاکھ چاہتے ہوئے بھی اسے سچائی نہیں بتا سکتا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

تو پھر میرا ایک مشورہ مانو۔

وہ پرسوچ لہجہ میں بولتے ہوئے بیڈ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس وقت وہ کسی ذہنی کشمکش کا شکار ہے۔

تم اس سے شادی کرلو۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جب وہ بولی تو اس کی آنکھیں رندھی ہوئی تھیں۔

تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے جانتی ہو یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟

نوفل نے اپنے لب بھینچتے ہوئے اس کی جانب تکا،حرم کے چہرے پر نظر آنے والے واضح اطمینان نے اسے بے چین سا کر دیا۔اس کے ردعمل کے برخلاف وہ بالکل پرسکون لگ رہی تھی جیسے وہ اس بات کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔

ہاں بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے تمام احسانوں کا اس سے بہتر بدلہ ہم اسے دے بھی نہیں سکتے۔

اور میرا خیال ہے کہ میں بدلہ دینا بھی نہیں چاہتا کیونکہ جو کچھ تمہارے لیے اس نے کیا ہے وہ محض ایک انسانی ہمدردی اور اس کی نیکی تھی جس کا صلہ یقیناً اسے اللہ تعالیٰ ضرور دے گا اور اس کا دیا گیا اجر ہمارے بدلہ سے ہزار گنا بہتر ہوگا اور جو میں نے کیا وہ بحرحال میری مجبوری تھا۔

صرف انسانی ہمدردی اور نیکی؟ حرم نے چھبتے ہوئے لہجہ میں سوال کیا۔

آپ اچھی طرح جانتے ہیں انسانی ہمدردی کا پس منظر کیا ہے؟ وہ آپ سے محبت کرتی ہے جس نے اسے اس نیکی پر اکسایا ورنہ مجھ جیسی نجانے کتنی لڑکیاں مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر سرکاری اسپتالوں میں رُل جاتی ہیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا مجھے حیرت ہے یہ سن کر کہ آپ اس کی محبت کو محض ہمدردی گردان رہے ہیں۔نہیں نوفل وہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو محبوب کے کتے کو بھی اتنا ہی عزیز جانتے ہیں جتنا اپنے محبوب کو۔

حرم کی بات سو فیصد درست تھی مگر پھر بھی یہ طے تھا کہ جو بھی ہوا کم از کم اس ہمدردی کا بدلہ نوفل اسے شادی کی صورت میں نہیں دے سکتا تھا اور یہ بات حرم اچھی طرح جانتی تھی۔ پھر بھی جانے کیوں آج اس طرح کی فضول باتیں کر رہی تھی۔ ایک سیکنڈ کے لیے نوفل کو اس کی دماغی حالت پر شبہ بھی ہوا ورنہ عام حالات میں کوئی بھی عورت اس طرح کے مشورے نہیں دے سکتی جسے آج حرم دے رہی ہے۔

چلو مان لیا آپ اس کی نیکی کا بدلہ شادی کی صورت میں نہیں دے سکتے مگر کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس نیکی کے بدلے آپ اب تک

اسے کتنا دھوکہ دے چکے ہیں۔ اپنے ذاتی مفاد اور فائدے کے لیے اب تک کتنا جھوٹ اس غریب سے بولا ہے اور جب اسے سچائی کا علم ہوگا تو کیا وہ جی پائے گی؟ آپ کی اصلیت جان کر اس کا اعتماد کس قدر مجروح ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ محبت پر سے اس کا یقین بھی ختم ہو جائے گا۔

تیز تیز بولتے ہوئے حرم کو ایک دم ہی سانس چڑھ گیا۔

پلیز حرم لیواٹ! تم ان سب باتوں کی مذید ٹینشن مت لو۔ ویسے بھی وہ کافی مضبوط اعصاب کی مالک لڑکی ہے۔ اس پر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر نہیں ہوتا اور دوسرا یہ کہ یہ میرا مسئلہ ہے میں وقت آنے پر اسے خود ہی ہینڈل کرلوں گا اور جو رقم وہ اب تک تمہارے علاج کے لیے دے چکی ہے وہ ہمارے لیے یقیناً ایک بڑی رقم ہے مگر اس کے نزدیک اس پیسے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بحر حال پھر بھی مجھے اگر زندگی نے موقع دیا تو اس کی دی ہوئی تمام رقم اسے ضرور واپس کردوں گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔

جانے یہ آخری جملہ نوفل نے اپنے دل کی تسلی کے لیے کہا تھا یا حرم کی وہ سمجھ نہ پائی مگر جو بھی تھا حرم کو نوفل کا یہ انداز گفتگو پسند نہ آیا اور نہ ہی اسے نوفل کی یہ خود غرضی اچھی لگی اپنی محسن کو اس طرح دھوکہ دینا اب کم از کم حرم کے لیے نا قابل برداشت ہوتا جارہا تھا۔'' نوفل نہ سہی مگر اب اسے جلد ہی ہر بات سچ سچ بتادوں گی۔

اپنے دل میں مضبوطی سے یہ عہد کرتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں ویسے ہی اب ملاقات کا وقت ختم ہونے والا تھا اور کچھ ہی دیر میں نوفل کو چلے جانا تھا۔

☆......☆......☆

مالک مکان کے زور زور سے چلانے کی آواز اندر کمرے تک آرہی تھی۔ جوہی نے ایک نظر سامنے بیڈ پر لیٹے شرجیل پر ڈالی جو آنکھوں پر بازو رکھے بظاہر خود کو سوتا ظاہر کررہا تھا مگر وہ جانتی تھی وہ نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ باہر مالک مکان ارشد بھائی کی موجودگی سے بھی بخوبی واقف ہے۔ تین ماہ کے کرایہ کی عدم ادائیگی کے سبب باہر موجود آپا کی دل کھول کر بے عزتی کررہا تھا اس کی بدتمیزی کے جواب میں کبھی کبھی آپا کی منمناتی آواز بھی سنائی دیتی جو جلد ہی اس شخص کی گرج میں دب جاتی۔ جوہی کو سب سے زیادہ حیرت شرجیل کی ڈھٹائی پر تھی جسے سوائے اپنی ضروریات کے کسی دوسرے کا کوئی احساس نہ تھا وہ اپنی روٹین کے مطابق بارہ بجے اٹھتا، ناشتہ کر کے جو تیار ہوکر نکلتا تو رات بارہ بجے ہی گھر گھستا، سننے میں آیا تھا کہ آج کل اس نے کسی امیر شخص کی ادھیڑ عمر بیوی سے افیئر چلا رکھا ہے جسے وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔ اس کے قیمتی ملبوسات، پرفیوم جوتے غرض ہر چیز یہ آج کل وہ عورت دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹا رہی تھی مگر جوہی کو اب ان تمام باتوں سے کوئی غرض نہ تھی وہ تو جب سے اس گھر میں آئی تھی زندگی کا ایک دوسرا رُخ اس کے سامنے آیا تھا۔ جس نے اس عشق و عاشقی کا سبق مکمل طور پر بھلا دیا تھا صحیح معنوں میں اسے یہاں آکر زمانے کی سرد و گرم کا احساس ہوا تھا۔ زندگی میں روپیہ کس قدر اہمیت کا حاصل ہے اس گھر میں چھ ماہ کی رہائش نے اسے بتا دیا تھا اپنی ماں کے گھر اسے ہمیشہ کچن کو راشن سے بھرا ہی پایا ایک بڑی مست زندگی تھی جس کی وہ عادی نہ تھی۔

(اس دلچسپ ناولٹ کی اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

موسم محبتوں کا

''یا اللہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیا چاہتا ہوں، پہلے صبغہ کے ساتھ کے لیے دل بے چین ہو رہا تھا اب جب موقع آیا ہے تو شادار یاد آنے لگی ہے۔ کیا کروں اللہ میری مدد کر میرے مولا میری مدد کر۔'' اُس نے بے بسی سے اپنے بال دونوں مٹھیوں میں بھینچے۔ دل میں جب......

''کتنی بار تمہیں بولوں کہ میرے سامنے اپنی منحوس صورت لیے یوں پتھر کی بت بن کر کھڑی مت ہوا کرو، زہر لگتی ہو مجھے، اپنی منحوس صورت سمیت دفعان ہو جاؤ۔'' وہ جو کھانے کی ٹرے اُس کے سامنے رکھ کر میکے جانے کی اجازت لینے کے لیے کھڑی تھی لیکن زبان الفاظ کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ حنان کے یوں جھڑکنے پر ہمیشہ کی طرح گھبرا گئی۔

''وہ مجھے ضروری بات کرنی تھی آپ سے۔'' آخر ہمت کر کے وہ کہہ گئی۔

''فرماؤ کیا ارشاد فرمانا ہے۔'' اُس نے نوالہ منہ میں ڈالتے طنز کیا۔

''وہ مجھے دراصل امی کے گھر جانا تھا، نوین کے سسرالی شادی کی ڈیٹ رکھنے کے لیے آ رہے ہیں کل، تو اگر میں آج رات وہاں رُک جاؤں۔'' ڈرتے ڈرتے اُس نے بات مکمل کر کے اُس کی طرف بڑی آس سے دیکھا۔

''ہاں ہاں بھئی ضرور جاؤ دو دن کے لیے کیوں ہفتے کے لیے جاؤ، میرے سر سے تو اُترو کچھ دن کے لیے جاؤ، جاؤ جا کے تیاری کرو میں رکشہ لے کر آتا ہوں۔'' وہ خوشی کے مارے جلدی جلدی کھانا ختم کرنے لگا۔ تو 'شادار' بھی اجازت ملتے ہی جانے کی تیاری کرنے لگی۔ مبادا کہ اُس کا موڈ دوبارہ خراب نہ ہو جائے۔

☆......☆......☆

''یہ کیا، تمہاری وہ چہیتی بیوی نظر نہیں آ رہی کہیں گئی ہوئی ہے کیا؟'' صبغہ نے بیڈ پر گرتے ہوئے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

''ہاں دو دن کے لیے سر سے اُتری ہے۔ ماں کے گھر گئی ہے۔ اسی لیے تو تمہیں فون کر کے بلایا کہ اب دو دن میں ہوں گا اور تم...... اچھا تو اِسی خوشی میں آفس سے چھٹی کی جناب نے۔'' اُس نے ریموٹ اُٹھا کے ٹی وی آن کیا اور یوں تسلی سے بیڈ کراؤن سے سر ٹکا لیا گویا اس کمرے سے بہت مانوس ہو اور سالوں سے یہیں رہتی آ رہی ہو۔

''بالکل جناب اور اب اپنی باتیں کرو اُس منحوس کو یاد کر کے میرا موڈ خراب مت کرنا۔'' وہ اُس کے انتہائی قریب بیٹھ گیا تو صبغہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ بیٹھی۔

''چلو پھر آج گھومنے چلتے ہیں سی ویو، کھانا بھی باہر کھلاؤ مجھے اور شاپنگ بھی کراؤ ڈھیر ساری۔'' وہ اُس سے اپنا دامن چھڑا کے اٹھ گئی۔

''جو حکم جناب کا، لیکن نائی کو کیا بولو گی۔'' اُس نے صبغہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

''امی کی فکر تم مت کرو میں دوست کے گھر کا بہانہ بنالوں گی تم بس تیار ہو جاؤ جلدی سے۔'' وہ اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔

پھر رات گئے تک گھوم پھر کے، شاپنگ کر کے اور کھانا کھا کے گھر لوٹے تو وہ جلدی سے اپنے پورشن کی طرف جانے لگی۔

''یار تھوڑی دیر اور رُک جاؤ ناں۔'' حنان اُس کے ساتھ کا مزید خواہش مند تھا۔

''بس بھی کرو حنان، اتنی دیر ہوگئی ہے۔ امی بھی انتظار کر رہی ہوں گی۔ اچھا سنو اگلے ہفتے ویلنٹائن ڈے بھی آرہا ہے۔ کیا گفٹ دے رہے ہو مجھے۔'' وہ سامان سے بھرے پُرے شاپر سنبھالتے ہوئے اُس کی طرف دوبارہ مڑی۔

''صبغہ توبہ ہے یار ابھی اِتنا کچھ لے کر آئی ہو، لیکن پھر بھی دل نہیں بھرا، ایک تو تم عورتیں شاپنگ سے نہیں تھکتیں۔'' اُس نے اُس کے ہاتھ پر نظر دوڑائی جس میں شاپنگ سے بھرے تھیلے موجود تھے۔

''کیا ہے یار اتنا ہی دل ہے تمہارا، بہت

کنجوس ہو تم حنان، یہ تو شاپنگ ہے اور وہ ویلنٹائن گفٹ ہوگا دونوں کا، آپس میں کیا مقابلہ، رہنے دو، تم اپنی بیوی کے ساتھ خوش رہو اور مجھ سے دوبارہ مت بات کرنا سمجھے۔'' ناراض ہوکر وہ منہ پھلا کر چل دی۔

''اچھا بابا سوری میں تو مذاق کر رہا تھا، میری یہ مجال کہ میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں، توبہ کرو توبہ، جہنم میں تھوڑی جانا ہے مجھے۔'' اُس نے کانوں کو ہاتھ لگانے کی ایکٹنگ کی۔

''جو تم بولوگی ویسا ہی ہوگا بلکہ تم میرے ساتھ جاکے خود گفٹ پسند کرنا، ٹھیک ہے، اب خوش۔'' اُس نے صبغہ کے دل کی بات کہی تو وہ خوش ہوگئی۔

☆......☆......☆

حنان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد ناصر محمد اقبال اُس کے بچپن میں ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیارے ہوگئے تو نجمہ نے بیٹے کو ماں اور باپ دونوں بن کے پالا چونکہ ناصر صاحب بہت بڑے زمیندار تھے تو روپے پیسے کی تنگی نہ ہوئی۔ اس لیے نجمہ نے اپنی ساری توجہ بیٹے کی پڑھائی پر لگا دی۔ یہی وجہ تھی کہ حنان ایک فرم میں بہت اچھی پوسٹ پر تھا۔ والد کے بڑے بھائی یعنی اُس کے تایا بھی اُسی کے گھر کے دوسرے پورشن میں اپنی بیوی اور اکلوتی بیٹی صبغہ کے ساتھ رہتے تھے لیکن عادات واطوار میں طاہر محمد اقبال اپنے چھوٹے بھائی کے بالکل برعکس تھے۔ کہاں تو ناصر سمجھدار، ذہین اور سلجھے ہوئے اور کہاں طاہر روپیہ پیسہ چٹکیوں میں اڑا دینے والے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک کے بعد ایک زمین بیچتے چلے گئے اور اپنے حصے کی ساری زمین جائیداد لٹاپٹا کے فارغ ہوگئے اب بس ایک یہی پورشن اُن کے حصے کا باقی بچا تھا جس میں وہ رہائش پذیر تھے۔

بھائی کی موت کے بعد بھابی اور بھتیجے کی جائیداد اور اُن کے پورشن پر نظر جمائے بیٹھے تھے لیکن ابھی تک کوئی موقع میسر نہ آسکا۔ اُن کی بیوی ریحانہ اور بیٹی صبغہ بھی اُنہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نجمہ سے جائیداد ہتھیانے کے لیے منصوبے سوچتی رہیں۔ آخر کار ریحانہ نے شوہر کو صبغہ کے رشتے کا منصوبہ بتایا کہ بیٹی کی شادی حنان کے ساتھ کرا کے وہ ساری جائیداد بیٹی کے ذریعے اپنے نام کرا سکتے ہیں اور بعد میں صبغہ حنان کو چھوڑ دے گی لیکن نجمہ اپنی جیٹھانی اور جیٹھ کی طبیعت سے خوب واقف تھی۔ اسی لیے صاف منع کر کے اپنے بھائی کے گھر رشتہ لے کر گئی اور یوں حنان کی پڑھائی مکمل ہوتے ہی شادار کو بہو بنا کے لے آئیں۔

صبغہ نے حنان کو پھانسنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ لیکن نجمہ نے اپنی قسم دے کر شادار سے شادی کروا کے ہی دم لیا۔ لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا اور حنان شادار کی شادی کے صرف دو ماہ بعد اچانک دل کے دورہ پڑنے پر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اُس کی وفات کے بعد تو حنان شادار سے بالکل ہی لاپرواہ ہوگیا اور اُس کے ساتھ رویہ برے سے برا ہوتا چلا گیا۔ دوسری طرف ریحانہ اور صبغہ کو کھلا میدان مل گیا۔ اب تو اُن کے راستے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی اس لیے صبغہ اُس کا دل جیتنے کا ہر طریقہ اپناتی رہی۔

☆......☆......☆

''یہ تم آتے ہی کچن میں کیوں گھس گئی ہو، یہاں میرے پاس آ کے بیٹھو'' وہ روٹی بناتی صبغہ کو کندھے سے تھام کے اپنے ہمراہ باہر لے

گیا۔

''یار تمہارے ہاتھ اتنے خوبصورت ہیں یہ روٹی بنانے کے لیے نہیں ہیں بلکہ یہ تو چومنے کے قابل ہیں۔'' وہ اُس کے ہاتھوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر اُن کی خوشبو اپنے اندر اُتار رہا تھا جب اچانک ہینڈ بیگ کندھے سے لگائے وہ پتھر کا بت بن گئی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس سے وہ بے حد و حساب محبت کرتی ہے وہ اُس کی غیر موجودگی میں غیر عورت کے ساتھ یوں مگن اور خوش ہوگا۔ بے شک وہ شادار کے ساتھ محبت سے پیش نہ آتا تھا لیکن اِس کے باوجود اُس سے اِس سب کی توقع نہ تھی۔ وہ یوں کھڑی تھی۔ گویا تپتے سنسان صحرا میں وہ بے سہارا اکیلی، تن تنہا کھڑی ہو، اُس کے چہرے کے تاثرات اُس کے دل کی مکمل عکاسی کر رہے تھے۔ اُس کا دل شدت سے یہ خواہش کر رہا تھا کہ سامنے موجود منظر اُس کا خواب ہو اور حقیقت سے اُس کا کوئی تعلق نہ ہو، لیکن اُس کی یہ خواہش محض خواہش ہی رہی کیونکہ یہ سب سچ تھا۔

اُس نے جلدی سے اپنی آنکھیں مسلیں کہ شاید وہ خواب دیکھ رہی ہو لیکن سامنے کا منظر نہ بدلا تو اُسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اُس میں سما جائے۔

''آپ......'' صبغہ کے ساتھ بڑی مشکلوں سے اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تو وہ دونوں بھی اُس کی جانب متوجہ ہوئے لیکن شرمندہ ہونے کی بجائے اُسی طرح ساتھ بیٹھے رہے۔ ہاں میں اور صبغہ ساتھ، کیونکہ میں اور صبغہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں تم ہمارے بیچ میں آ گئی تھی اور میں بھی صرف امی کی وجہ سے مان گیا۔ لیکن اب میں ایک پل کے لیے بھی تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا بلکہ میں اور صبغہ شادی کر رہے ہیں، اس لیے اب تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ تم اِس حقیقت کا سامنا کر کے میرے ساتھ رہو گی یا نہیں۔''

وہ گویا پگھلا ہوا سیسہ اُس کے کانوں میں اُنڈیلتا رہا، وہ پتھر کا بت صدمے سے نڈھال ہو کے گر پڑا۔

''نہیں مجھے یہ قبول نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، حنان آپ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔'' آخر کار اُسے ہوش میں آنا ہی پڑا۔

''یہی سچ ہے ہم شادی کر رہے ہیں تم اگر ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہی سمجھو۔'' وہ اس وقت دنیا کا ظالم شوہر بن گیا۔

''ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔'' وہ آنسو صاف کر کے کھڑی ہوگئی، اُس کی آواز اتنی سرد تھی کہ صبغہ نے بھی واضح محسوس کیا۔ وہ زمین سے اُٹھی اور جس راستے سے چل کے آئی تھی اُسی سے واپس لوٹ گئی۔

''چلو اچھا ہوا جان چھوٹی۔ پھر تم کب بات کر رہے ہو امی ابو سے ہماری شادی کی۔ صبغہ نے شادار کے جانے سے سکھ کا سانس لیا۔

''کرلوں گا یار ایک دو دنوں میں۔'' وہ جو شادار سے جان چھڑانے کے منصوبے بناتا رہتا تھا آج اُس کے خود ہی چلے جانے سے بجائے خوش ہونے کے عجیب سے احساس میں گھر گیا۔

☆......☆......☆

شادار کو گئے ہوئے آج دوسرا روز تھا لیکن اُن کی جانب سے مکمل خاموشی تھی حنان کی طبیعت بھی ان دو دنوں میں کچھ ٹھیک نہ تھی اس لیے مزید

چھٹیاں لے لیں۔ سارا دن گھر میں رہ رہ کر وہ عجیب سی اُداسی میں گھرا رہتا۔ اُسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسی اُداسی چھائی ہوئی ہے اُس پر جو صبغہ کے ساتھ کے بعد بھی دور نہ ہو پا رہی تھی۔ اُسے ہر جگہ شادار نظر آتی، کبھی کچن میں سالن بناتے ہوئے تو کبھی اُس کے پاؤں دباتے، کبھی ڈرے ڈرے لہجے میں چائے کے لیے پوچھتے ہوئے۔

وہ کوئی جاہل گنوار نہ تھی جو یوں دبی دبی رہتی تھی بلکہ وہ ایم اے اُردو تھی، بس اُس کی طبیعت میں ضدی پن، لڑائی جھگڑا نہ تھا وہ حنان سے بے تحاشہ محبت کرتی لیکن حنان کے سخت رویے کی وجہ سے اُسے کبھی بتا نہ پائی۔ اسی آس میں وہ اُس کا غصہ اُس کی نفرت سب برداشت کرتی رہی کہ ایک دن اپنی فرمانبرداری اور محبت سے اُس کا دل جیت لے گی۔ لیکن اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اب بھی وہ حنان سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنی پہلے، اُس کے فیصلے کی وجہ سے شادار کی حالت خراب ہونے لگی اور وہاں سے واپسی سے اب تک وہ تیز بخار میں پھنک رہی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اُس ظالم کے بغیر کیسے رہ پائے گی۔

وہ تو خواب میں بھی یہ نہ سوچ سکتی تھی کہ اُس کا شریک سفر اُس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے گا۔ وہ اُس کا سخت رویہ بھی اسی آس میں جھیلتی آ رہی تھی کہ ایک نہ ایک دن اپنے رویے سے اسے موم کر دے گی۔ لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ وہ اپنی ماں کے مرنے کے بعد یہ کھوکھلا رشتہ بھی ختم کر دے گا۔

☆......☆......☆

''حنان کہاں ہو؟ حنان گھر میں ہو کیا؟'' وہ اُسے آوازیں دیتی پورے گھر میں ڈھونڈ رہی تھی لیکن حنان سُن کر بھی انجان بنا لیٹا رہا۔ نجانے کیوں اُس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا حتیٰ کہ اپنی پہلی محبت صبغہ سے بھی اُسے اب وہ انسیت اور پیار نہ رہا جس کی خاطر وہ اپنی ماں کے انتخاب کو دھتکار چکا تھا۔ وہ عجیب دوراہے پر کھڑا تھا پہلے جب شادار تھی تو صبغہ کے ساتھ کے لیے مچل رہا تھا، اب جب قدرت نے اُسے صبغہ کو اپنانے کا موقع عطا کیا تو اُسے ایسی اُداسی اور یاسیت نے آ گھیرا کہ وہ اُسی محبت سے منہ چھپانے کی خواہش کرنے لگا۔

شادار کی غیر موجودگی میں یہ پورا ہفتہ کیسے گزرا اُسے ہی معلوم ہے۔ ''ارے تم یہاں ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔'' وہ یوں خوش ہوئی گویا کوئی خزانے کا نقشہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

''کیوں کوئی کام ہے کیا؟'' حنان کی آواز میں اتنی اجنبیت تھی کہ ایک لمحے کو صبغہ ٹھٹھک گئی۔

''کام......نہیں کام کیا ہوگا اور یہ تم کیا ہر وقت اُداس، اکیلے کمرے میں پڑے رہتے ہو۔ میری طرف آ جایا کرو ویسے بھی امی ابو تمہارے لیے بہت پریشان رہتے ہیں۔''

اُس نے حنان کی آنکھوں میں جھانک کر کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

''اور تم کب کر رہے ہو ابو امی سے ہماری شادی کی بات؟ شادار کو گئے بھی اتنے دن ہو گئے آخر کب کرو گے بات۔ تمہیں انتظار کس بات کا ہے، تم ایسا کرو کہ کل ویلنٹائن ڈے ہے تم کل امی ابو سے ہماری شادی کی بات کر لو، یہی میرے لیے گفٹ ہوگا، کیوں کیسا خیال ہے؟'' اُس نے حنان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''کل نہیں یار کل تو مجھے بہت ضروری کام سے جانا ہے کل نہیں۔'' اُس نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے نکالا۔

''حنان میں تمہیں بول رہی ہوں کہ کل تمہیں بات کرنی ہوگی تو مطلب کرنی ہوگی میں اور انتظار نہیں کرسکتی، میرے اور بھی رشتے آرہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ابو کہیں اور میرا رشتہ طے کردیں اس لیے میں تمہیں آخری بار بول دیتی ہوں کہ تم جاکر اب بات کرلو۔'' وہ اب غصے میں آ گئی۔

''اچھا ٹھیک ہے میں کرتا ہوں کچھ۔'' اُس کو منہ پھلائے جاتے دیکھ کر وہ بے دلی سے کہتے اٹھ گیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب وہ ناراض ہو کے گئی اور حنان اُس کو منانے اُس کے پیچھے نہیں گیا۔ اُسے خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ تایا، تائی سے صبغہ کا رشتہ مانگنے میں اتنی دیر کیوں کررہا تھا۔ وہ تو کب سے اِس موقع کی تلاش میں تھا۔ اب جب ٹائم آیا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔

''یہ کیا صبغہ اپنا موبائل یہیں چھوڑ کے چلی گئی ہے۔'' کمرے میں ٹہلتے اُس کی نظر بیڈ پر گئی تو صبغہ کے فون پر نظر پڑی۔

''چلو ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گی لینے۔''

''یا اللہ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں کیا چاہتا ہوں، پہلے صبغہ کے ساتھ کے لیے دل بے چین ہورہا تھا اب جب موقع آیا ہے تو شادار یاد آنے لگی ہے۔ کیا کروں اللہ میری مدد کر میرے مولا میری مدد کر۔'' اُس نے بے بسی سے اپنے بال دونوں مٹھیوں میں بھینچے۔ دل میں جب مایوسی زیادہ بڑھنے لگی تو صبغہ کا موبائل اُٹھا کے کھڑا ہو گیا۔

''یوں سوچ سوچ کے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ پورا ہفتہ ہو گیا ہے اُسے گئے اور مجھے یوں پاگلوں کی طرح سوچتے سوچتے اب اور نہیں بس۔'' وہ اُس کا فون واپس دینے کے لیے نکل گیا۔

''کل تایا سے جا کے شادی کی بات کرلوں گا اب اور دیر نہیں کرنی چاہیے بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔'' اُس نے صبغہ کے پورشن میں قدم رکھتے ہوئے سوچا۔

''اور کتنا انتظار کرو گی مجھے نہیں لگتا کہ وہ شادی کے لیے مانے گا دیکھو ناں اُس کلموہی کو گئے بھی اتنے دن ہوگئے ہیں، ابھی تک اُس نے شادی کا نام بھی نہیں لیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہو۔ میری مانو تو اُس پر لعنت بھیجو اور فخر کے لیے مان جاؤ۔'' ریحانہ تائی کی آواز اتنی نفرت بھری تھی کہ اُس کے پاؤں رُک گئے اُس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''امی آپ بس دیکھتی جائیں آج کل میں وہ آنے والا ہوگا رشتے کے لیے اور یہ کیا بات کررہی ہیں فخر کے لیے کیسے مان جاؤں صاف کنگلا ہے۔ اُس سے کیسے شادی کرلوں۔ میرا اور اُس کا کیا جوڑ ہے۔ میں شادی کروں گی تو صرف حنان کے ساتھ اور شادی کے بعد پہلے تو یہ گھر اپنے نام کرواؤں گی اور اِس کے بعد وہ باغات کی ساری زمینیں...... اتنے سالوں سے جو محنت کررہی ہوں اب اُس کا پھل کھانے کا وقت آیا ہے تو میں اپنا راستہ کیسے بدل سکتی ہوں۔ فخر کی تو دوبارہ بات بھی مت کیجیے گا۔'' اُس نے سیب کی قاش منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے اتنا کنگلا بھی نہیں ہے زمین جائیداد تھوڑی بہت تو اُس کے پاس بھی ہے اور وہ تیرے سے پیار بھی بہت کرتا ہے دیکھا نہیں اُس دن رشتے کے لیے اپنی ماں کے ساتھ خود بھی آیا تھا۔'' ریحانہ نے بیٹی کو سمجھایا۔

''امی اب بس بھی کریں مجھے تھوڑی بہت زمینیں نہیں چاہئیں اور وہ کام شام تو کچھ کرتا نہیں بس زمینوں سے ہونے والی آمدنی ڈکار رہا ہے جبکہ حنان کی بہت اچھی تنخواہ ہے' اُس کے ایک مہینے کی تنخواہوں کے تو فخر کو چکر ہی آ جائیں گے۔''

اندر ان دونوں ماں بیٹی کی زہر اُگلتی زبانیں تیز رفتاری کے ساتھ چل رہی تھیں اور باہر کھڑے اُس کے پاؤں زمین نے گویا جکڑ لیے ہوں اتنے بھاری پاؤں کہ وہ چاہ کے بھی نہ اٹھا پا رہا تھا۔ اُس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا کہ جس کی خاطر وہ اپنی ماں کے انتخاب کو چھوڑ رہا ہے وہ محض دولت اور جائیداد کے لیے اُس کے جذبات سے کھیل رہی ہے۔ آج اُسے احساس ہوا کہ جب کوئی انسان دوسرے کی امیدوں کے مطابق نہیں اُترتا تو اُسے کتنا دکھ اور تکلیف ہوتی ہے۔ اُسے آج شادار کی تکلیف اور دکھ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ اُن کھوٹے لوگوں کی خاطر اپنی وفادار اور پیاری بیوی کو چھوڑ رہا تھا اُسے اب پچھتاوا ہونے لگا۔ بڑی مشکلوں سے اُس نے واپسی کے لیے من من بھر کے قدم اٹھائے۔

☆......☆......☆

''ہیپی ویلنٹائن ڈے۔'' صبغہ نے کھلکھلا کر کہا۔ وہ جو جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا صبغہ کی اتنی صبح صبح آمد پر حیران ہوا لیکن کل کی باتیں یاد آنے پر بڑی مشکلوں سے اُس نے خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

''اتنی صبح صبح خیریت۔'' اُس نے لہجے کو حتی الامکان نرم بنانے کی کوشش کی۔

''ہاں وہ کل میرا فون یہاں رہ گیا تھا وہی لینے آئی ہوں۔ اور تمہیں یاد کروانے بھی میرا ویلنٹائن ڈے گفٹ مجھے آج ہر حال میں چاہیے یاد ہے ناں۔'' اُس نے حنان کے سامنے آ کے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں یاد ہے مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے تم فکر مت کرو آج تمہیں تمہارا گفٹ ضرور ملے گا بس تھوڑا ویٹ اور کر لو۔ میں بس ایک گھنٹے تک آتا ہوں کام سے، او کے اب چلتا ہوں۔'' اُسے تفصیل سے جواب دے کر وہ تیزی سے نکل گیا۔ آخری تائی تایا اور اُن کی چہیتی کو ویلنٹائن گفٹ بھی تو دینا تھا۔

''تائی' صبغہ' کہاں ہے مجھے آج بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ جو سبزی بنانے میں مصروف تھی، حنان کی بات پر فوراً کچن سے نکل آئی۔

''ہاں بولو حنان میں یہاں ہوں۔'' خوشی کے مارے اُس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

''اصل میں مجھے تم اور تائی سے بات کرنی تھی۔'' اُس کی آواز میں خوشی کی لہر تھی۔

''ہاں ہاں بولو بیٹا کیا ہوا کیا بات ہے؟'' ریحانہ نے خوش ہوتے بیٹی کی طرف دیکھا۔

''اصل میں تائی میں شادار کو منا کے گھر لے آیا ہوں آپ لوگ میرے لیے پریشان تھے تو مجھ سے آپ کی پریشانی دیکھی نہیں گئی۔ اس لیے میں اپنی بیوی کو واپس لے آیا ہوں آجاؤ شادار۔'' اُس نے ذرا رُخ موڑ کے دروازے کی طرف دیکھا تو شادار کو آتے دیکھ کے صبغہ کا غصہ انتہا کو چھونے لگا۔

''یہ کیا مذاق ہے حنان؟'' فقط یہی جملے منہ سے ادا ہوئے۔

''یہ مذاق نہیں میری بیگم صاحبہ ہیں اور آپ تائی جان کل جس فخر کے رشتے کے بارے میں صبغہ کو بول رہی تھیں اُس کے ساتھ ہی اِس کی شادی کروا دیں، کیونکہ میرا تو اس سے شادی کا

دور دور تک کوئی ارادہ نہیں۔'' اُس نے مزے سے کہا تو دونوں ماں بیٹی اپنی کل ہونے والی باتوں پر شرمندگی سے سر جھکا گئیں۔

''تم ایسا کیسے کر سکتے ہو مسٹر حنان، میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ.....'' اگلے ہی پل وہ ساری شرمندگی بھول بھال کے اُس پر برس پڑی۔

''دھوکا تمہارے ساتھ نہیں بلکہ اپنی بیوی کے ساتھ کیا میں نے اب اِس کی تلافی بھی تو کرنی ہے اس لیے میں اس گھر کے دونوں حصوں کے درمیان اس دروازے کو ختم کروا کے دیوار بنوا رہا ہوں۔ لیکن آج نہیں بلکہ کل، کیونکہ آج ویلنٹائن ڈے ہے اور میں اپنی بیوی کو گھمانے لے جا رہا ہوں اور پھر اِس کو گفٹ بھی تو دینا ہے ناں۔'' اُس نے کن اکھیوں سے صبغہ کی طرف دیکھ کر کہا وہ ایک لمحے کو تو نظریں چرا گئی۔

''چلو شادار آؤ میرے ساتھ۔'' اُس نے ایک نفرت بھری نظر صبغہ پر ڈال کر اُسے کہا تو وہ اُس کے پیچھے چلتی ہوئی دروازہ پار کر گئی تو حنان نے ایک موٹا تالا اُس دروازے میں لگا دیا۔

وہ جسے حنان صرف اپنی ماں کا انتخاب سمجھ رہا تھا کب اُس کی محبت، اُس کی زندگی کا اہم حصہ بن گئی اِس کا اندازہ اب ہوا۔ اُس کے بغیر وہ کتنا اکیلا اور تنہا ہو گیا تھا لیکن اب وہ اپنی بیوی کو ہر وہ خوشی دے گا جس کی وہ حقدار تھی اُس نے خود سے پکا عہد کیا تھا۔

''آؤ شادار آج سارا دن صرف میرا اور تمہارا ہوگا۔ سب سے پہلے تمہیں تمہاری پسند کا ویلنٹائن گفٹ دلاؤں گا اُس کے بعد کینڈل لائٹ ڈنر کریں گے۔ ٹھیک ہے۔'' اُس نے خوشبوؤں کی جانب پہلا قدم بڑھایا تو شادار مسکرا دی۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

میرا افسانہ بس اک تُو

آخری قسط

تمہیں دکھی کر کے میں کتنا دکھی ہوں شاید تم کبھی بھی اس بات کا اندازہ نہ لگا سکو۔ تم بہت خوبصورت اور خوب سیرت ہو میں ہی بہت بے حس اور بدتمیز ہوں۔ تمہارے دوستوں مونٹی اور پپی کا ہر وقت تمہارے ساتھ رہنا مجھے یہ یقین دلاتا تھا کہ تم بھی شمع جیسی آوارہ مزاج لڑکی ہو۔ جس پر میں......

کوئی ہنر، کوئی روش، کوئی طریقہ تو بتا دے
دل ٹوٹے بھی نہ، وہ ملے بھی نہ اور چین آ جائے

ذویا اور دلاور خان دونوں ہی اس شعر کی تصویر بنے اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے تھے۔ زندگی اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی تھی۔ اُن کے فائنل ایئر کے امتحان شروع ہو گئے تھے۔ ذویا بھی مسلسل آرام اور دواؤں، دعاؤں کے طفیل اب تندرست ہو گئی تھی۔

اُسے پہلے کی طرح گھر میں بولتے اور چلتے پھرتے دیکھ کر فائزہ اور احتشام پل پل اپنے اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ اُس نازک سی لڑکی کا زندہ بچ جانا اُن کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ دلاور خان الیکشن مہم میں مصروف تھا۔ اُس نے خود کو پھر سے فعال بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اپنے گاؤں کے لوگوں کی خدمت کا عزم باندھا تھا۔ رستم خان کی جیل میں قیدیوں سے لڑائی ہو گئی تھی اور اُس کے ہاتھوں ایک قیدی مارا گیا تھا۔

باقی قیدی اور جیل کے ایک گارڈ نے اُس کے خلاف گواہی دی اور اُس پر قتل کا مقدمہ درج ہو گیا۔ اب اُس کے جیل سے باہر آنے کے امکان ختم ہو گئے تھے۔ گاؤں والوں نے سنا تو سب نے یہی کہا۔

''یہ اُس کی کرنی کا پھل ہے۔'' ذویا اور بوبی اپنا آخری پیپر دے کر گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ کیونکہ گھر میں مصطفیٰ اور مجتبیٰ کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔

مصطفیٰ کی شادی اپنے ماموں کی بیٹی سارہ سے ہو رہی تھی اور مجتبیٰ کی شادی احتشام الحق کی بھتیجی ماہ نور سے طے پائی تھی اور ان رشتوں میں مصطفیٰ اور مجتبیٰ دونوں کی رضا مندی بھی شامل تھی۔ انعام الحق اپنی فیملی کے ساتھ جلد پاکستان آ رہے تھے۔

سعودی عرب سے ماہ نور کی شادی کرنے کے لیے ماہ نور اور سارہ دونوں ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوبصورت، نیک سیرت تھیں۔ سبھی بہت خوش تھے۔ ٹینا اور مونٹی بھی موحد کی منگنی کی تاریخ بھی

طے پا گئی تھی۔

ایک ساتھ اتنی تقریبات ہو رہی تھیں۔ ذویا کی خواہش تھی کہ ثینا اور مونی کی منگنی کی تقریب 'احتشام ولا' میں ہو۔ جس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سو یہ بھی طے پا گیا۔

''ذویا باجی، یہ کوئی آپ کے لیے دے گیا ہے۔'' وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جب ملازمہ نے اُسے ایک تازہ پھولوں سے مہکتا ہوا بکے لا کر دیا۔

''کون تھا؟'' اُس نے بکے لیتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں باجی! ملازم تھا۔ بھیجنے والے کا ساتھ میں خط بھی ہے اس میں۔'' ملازمہ نے بتایا ذویا بکے میں موجود سفید لفافہ دیکھ چکی تھی۔

''ٹھیک ہے، شکریہ۔'' ذویا نے نرمی سے کہا وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ ذویا نے سرخ گلابی، سفید اور اورنج کلر کی گلابوں کی خوشبو اپنی سانسوں میں اُتاری تو جانے کیوں اُس کی آنکھوں میں دلاور خان کا چہرہ آ سمایا۔

اُس نے سر جھٹک کر اُس کے خیال کو جھٹکا تھا۔ بکے میں لگا لفافہ نکالا۔ بکے سائیڈ پر رکھ کر خط کھولا۔ بہت ہی نفیس اور خوش خط ہینڈ رائٹنگ

تھی۔ ذویا امپریس ہو گئی۔

''کس نے لکھا ہے یہ خط؟'' ذویا نے خود کلامی کرتے ہوئے خط پلٹ کر آخر میں لکھنے والے کا نام دیکھنا چاہا۔

''دلاور خان۔'' اُس کی آنکھوں نے یہی نام دیکھا اور ہونٹوں نے ادا کیا۔

ذویا کے ہاتھوں سے خط چھوٹ کر اُس کی گود میں جاگرا۔ دل کی دھڑکنیں ایکدم سے بے ترتیب ہونے لگیں۔ چہرہ گرم ہو گیا جیسے دلاور خان نے اُسے چھولیا ہو۔

ہاتھوں میں پل بھر میں نمی اُتر آئی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت پر حیران بھی تھی اور اُسے اپنے آپ پر غصہ بھی آرہا تھا۔ اپنے دل پر اُسے بہت غصہ تھا جو اُس کی تمام تر بے حسی کے باوجود اُس کے نام پر دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ اُسے خود سے دور کر ہی نہیں پایا تھا۔

''میری اس کیفیت کا مطلب ہے کہ میں دلاور خان کے لیے اب بھی اپنے دل میں محبت کو جگہ دیے ہوئے ہوں۔ اپنے غصے، انکار اور لاتعلقی کے اظہار کے باوجود...... اونو، یہ دل اور کتنا برباد کرے گا مجھے؟ سمجھتا ہی نہیں ہے کہ جہاں عزت نہ ہو وہاں محبت کا بیج بونا ایسا ہی ہے جیسے کسی بنجر زمین میں بیج بو کر فصل کی امید رکھنا۔'' وہ دل میں سوچ رہی تھی۔

''خط تو پڑھو ذویا، آخر اُس نے کیا لکھا ہے تمہیں اس خط میں؟ جیسے ہی یہ خیال آیا اُس نے خط پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

ذویا!

سلامت رہو، حیران ہونا میرے اس طرح مخاطب ہونے پر؟ کیا کروں تم سے بات کرنے کا کوئی موقع، کوئی ذریعہ ہی نہیں بن پارہا، جانتا ہوں بہت ناراض ہو تم مجھ سے حق ہے تمہیں ناراضگی کا، میں نے جو کیا بُرا کیا۔

مگر جو میرے ساتھ ہوا اُس کے ردِعمل کے طور پر کیا۔ تمہارا کوئی قصور نہیں تھا مگر میں نے تمہیں سزا دے دی۔ جیسے میرا قصور نہیں تھا۔ سزا مجھے ملی۔ محبت، اعتبار، بھروسہ سب کچھ چھن گیا مجھ سے۔ شمع وہ لڑکی جسے میں نے دل و جان سے چاہا تھا۔ اُس کو پانے کے خواب دیکھے تھے مگر...... جنت بی بی سے میرا نکاح کر دیا گیا۔ تفصیل نہیں لکھوں گا کیونکہ میرے اور جنت بی بی کے بارے میں تم سب کچھ جانتی ہو میں تمہیں صرف شمع کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔

جنت بی بی سے نکاح کے بعد میں اس دُکھ اور احساس جرم میں مر رہا تھا کہ میں شمع کا سامنا کیسے کروں گا؟ اُسے کیسے بتاؤں گا کہ میرا نکاح ہو گیا ہے؟...... اور یہ کہ میں اُسے مزید آس نہیں دلا سکتا۔ اُس سے شادی نہیں کر سکتا۔

میں اس خیال سے تڑپ رہا تھا کہ شمع کو میری شادی کا پتا چلے گا تو اُسے کتنا دکھ ہوگا۔ مگر اپنی زندگی کی تلخ حقیقت، اپنی بے بسی اور مجبوری میں اُس سے چھپا نہیں سکتا تھا۔

لہٰذا اُسے بتانے کے لیے جب شہر آیا تو اُسے کسی اور لڑکے کے ساتھ شاپنگ اور ہوٹلنگ کرتے دیکھا۔ وہ لڑکا بہت امیر باپ کا بیٹا تھا۔ ہینڈسم تھا۔ اور شمع کو ایک نیا پروانہ مل گیا تھا۔ اُسے اب میری ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں نے شمع سے اُس لڑکے کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر کہنے لگی۔

''عاصم میرا نیا بوائے فرینڈ ہے یونو میں سال سے زیادہ کسی ایک لڑکے کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ چینج مجھے اچھا لگتا ہے۔ عاصم ویسے بھی میری ہر

ضرورت پوری کرتا ہے شاپنگ کرواتا ہے وہ بھی ٹائم پاس کر رہا ہے اور میں بھی...... اُسے اپنا پیسہ کہیں تو خرچ کرنا ہے نا...... تو فی الحال وہ مجھ پر دل و جان سے فریفتہ ہے تمہاری میری دوستی محبت اور ضرورت بس اتنی ہی تھی۔ اب یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے شادی کے خواب دیکھ رہی تھی، نو نیور۔''

بس اُس دن کے بعد میں بُری طرح ٹوٹ گیا۔ میرا عورت ذات سے، اُس کی محبت سے اعتبار اٹھ گیا۔ مجھے ہر لڑکی میں شمع کا چہرہ نظر آتا، مجھے لگتا کہ ہر لڑکی جھوٹی، مکار اور دغا باز ہے، فلرٹ ہے۔ میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ میں بے حس ہو گیا تھا۔ پتھر بن گیا تھا۔ میں نے محبت کو اعتبار کو اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا۔ اپنے تلخ تجربات کا غصہ میں تم پر نکالتا رہا۔

تم نے محبت سے میری طرف دیکھا، قدم بڑھایا اور میں نے تمہیں ہر بار نفرت سے دھتکارا۔ میں محبت کے نام پر دوبارہ چوٹ نہیں کھانا چاہتا تھا اس لیے تمہیں چوٹ پہنچاتا رہا۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں تم بھی مجھے شمع کی طرح دھوکا نہ دو۔ میرا دل تمہارے پیار پر اعتبار کرنے لگتا تو مجھے اپنے تلخ تجربات غصہ دلانے لگتے۔ میں تم سے بدسلوکی کر کے بعد خود کو لعن طعن کرتا۔

میں نے کبھی کسی عورت کے ساتھ کسی لڑکی کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی تھی۔ لیکن تمہارے ساتھ بہت بدسلوکی اور بدتمیزی کی صرف یہ پرکھنے کے لیے کہ تم اپنی محبت میں، جذبے میں کتنی سچی اور ثابت قدم ہو۔ تم ہر بار جیت جاتیں اور میں ہر بار تمہارے سامنے ہار جاتا۔ اور پھر میں تمہارے پیار کے سامنے ہارتا ہی چلا گیا۔ اس ہار کی قبولیت میرے لیے بہت تکلیف کا باعث بن رہی تھی۔ میں ماننا نہیں چاہتا تھا کہ میں بھی تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔

تمہارے پیار پر اعتبار کرنے لگا ہوں۔ مان لیتا تم سے اظہار کر دیتا تب بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ تمہیں جنت بی بی سے میری شادی کا علم ہوگا تو تم مجھ سے کبھی شادی نہیں کرو گی۔ مجھ سے دور ہو جاؤ گی۔ اور میں نے بھی عہد کیا تھا کہ میں جنت بی بی کے جیتے جی دوسری شادی نہیں کروں گا انہیں اُن کی حیثیت کو اہمیت کو غیر ضروری ہونے کا احساس نہیں ہونے دوں گا۔ بس یہ ساری تلخیاں یہ تمام حقائق مجھے تم سے بدتمیزی کرنے پر، اپنی بے بسی پر کچھ نہ کر سکنے کے غصے کو تم پر نکالنے پر اُکساتے رہے اور میں تمہارا گناہگار بنتا چلا گیا۔

تمہیں دکھی کر کے میں کتنا دکھی ہوں شاید تم کبھی بھی اس بات کا اندازہ نہ لگا سکو۔ تم بہت خوبصورت اور خوب سیرت ہو میں ہی بہت بے حس اور بدتمیز ہوں۔ تمہارے دوستوں مونٹی اور پپی کا ہر وقت تمہارے ساتھ رہنا مجھے یہ یقین دلاتا تھا کہ تم بھی شمع جیسی آوارہ مزاج لڑکی ہو۔ جس پر میں بے حد نادم ہوں، معافی کی طلب میں دن رات جل رہا ہوں، خود سے نظریں نہیں ملا پا رہا۔

اُس پر تمہارا یہ احسان کے تم نے مجھ جیسے کٹھور شخص کی زندگی بچائی۔ اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی۔ اتنے احسان کیسے چکاؤں گا میں؟''

میں تو تمہارے سامنے نگاہ اٹھانے سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ شرمندگی کا احساس مجھے مارے جاتا ہے۔ کیا کوئی معافی ہے

میرے ان گناہوں کی تمہاری عدالت میں؟''
تم نے محبت، پیار، اعتبار دیا مجھے ایثار کیا میرے لیے۔ ایک احسان اور کردو مجھ پر۔
''معاف کردو مجھے۔ دل والی معافی دے دو مجھے...... پلیز...... میرے آنسوؤں اور بندھے ہاتھوں کو اگر دیکھ سکتی ہو تو دیکھ لو۔ پلیز معاف کردو مجھے ہر اُس بات کے لیے جو میری وجہ سے تمہارے لیے دکھ کا باعث بنی، ہر اُس عمل کے لیے جس سے میں نے تمہیں تکلیف پہنچائی۔ ہر اُس نظر کے لیے جو تمہارے وجود پر قہر بن کر نازل ہوئی۔ ہر اُس احساس کے لیے جس نے تمہیں ذلت اور ہتک سے دوچار کیا۔ ہر اُس تختی اور بے رحمی کے لیے جس نے تمہاری جھیل سی آنکھوں میں آنسوؤں کے لیے راہ ہموار کردی۔ ہر اُس دھتکار کے لیے جس نے تمہاری روح کو تڑپایا۔ ہر اُس الزام کے لیے جس نے تمہارے دل کو لہولہو کیا۔ پلیز مجھے معاف کردو۔ اللہ پر یقین رکھتی ہونا...... تو بس اُس کی نیک بندی ہونے کا ایک بار پھر سے ثبوت دے دو، مجھے دل والی معافی دے دو۔ میں نادم ہوں اتنا نادم کے ندامت کا احساس مجھے جینے نہیں دے گا۔ اور میں اب جینا چاہتا ہوں تمہاری محبتوں کو محسوس کرنا چاہتا ہوں تمہارا ہاتھ تھامے زندگی کے راستے پر چلنا چاہتا ہوں۔ تم یقین نہیں کروگی کیونکہ میرے یقین کے لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں ہمیشہ چاہا ہے۔ اور آج یہ چاہ عشق کی حد تک بڑھ چکی ہے۔ میں تم سے بہت بہت زیادہ محبت کرتا ہوں ذدیا! میں اب زندہ رہنا چاہتا ہوں زندہ دلی کے ساتھ خوشی کے ساتھ۔ کیا تم میری مدد کروگی؟ کیا تم میرا ساتھ دوگی؟ میرے جینے کا دارومدار اب تمہارے جواب پر ہے۔''

صرف تمہارا اور صرف تمہارے پیار اور اعتبار بھرے جواب کا منتظر
دلاور خان

خط ختم ہوگیا تھا اور ذدیا کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوگئے تھے۔ دل و دماغ میں خالی پن کا احساس ہورہا تھا۔ وہ خاموش بے آواز اشکبار تھی۔ ہاتھوں میں خط تھا اور آنکھوں کے سامنے گلاب مہک رہے تھے۔ بکے میں ایک چھوٹا سا کارڈ نظر آیا۔ تو ذدیا نے وہ کارڈ نکال کر دیکھا۔ اُس پر صرف ایک جملہ درج تھا۔
''ذدیا ڈیئر' صحت یابی مبارک ہو۔''
دلاور خان

''ذدی، کیا ہوا؟ یہ پھول، یہ خط...... کس نے بھیجا ہے؟'' بوبی اُسی وقت اُدھر آیا تھا اُسے یوں گم صم، اُداس، اشکبار دیکھا تو پاس آتے ہوئے بے قراری سے پوچھا۔ ذدیا نے خط اس کی طرف بڑھا دیا۔ بوبی نے حیرت سے اُس کے آنسوؤں کو دیکھا۔
''روؤ تو نہیں پلیز۔'' اُس کے کہنے پر ذدیا نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے۔
''پتا ہی نہیں چلا کب آنسو بہنے لگے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔
''ڈونٹ وری سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' بوبی نے اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کے شانوں کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے تسلی دی۔ اور پھر خط پڑھنے لگا۔
''اوہ یہ تو گڈ نیوز ہے نا کہ اُسے اپنی غلطی زیادتی اور تمہاری محبت کا احساس ہوگیا ہے۔'' وہ خط پڑھنے کے بعد مسکراتے ہوئے بولا اُسی وقت فائزہ وہاں آگئیں۔

''مما، یہ دیکھیں لو لیٹر اور معافی نامہ۔'' بوبی نے وہ خط اُن کی طرف بڑھا دیا۔

''بوبی دیس از ناٹ فیئر، مما پلیز آپ یہ خط نہیں پڑھیں گی۔'' ذویا نے ایکدم سے خود کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔

''ارے ایسا کیا ہے اس خط میں...... پڑھنے دو نا۔'' فائزہ نے آرام سے صوفے پر بیٹھ کر خط پڑھا اور مسکراتے ہوئے ذویا کو واپس کر دیا۔

''اب اس پرپوزل کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ ذوئی بیٹا' معاف کر دو اُسے...... دیکھو تو بے چارہ کتنا، نادم ہے تحریری معافی بھی مانگ لی ہے اب تو اُس نے...... اللہ نے تمہیں نئی زندگی دیدی، صحت دیدی لاکھ احسان اور شکر ہے اُس کا......ہم نے بھی اسی خوشی میں دلاور خان کی زیادتی معاف کر دی ہے۔''

''کونسی زیادتی مما؟'' ذویا چیخ کر سوال کیا۔

''اُس نے جو برا کیا میرے ساتھ کیا۔ آپ لوگوں کے ساتھ تو اُس نے کچھ غلط یا بُرا نہیں کیا۔ کوئی زیادتی نہیں کی...... پھر آپ نے اُسے کس حساب میں معاف کر دیا؟''

''ذویا بیٹا!'' فائزہ نے اُسے اتنا سنجیدہ پہلی بار دیکھا تھا۔

''مما پلیز' میں اس سلسلے میں کوئی بات کرنا یا سُننا نہیں چاہتی۔ میں نے اُسے معاف کر دیا ہے اُسے بتا دیجیے گا۔ اور میں اب اُس سے ملنا نہیں چاہتی یہ میں نے اُسے خود بھی کہا تھا۔ اب آپ بھی بتا دیجیے گا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''لیکن ذوئی، ملنے میں کیا حرج ہے؟'' فائزہ حیرت زدہ سی اُسے تک رہی تھیں اور وہ ضبط کی حدوں پر کھڑی تھی۔

''تو ٹھیک ہے آپ ملیں اُس سے لیکن مجھے کوئی مجبور نہیں کرے گا اُس سے ملنے یا بات کرنے کے لیے......اور نہ ہی مجھے کوئی شوق ہے اُس کی زندگی میں تیسری عورت کی حیثیت سے داخل ہونے کا...... شمع سے اُس نے محبت کی۔ جنت بی بی سے اُس نے شادی کر لی۔ اور اب میرے ساتھ وہ کون سا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ اُن دونوں عورتوں سے اُسے فریب اور نارسائی، محرومی اور بے بسی کے سوا کچھ نہیں ملا تو اب وہ مجھ سے اپنی محرومیوں کا ازالہ چاہتا ہے۔ میں اتنی گری پڑی نہیں ہوں کہ دلاور خان کی زندگی میں ضرورت کی وجہ سے داخل ہو جاؤں۔'' ذویا نے سپاٹ اور تیز لہجے میں کہا۔

''ذوئی، وہ تم سے محبت کرتا ہے۔'' بوبی نے یاد دلایا۔

''تو......کل میں نے اُس سے محبت کی تھی تو اُسے میری محبت پر اعتبار نہیں تھا۔ آج اُس نے مجھ سے کی ہے تو مجھے اُس کی محبت پر اعتبار نہیں ہے۔ حساب برابر۔'' ذویا نے لاپرواہی سے کہا۔ اندر کہیں دل دہائی دے رہا تھا۔

''ذوئی بدلہ لینا تو تمہاری خُو نہیں ہے میری بہن، کیا تم بھی دلاور خان کی طرح ندامت، پچھتاوے اور شرمندگی کی آگ میں جلنا چاہتی ہو؟'' بوبی نے اُس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ میں شرمندگی اور پچھتاوے کی آگ میں جلوں...... معاف کر دیا ہے اُسے۔ چلو کر لیا یقین اُس کی محبت پر بس......اُس کے اور میرے بیچ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ جسے نبھانے، بچانے کے لیے میں اُس کے سنگ چل پڑوں۔'' ذویا نے سنجیدہ سپاٹ اور تیز لہجے میں جواب دیا اور اُٹھ کر باہر لان میں چلی گئی۔

بوبی اور فائزہ نے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھا۔

''ارمان، شوق، حسرت، غم، آرزو، دل کا ٹوٹنا اتنے ڈھیل ڈھالے قصے، تھوڑی سی زندگی میں۔''

وہ ساجد نظامی کے آفس گئی تھی۔ آرٹیکل دینے اور کچھ تصاویر بھی، آج کل وہ ایک ڈرامہ بھی لکھ رہی تھی۔ گاؤں کی زندگی پر جو کچھ وہ وہاں دیکھ، سن کر آئی تھی اور جو کچھ اُس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ سب اُس نے ایک ڈرامہ سیریل کی شکل میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ الیکشن کا بخار زور و شور سے شروع ہو گیا تھا۔ ملک بھر میں سیاسی جلسے، جلوس منعقد ہو رہے تھے۔ سیاسی قائدین ایک دوسرے پر الزامات لگا رہے تھے۔ ہنگامے، توڑ پھوڑ، جلاؤ گھیراؤ جاری تھا اور ووٹنگ کے دوران بھی ایسے ہی واقعات کا اندیشہ تھا جس کے تحت پولیس اور انتظامیہ سکیورٹی کے خصوصی انتظامات کر رہی تھی۔ لیکن تمام تر انتظامات کے باوجود ہر بار کوئی بڑا حادثہ ضرور رونما ہو جاتا تھا۔ جب مارنے، بگاڑنے اور توڑ پھوڑ کرنے والے اپنے ہی لوگ ہوں تو انتظامیہ بے چاری بھی کیا کرے؟ ملکی املاک کا ستیاناس کر کے، توڑ پھوڑ کر کے، یہ لوگ کس کو فائدہ پہنچاتے ہیں کاش، کوئی انہیں سمجھا سکتا۔ ملکی معیشت تباہ کر کے لوگوں کا روزگار ختم کر کے کئی گھروں کے واحد کماؤ پوت موت کے منہ میں دھکیل کر سیاست کرنے والے کیا سینے میں دل نہیں رکھتے؟ عوام کہیں تھوڑا سا حادثہ، معمولی سا واقعہ اور ذرہ برابر شور شرابہ دیکھتے ہیں تو اُس میں کود پڑتے ہیں۔ رائی کو پہاڑ بنانے، چنگاری کو الاؤ میں تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ لوگوں کو یہ بھی پتا نہیں ہوتا کہ یہ جھگڑا کس بات پر ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ تو بس اپنا غصہ اپنی محرومیوں اور اپنی نجانے کون کون سی نا آسودہ خواہشوں کی تکمیل نہ ہونے کا غصہ پرائی آگ میں تیل چھڑک کر نکالتے ہیں۔ وحشیوں کی طرح مار دھاڑ، تشدد، توڑ پھوڑ ظاہر کرتے ہیں کہ معاشرے سے تحمل، رواداری اور برداشت کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ اور یہ وہ مردہ ہے جسے دفنانے کے لیے بھی کسی کے پاس فرصت نہیں ہے۔ کیونکہ ہم تو ہر وقت ایک نئے ہنگامے اور حادثے کے منتظر رہتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی زبانیں لٹک رہی ہیں ہر وقت اُن کے منہ سے رال ٹپکتی رہتی ہے جونہی کہیں حادثہ ہوا یہ اُس جگہ پل پڑتا ہے۔ سب کی زبانوں کو خون لگ گیا ہے۔ پھر بھلا امن و آشتی کے آستانے کون بسائے گا اب؟

الیکشن کی مصروفیات کے باوجود دلاور خان باقاعدگی سے ذویا کو ہر روز ایس ایم ایس کرتا مگر اُس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر بہت افسردہ ہو جاتا۔ اُس نے اُس کے خط کا بھی اُسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جس کا مطلب ظاہر تھا کہ...... اُس کی طرف سے 'صاف جواب' ہے۔

نہ پیغام ہے نہ دعا کوئی
اس قدر ہم سے خفا کوئی

الیکشن کا رزلٹ آ رہا تھا۔ 'احتشام ولا' میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ ٹینا، مونٹی اور پپی بھی وہاں جمع تھے اور ساتھ بیٹھ کر ٹی وی پر الیکشن کے نتائج سُن رہے تھے۔ تبصرے کر رہے تھے۔ دلاور خان کے گاؤں سے جب رزلٹ آیا تو ذویا سمیت سبھی متوجہ ہو گئے۔ وہ دونوں باپ، بیٹا بھاری ووٹوں کی اکثریت سے قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کی نشستوں پر جیت گئے تھے۔ سب نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ سوائے ذویا کے وہ بس مسکرا رہی تھی۔

''میں تو بہت خوش ہوں دلاور خان کی جیت پر یار ایماندار اور جوشیلے نوجوانوں کو بھی سیاست میں آنا چاہیے۔ کب تک ہمارے بوڑھے گھوڑوں کی سواری کرتے رہیں گے۔ وہ بس آرام کرنے اور گھاس چرنے کے علاوہ کرتے ہی کیا ہیں؟ ملک کو پیچھے پہنچا دیا ہے۔ اپنا پیٹ بھرتے رہے ہیں اب تک ملک اور عوام معاشی تباہی کا شکار ہیں۔''

پپی نے سنجیدگی سے کہا تو مونٹی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''ہاں تو اور کیا..... سب نے باری لگا رکھی ہے یہاں تو ایک بار ایک پارٹی کھا پی کے چل دی تو دوسرے الیکشن میں دوسری پارٹی حکمران ہوگئی اور خزانہ اپنے خاندان کو منتقل کر دیا۔ اب کسی تیسرے کو بھی موقع ملنا چاہیے نا۔ صفائی پھیرنے کا۔''

''ہاہاہاہا.....'' مونٹی کے 'صفائی پھیرنے' والے جملے پر سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

یاد ہے تم کو کبھی تم مجھ پر مرتی تھیں
اور اب یہ دن ہیں کہ تمہارے بن میں مرتا جاتا ہوں

دلاور خان کے نمبر سے اُسے ایس ایم ایس اس شعر کی صورت موصول ہوا تھا۔ تو اُس نے جانے کس خیال میں اسے جوابی ایس ایم کر دیا۔

یاد ہیں ہمیں اپنے سب کے سب گناہ
ایک محبت کرلی، دوسرا تم سے کرلی، تیسرا بے پناہ کرلی

''گناہ تو مت کہو محبت کو۔'' دلاور خان نے ذویا کا بھیجا ہوا یہ شعر پڑھ کر زیرِ لب کہا۔ اس شعر سے ذویا کا غصہ چھلک رہا تھا۔ اپنی اُس سے محبت کی غلطی کا اعتراف جھلک رہا تھا۔ وہ مزید بے چین ہو گیا۔ الیکشن جیتنے کی خوشی بھی خوشی نہیں لگ رہی تھی۔ ذویا کی شمولیت کے بغیر۔ وہ بے حد مضطرب و بے قرار تھا۔

اُس کے آنسو
اُس کے لب
جانے کب؟
میرے قدموں میں کوثر و تسنیم کے
چشمے بن کر ابل پڑے

ذویا ہر رات کو سونے سے پہلے وہی منظر دیکھتی تھی۔ دلاور خان اُس کے قدموں میں کھڑا اشک بہاتا اُس کے پاؤں پر بوسے دیتا۔ اور وہ دیر تلک کروٹیں بدلتی رہتی۔ نیند تو آتی نہیں تھی۔ دلاور خان آ جاتا تھا اُس کی آنکھوں میں اُسے جگانے، ستانے اور رُلانے کے لیے..... کیا اُس کا یہ عمل پھر سے دلاور خان کے لیے اُس کے دل میں محبت جگانے کے لیے کافی نہیں تھا؟

یہ سوال وہ خود سے کرتی تو دل تڑپنے لگتا۔

''بھلا کوئی مرد کسی لڑکی کے قدموں کو یوں آنسوؤں سے بھگو کے بھی معافی مانگتا ہے۔'' ذویا خود سے سوال کرتی تو دل جواب دیتا۔

''ہاں مانگ سکتا ہے معافی اگر دل میں محبت اور احساسِ ندامت ہو تو۔''

''اُف! میں کیا کروں؟'' ذویا سر پکڑ کر اٹھ بیٹھی۔ آج کی رات بھی یہی سب ہوا تھا۔ وہ کتنا ظاہر کرتی تھی کہ وہ دلاور خان کو بھول چکی ہے۔ اُسے اُس شخص کی کوئی پروا نہیں ہے اور یہ کہ اُسے دلاور خان کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر وہ اُسے بھلا نہیں پائی تھی۔ وہ ہاسپٹل میں اُس کا رونا اور اُس کے قدموں کو چومنا۔ اُس کی آنکھوں میں وہ منظر ثبت ہو کے رہ گیا تھا۔ جس نے اُس کی تمام تر زیادتیوں کو پسِ

منظر میں دھکیل دیا تھا۔ یہ ایک عمل اُس کے اُن تمام اعمال پر حاوی آ گیا تھا۔ جو ذویا کے لیے بہت تکلیف دکھ اور اذیت کا باعث بنے تھے۔ وہ پپی کے ساتھ گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو دو نئی گاڑیاں کھڑی دیکھ کر حیرانگی سے چوکیدار سے پوچھنے لگی۔

''یہ گاڑیاں کس کی ہیں چاچا؟''

''بی بی گاؤں سے مہمان آئے ہیں۔ بختاور خان، دلاور خان اور اُن کی عورتیں۔'' چوکیدار نے بتایا۔

''عورتیں بھی، کہیں یہ تمہارا رشتہ لے کر تو نہیں آئے؟'' پپی نے مسکراتے ہوئے اُس کے روشن چہرے کو دیکھا وہ سفید ٹراؤزر پر گلابی ہلکے کام والی شرٹ پہنے، مفلر نما جارجٹ کا دوپٹہ گلے میں ڈالے بہت دلکش لگ رہی تھی۔

''اُس کی اتنی جرأت۔'' ذویا نے اُسے گھورا۔

''اتنی جرأت تو وہی کرسکتا ہے۔ مجھے دیکھ لو بچپن سے آج تک تمہارے ساتھ ہی رہا ہوں۔ مجال ہے جو اِدھر اُدھر دیکھا ہو۔ میری تو گرل فرینڈ بھی نہیں ہے۔ میں کیا کروں گا؟'' پپی نے اس انداز میں کہا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''اچھا اب چلو اندر۔''

''تم جاؤ، وہ دلاور خان مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر تپ جائے گا۔'' پپی نے مسکرا کر کہا۔

''تپ جائے گا تو تپنے دو، اب تم اُس کی وجہ سے مجھے باہر سے ہی چھوڑ کے چلے جاؤ گے۔ اور وہ میرا لگتا کیا ہے جو میں اُس کے تپنے، اچھا یا برا لگنے کی پروا کروں؟' چلو آؤ۔'' ذویا نے تیز لہجے میں کہا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ دوپٹہ سر پر اوڑھ لیا۔ دلاور خان گلاس ونڈو سے مسلسل اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کو کتنے دن بعد دیکھا تھا آج۔ دل کی دھڑکنیں آپ ہی آپ تیز ہو گئیں تھیں۔

''السلام علیکم!'' اُن دونوں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی سلام کیا۔ سب کی نظریں اُن کی طرف اُٹھی تھیں۔

''وعلیکم السلام! ذویا بیٹی آؤ، آؤ کیسی ہے ہماری بہادر بیٹی؟'' بختاور خان نے اُسے دیکھتے ہی گرمجوشی سے اُٹھ کر اُس کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔

''بہادر، ابھی آپ نے خود ہی تو کہا۔'' ذویا نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب ہنس پڑے۔

پھر وہ عیشاں بی بی اور رضیہ سے ملی۔ جنت بی بی نہیں آئی تھیں۔ اُن سب کو الیکشن جیتنے کی خوشی میں فائزہ اور احتشام الحق نے انہیں ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ ذویا اس بات سے بے خبر تھی۔

''میں فریش ہو کے آتی ہوں۔'' ذویا نے فائزہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو پپی اُس کے پیچھے لپکا۔

''او ہیلو، میں کیا کروں گا یہاں؟''

''ڈنر لگنے کا انتظار۔'' ذویا ہنسی۔

''نہ بابا، مجھ سے ان سیاستدانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا جائے گا۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ صبح ملیں گے۔''

''او کے، ٹیک کیئر، اللہ حافظ۔'' ذویا نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

ذویا اپنے بیڈروم سے منسلک واش روم میں گھس گئی۔ چند منٹ بعد باہر آئی تو چہرہ دُھلا دُھلا سا مزید فریش لگ رہا تھا۔ اُس نے بالوں میں لگا ہیئر کیچر اُتار کر بال برش سے سنوارے اور ہلکا سا

پرفیوم چھڑک کر کمرے سے باہر نکلی تو دلاور خان اُسے کوریڈور میں مل گیا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں وہ غضب کا وجیہہ لگ رہا تھا۔ ذویا نے آگے بڑھ جانا چاہا مگر وہ اُس کے مقابل آ گیا۔

''کیسی ہو؟'' دلاور خان کی نظریں اُس کے سُندر سجیح چہرے پر جمی تھیں۔ پانی کے قطرے اُس کے چہرے پر جابجا چمک رہے تھے یوں جیسے گلاب کے پھول پر شبنم کے موتی چمکے ہوں۔ کتنی کشش تھی اُس کے اس سادہ سے حُسن میں، ٹیوب لائٹس کی دودھیا روشنی میں اُس کا چہرہ مزید نکھرا نکھرا، اُجلا اُجلا دکھائی دے رہا تھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟'' ذویا کا انداز طنزیہ اور لیا دیا تھا۔ مگر دلاور خان کی طرف سے جواب بہت شوخ اور رومینٹک آیا تھا۔

''دل کے بہت قریب۔''

''اوہ، وہی گھسے پٹے فلمی ڈائیلاگ۔'' ذویا نے طنزاً مسکراتے ہوئے اُس کی ہی بات اُسے یاد دلائی تھی مگر وہ نظرانداز کر گیا۔

''تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔''

''ضروری نہیں سمجھا۔'' ذویا نے بازو سینے پر باندھ کر بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میں الیکشن جیت گیا ہوں اور بابا سائیں بھی..... مبارکباد نہیں دو گی؟'' وہ اُس کے ہر ہر انداز پر فدا ہو رہا تھا۔

''مبارک ہو۔'' ذویا نے گویا کوئی رسم ادا کی تھی۔ سر سے بوجھ اُتارا تھا مبارک باد دے کر۔

''معافی بھی مل جاتی تو۔''

''تو.....'' ذویا نے تیکھے انداز میں اُسے دیکھا۔

''تو کیا کریں گے آپ؟''

''تم سے شادی۔'' وہ اطمینان سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''واٹ؟'' ذویا یوں اُچھلی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

''ایسا سوچا بھی کیسے تم نے؟''

''کیوں؟ کیا تم نے نہیں سوچا تھا؟'' وہ اُس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نہیں۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''میں نے تم جیسے رو ڈ شخص سے شادی کرنے کا کبھی نہیں سوچا اور نہ خواب دیکھا تھا۔''

''تم میری طرف سے کچھ زیادہ ہی بدگمان ہو۔'' وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

''تو کیا نہیں ہونا چاہیے مجھے؟''

''آئی نو، میں نے جو کچھ کیا، اخلاقیات کے دائرے میں نہیں آتا مگر میں تمہیں وجہ بتا چکا ہوں اور معافی بھی مانگ چکا ہوں۔'' دلاور خان نے سنجیدگی سے کہا تو وہ رکھائی سے بولی۔

''آپ کسی کو قتل کر کے اُس کی قبر پر پھول لے کر معافی مانگنے جائیں گے تو کیا وہ مرنے والا اُٹھ کر آپ سے کہے گا کہ میں نے آپ کو معاف کیا نہیں نا؟ لیکن میں نے معاف کیا۔ دل سے معاف کیا..... اس سے زیادہ کی توقع مت رکھیے گا مجھ سے۔''

''ذویا، آئی ریئلی لو یو۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''یہ فلمی ڈائیلاگ فلاپ ہو چکے ہیں۔'' اُسی کے الفاظ اُسے واپس لوٹائے تھے ذویا نے وہ لب کاٹنے لگا۔

''ڈنر تیار ہے چلیے سب انتظار کر رہے ہوں گے۔'' ذویا تیزی سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ناچار دلاور خان کو بھی اُس کی پیروی کرنا پڑی۔

ڈنر کے دوران وہ گاہے بگاہے ذویا پر نظر ڈال لیتا۔ مگر ذویا اُسے مکمل نظر انداز کر رہی تھی اور یہ بات دلاور خان کو بہت بے کل و بے قرار کر رہی تھی۔

بہت ہوگئی جنگ بس، بس، بس اے عشق
تجھے فتح مبارک، میری شکست ہوئی

ذویا سچ مچ تھک گئی تھی دلاور خان کی یادوں سے لڑتے لڑتے، وہ ہار گئی تھی۔ اُس کے لفظوں، لہجے اور اُن سے بڑھ کر آنکھوں سے چھلکتے آنسوؤں سے، اُس نے اب اُس سے مزید لڑنے، شکوے، گلے نہ کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اب اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ پہلے کی طرح ہوجائے گی۔ نارمل انداز میں دلاور خان سے ملے گی اگر اب کبھی سامنا ہوا تو......

وہ ساجد نظامی کے آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اُس کے سیل فون پر لوکل نمبر سے کال آرہی تھی۔ نمبر چونکہ لوکل تھا اس لیے ذویا نے کال اٹینڈ کرلی۔

''ہیلو السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام، ذویا!'' دوسری جانب نسوانی آواز اُس کی سماعتوں میں پڑی۔ لہجہ بہت کمزور سا تھا۔

''جی ہاں، آپ کون؟''

''جنت بی بی ...... یاد ہوں نا...... کہ بھول گئیں مجھے؟''

''جی...... جی ہاں میں آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں؟ کیسی ہیں آپ؟'' ذویا نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''آ کے دیکھ لو...... میں ملنا چاہتی ہوں تم سے...... ابھی...... آسکتی ہو۔'' جنت بی بی نے اٹک اٹک کر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اپنی بات مکمل کی تھی۔

''جی مگر کہاں؟'' ذویا نے حیرانگی سے سوال کیا اور انہوں نے اُسے ہاسپٹل کا نام اور وارڈ نمبر بتا دیا۔ ذویا حیراں اور ہراساں سی وہاں پہنچی تھی۔ دل میں طرح طرح کے خیال وسوسے اور خدشے سر اٹھا رہے تھے۔ اُسے رہ رہ کر دلاور خان کا خیال آرہا تھا۔ کہ کہیں اسے نہ کچھ ہوگیا ہو، لیکن جونہی وہ اُن کے بتائے ہوئے وارڈ میں داخل ہوئی اُس کی نظر بیڈ پر لیٹی جنت بی بی پر پڑی تھی۔ آکسیجن ماسک منہ پر لگا تھا۔ جو انہوں نے ذویا کو دیکھتے ہی ہٹا دیا تھا۔

''نرس، کیا ہوا ہے انہیں؟'' ذویا نے کمرے میں موجود نرس سے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''لنگز کینسر کی لاسٹ اسٹیج ہے۔'' نرس کے جواب نے ذویا کو ہلا دیا۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے گاؤں میں حویلی میں قیام کی وہ رات یاد آگئی جب اُس نے جنت بی بی اور دلاور خان کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔ دلاور خان کے الفاظ اُسے یاد آرہے تھے۔ اُس کا انداز اب سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ جنت بی بی کو اپنی صحت کا خیال رکھنے کا کیوں کہہ رہا تھا؟ وہ انہیں سب کچھ ٹھیک ہوجانے اور اپنے ساتھ ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔ اُس سب کی وجہ ذویا کو اب سمجھ میں آرہی تھی۔ اُسے بہت دکھ ہو رہا تھا۔ جنت بی بی کی حالت دیکھ کر...... وہ اُن کے قریب بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''یہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے اپنی...... اور پتا بھی نہیں چلنے دیا مجھے؟'' ذویا نے اپنائیت بھرے لہجے میں شکوہ کیا۔

''کچھ بیماریاں بی...... محبت کی طرح ہوتی ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ کب ہوگئی؟ کب

آخری...... سیڑھی پر جا پہنچے۔ محبت میں روگ لگ جائے...... یا بیماری موذی ہو جائے...... دونوں صورتوں میں...... جان لے کر ہی ٹلتی ہے۔'' جنت بی بی نے ہلکا سا مسکرا کر اُسے دیکھا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''ایسی باتیں نہ کریں۔ انشاء اللہ آپ جلد تندرست ہو جائیں گے۔'' ذویا نے انہیں تسلی دی۔

''میرے دن تو گنے جا چکے ہیں۔ مجھے پتا ہے۔ اب زیادہ سانسیں نہیں بچیں میرے...... پاس...... تجھے بس ایک...... التجا، ایک عرض کرنی تھی۔''

''جی کہیئے۔'' ذویا نے فوراً کہا پھر دل میں خیال آیا۔

''کہیں دلاور خان کے کہنے پر تو انہوں نے مجھے یہاں نہیں بلایا اُس کی سفارش تو نہیں کرنا چاہتی جنت بی بی؟''

''دلاور کے کہنے پر تجھے...... نہیں بلایا میں نے...... خود بلایا ہے۔'' جنت بی بی نے جیسے اُس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔ سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ خجل سی ہوگئی۔

''ذویا وہ دل کا بُرا نہیں ہے۔ عمل کا بھی...... برا کبھی...... نہیں تھا۔ اُسے کالج میں...... ایک لڑکی سے پیار ہوگیا...... تھا۔ وہ مجھے آ کے...... اُس کی...... اپنی...... ہر بات بتاتا تھا۔ اُس سے بیاہ...... کرنا چاہتا...... تھا۔ اُس دن وہ بہت خوش تھا۔ شمع نے...... شادی کے لیے ہاں...... کردی تھی۔ وہ سیدھا حویلی آیا تھا۔ مجھے اُس نے خوشی خوشی...... یہ خبر سنائی تھی۔ لیکن میں...... اُس کی خوشی کو غم میں بدلتے دیکھ رہی تھی۔ سو اندر ہی اندر جل رہی تھی۔ بابا سائیں نے...... اُسے مجھ سے بیاہ پر مجبور کردیا۔ اور پھر اُسے پتا چلا کہ وہ لڑکی بھی...... اُس کے ساتھ مخلص نہیں تھی۔ دل لگی کر رہی تھی تو...... وہ...... بری طرح...... ٹوٹ گیا اور...... اُس دن کے بعد میں نے اُسے کبھی...... ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ جیسے پتھر کا ہوگیا تھا۔ لیکن...... اُس نے میرا ہمیشہ خیال رکھا۔ خود کو بھول گیا۔''

''آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں اُس نے بھی مجھے بتایا تھا یہ سب؟'' ذویا نے سنجیدگی سے کہا۔

''تجھے اس لیے بتا رہی ہوں کہ...... وہ تجھ سے بہت پیار کرتا ہے...... تُو نے اُسے معاف کردیا ہے تو...... انا کو بھی...... مار دے...... وہ اپنے کیے پر...... اتنا شرمندہ ہے کہ...... زندہ نہیں رہنا چاہتا...... کہتا ہے...... میری یہ...... زندگی...... اب ذویا کی امانت ہے۔ اُس نے یہ زندگی بچائی ہے ورنہ میں اتنا شرمندہ اور...... بے بس ہوں اُس کے سامنے کے اپنی...... زندگی ختم کر لیتا...... وہ پھر سے جینا چاہتا ہے۔ ہنسنا...... چاہتا ہے۔ میں نے اُسے...... تیرے لیے راتوں روتے دیکھا ہے۔ تیری زندگی کے لیے اُسے منت کے روزے رکھتے دیکھا ہے۔ وہ...... سچ مچ مر جائے گا اگر...... اُسے...... تیری محبت...... کا ساتھ نہ...... مل سکا...... تجھے پتا ہے آنسو۔ مسکراہٹ سے زیادہ خاص ہوتے ہیں۔''

''پتا ہے کیوں؟'' جنت بی بی نے اُس سے سوال کیا پھر خود ہی جواب دینے لگیں۔

''کیونکہ مسکراہٹ تو سب کے لیے ہوتی ہے۔ مگر آنسو...... صرف اُن کے لیے ہوتے ہیں...... جنہیں ہم...... کھونا نہیں چاہتے۔''

''دلاور خان بھی تجھے کھونے سے ڈرتا ہے۔ اسی لیے روتا ہے۔ رات...... وہ تجھ سے مل کر آیا تھا۔ میرے پاس بیٹھ کر اپنے آنسو...... مجھ سے چھپانے...... کی...... کوشش کر رہا تھا۔

''جانتی ہے وہ کیا کہہ رہا تھا؟''

''کیا؟'' ذویا نے بے قراری سے پوچھا۔

''کہتا تھا، وہ مجھے زندگی دے کر...... میری زندگی کیسے چھین سکتی ہے۔ جان بچا کے جان لینا چاہتی ہے میری۔

اُسے میں...... کیسے یقین دلاؤں...... کہ...... یہ جان، یہ زندگی...... سب اُسی کے دم سے ہے...... دشمن کی گولی سے بچا کے محبت کی مار تو نہ مارے نا اب مجھے۔''

جنت بی بی بولتے بولتے کھانسنے لگیں۔ ذویا کے آنسو رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔ نرس جنت بی بی کو آکسیجن ماسک لگا رہی تھی۔

''اُس کی زندگی اب، تیرے ہاتھ میں ہے۔ وعدہ کر اُسے...... پھر سے پتھر نہیں ہونے دے گی...... اُسے جینے میں، ہنسنے میں...... اپنی...... محبت...... دے گی نا اُسے۔ وہ بہت پیار کرتا ہے تجھ سے...... اتنا...... خوش رکھے گا تجھے کہ تُو سارے...... دکھ بھول...... جائے گی...... اُسے اب اور نہیں رُلانا۔'' جنت بی بی ٹوٹتی، بکھرتی سانسوں کے بیچ بولتی اُسے بے بس اور بے حوصلہ کر رہی تھیں۔

''آپ پُرسکون ہو جائیں۔ دلاور خان اب، زندہ دلی کے ساتھ زندہ رہے گا۔ اُسے اب صرف پیار اور خوشیاں ملیں گی۔'' ذویا نے انہیں یقین دلایا۔

''اُس کی...... دلہن بنے گی نا۔''

''جی۔'' وہ ایک مرتے ہوئے انسان کو تسلی دے رہی تھی۔

''وہ...... ساری دنیا کی...... خوشیاں...... دولت، محبت...... تیرے...... قدموں میں...... ڈھیر کر دے گا۔'' جنت بی بی کے الفاظ اُسے تڑپا کر رونے پر مجبور کر رہے تھے۔ نرس نے اُسے باہر جانے کا کہا تو وہ جنت بی بی کے چہرے پر الوداعی نظر ڈال کر اُن کا ہاتھ نرمی سے تھپتھپا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔ اور وہ صاف کرنے کی کوشش میں ہاسپٹل سے باہر نکل گئی تھی۔

اور شام تک 'احتشام ولا' میں جنت بی بی کے انتقال کی خبر پہنچ گئی۔ ذویا کو بہت رونا آیا اُن سے وہ تین چار مختصر ملاقاتیں اور چند باتیں...... اُسے رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں۔

''سارے دُکھ، سارے سکھ، ہنسی، خوشی، آنسو، آہیں، شکوے، گلے، ناراضگی، بے رُخی، بے دلی، خوش دلی اور آسودگی، اطمینان اور بے سکونی سب احساس...... زندگی سے عبادت ہیں۔ زندگی ختم تو سب ختم...... ہر جذبہ، ہر احساس ختم...... مرنے والا مر گیا۔ اب آپ کس سے شکوہ گلہ کریں گے۔ اور کس روٹھیں گے؟ کون منائے گا آپ کو؟ جانے والے کبھی کبھی ہمیں بھری دنیا میں تنہا اور اکیلا کر جاتے ہیں۔'' ذویا سوچ رہی تھی اور موت کی حقیقت اُسے بہت کچھ سکھا چکی تھی۔ وہ خود بھی موت کے منہ سے بچ کر آئی تھی۔ جانتی تھی زندگی پل بھر کا کھیل ہے اِدھر موت نے پتا پھینکا اور کھیل ختم......

''تھوڑی سی زندگی میں بہت سارے شکوے گلے اور ناراضگیاں زندگی کو اور بھی کم مختصر اور بوجھل و بے رنگ بنا دیتے ہیں۔''

ذویا نے جنت بی بی کی مغفرت کی دعا مانگیں

اور دلاور خان کے موبائل نمبر پر ایک پیغام بھیجا۔

''اللہ جنت بی بی کو جنت میں جگہ دے اور آپ کو وہ صبر دے جو اس غم کو بھلا دے، آمین۔''

فائزہ اور احتشام الحق صبح فجر کی نماز کے بعد ہی گاؤں کے لیے نکل گئے تھے۔ جنت بی بی کے جنازے میں شرکت کے لیے...... ذویا میں جنت بی بی کا آخری دیدار کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ دوسرے دن قل میں شرکت کے لیے مونٹی، پپی اور بوبی کے ساتھ گاؤں گئی۔ حویلی میں سب سے تعزیت کی۔ دلاور خان اُسے دور سے ہی دکھائی دیا تھا۔ براؤن رنگ کے شلوار قمیض میں شانوں پر سیاہ مردانہ شال ڈال رکھی تھی۔ چپ، افسردہ اور دلگیر سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ...... اور کیسے نہ ہوتا؟ جنت بی بی اُس کی شریکِ حیات تھیں۔ اُن سے گو کہ ازدواجی تعلق استوار نہیں ہو پایا تھا مگر انہوں نے دلاور خان کو بچپن سے پالا تھا۔ ماں کی طرح بھی خیال رکھا تھا اُس کا...... اُسے جنت بی بی سے جو انسیت اور محبت شروع سے ہی تھی وہ کبھی کم یا ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اُن کی بیماری کی وجہ سے کتنا پریشان تھا یہ صرف وہی جانتا تھا یا پھر جنت بی بی...... حویلی میں جنت بی بی کی موت کا سب سے زیادہ دکھ دلاور خان کو ہی تھا۔ وہ اپنے آنسو اُن کی قبر پر تنہا بیٹھ کر بہا آیا تھا۔ سوئم کے بعد وہ سب حویلی سے رخصت ہو کر واپس جانے کی تیاری میں تھے۔ احتشام الحق اور فائزہ منشی جی کے ساتھ اپنی زمینوں کی طرف چلے گئے۔ ذویا بھی بوبی، مونٹی اور پپی کے ساتھ گاؤں کا چکر لگانے پیدل ہی چل دی۔ ماسٹر جی، مولوی صاحب' گڈو اُن سب کے گھر والوں، تندور والی، سب ہی سے اُن کی ملاقات ہوگئی۔ وہ سب ذویا کو زندہ سلامت اور تندرست دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اور جنت بی بی کے انتقال پر اظہارِ افسوس بھی کر رہے تھے۔ ذویا چلتے چلتے اُسی جگہ پر آ کے رک گئی جہاں اُسے گولیاں لگی تھیں۔ وہ زمین اُس کے خون کو اپنے اندر جذب کر چکی تھی اور اُس جگہ گلاب کا ایک پودا لہلہا رہا تھا۔ ذویا نے حیرانگی سے اُس گلابوں بھرے پودے کو دیکھا اور جھک کر ایک گلاب کی پتیوں کو چھونے لگی۔ پپی اُس کی تصویریں کھینچنے اور مووی بنانے میں مگن تھا۔

''کس نے لگایا ہے یہ پودا؟ کیا میں ایک گلاب توڑ لوں؟'' ذویا نے خود کلامی کرتے ہوئے جانے کس سے اجازت چاہی تھی۔

''یہ پورا تمہارے خون سے سینچا گیا ہے تمہیں اس پودے سے پھول توڑنے کا پورا حق ہے۔''

دلاور خان کی بھاری آواز پر اُس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ قریب ہی کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ ذویا اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کے چہرے کو دیکھا جو افسردگی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ آنکھوں کی سوجن اور سرخی اُس کے رونے اور جاگنے کی گواہی دے رہی تھی۔

''یہ گلاب کا پودا پہلے تو یہاں نہیں تھا۔'' ذویا نے حیرانگی سے کہا۔

''پہلے یہاں اس مٹی پر تمہارا خون بھی تو نہیں بہا تھا۔'' دلاور خان کا جواب ذویا کو حیرت کے اتھاہ سمندر میں دھکیل گیا۔ دلاور خان کیا واقعی اُس سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ اُس نے زمین کے اُس حصے پر گلاب اُگا دیے جس حصے پر ذویا کا خون گرا تھا۔ وہ روح تک سے سرشار و شاد ہو رہی تھی۔ حیران ہو رہی تھی اُس کے انوکھے' الوہی اظہارِ عقیدت و محبت پر...... کیا وہ واقعی اتنی خوش قسمت ہے کہ دلاور خان اُسے اتنی شدتوں سے

چاہیے؟''

''کیا اُس کی منتیں رنگ لے آئی ہیں؟ اُسے سب کچھ سود سمیت لوٹا رہی ہے قسمت؟'' ذویا جوں جوں سوچتی جارہی تھی۔ اُس کی حیرت اور اُلجھن بڑھتی جارہی تھی۔

''میں نے اپنے ہاتھوں سے اس جگہ گلاب کے بیج بوئے تھے تاکہ تمہارے ایثار کی یادگار سے یہ گاؤں مہکتا رہے۔ میں جب بھی اس پودے کو ان پھولوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایک...... خوشی...... اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ زندگی کا احساس ہوتا ہے یہ سوچ کر...... کے اس دنیا میں کوئی ایک تو ہے۔ جو میرے اپنا خون بہا سکتا ہے۔ میرے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال سکتا ہے۔ میری زندگی کے لیے اپنی زندگی تک وار سکتا ہے۔ زندگی...... جو سب سے قیمتی اور انمول متاع ہوتی ہے انسان کے لیے...... نہ رہے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی تک کسی پر نثار کردینے والی ہستی کوئی معمولی تو نہیں ہوسکتی نا۔ یہ خوشی یہ احساس یہ بیج کسی اعزاز سے کم نہیں ہے میرے لیے...... میں بے حس ہوگیا تھا ذویا...... مجھے پھر سے احساس کی دنیا سے روشناس کرانے کے لیے زندگی کی اہمیت سمجھانے کے لیے تمہارا بہت شکریہ۔''

دلاور خان اُس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بہت مدہم، اور اپنائیت بھرے لہجے میں بڑے رسان سے اعتراف اور تشکر کے کلمات ادا کررہا تھا۔

''میں اب چلتی ہوں۔ اللہ آپ کو صبر اور حوصلہ دے۔'' ذویا نے نظریں چراتے ہوئے اجازت چاہی۔ وہ اُس کی گھبراہٹ محسوس کررہا تھا۔ اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تعزیت کے لیے یہاں تک آنے کا شکریہ۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ تم یہاں آؤ گی میرا دکھ بانٹنے بہت شکریہ۔''

''خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں اور غم دُکھ بانٹنے سے دل ہلکا ہوجاتا ہے۔ موت تو ہر انسان کے ساتھ جڑی ہے لیکن جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ آپ کو اپنی زندگی، زندہ دلی سے بھرپور طریقے سے گزارنی چاہیے کیونکہ جنت بی بی کی یہی خواہش تھی۔'' ذویا نے سنجیدگی سے کہا۔

''آخری ملاقات انہوں نے تم سے کی تھی۔ کیا کہہ رہی تھیں وہ تم سے؟'' دلاور خان نے بے تابی سے پوچھا۔

''انہوں نے آپ کو نہیں بتایا؟''

''نہیں، اُن کی کنڈیشن بہت خراب تھی۔ وہ بات نہیں کرپارہی تھیں۔ بس ایک بات کہہ پائیں تھیں کہ...... ذویا کی قدر کرنا۔ جانتی تھیں ناں کے میں نے ذویا کی کتنی ناقدری کی ہے۔ لیکن ذویا نے اپنی قدر کروا بھی لی ہے اور منوا بھی لی ہے۔''

دلاور خان نے اُسے حسرت ویاس سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ سٹپٹا گئی۔ دل تو جیسے پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر نکلنے کو تھا۔

''میں ایک پھول توڑ رہی ہوں۔ شکریہ، اللہ حافظ۔'' ذویا نے تیزی سے ایک سرخ گلاب توڑا اور اُسے الوداع کہہ کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔ وہ تینوں میں بھی گاڑی بیٹھے اور بوبی نے گاڑی اسٹارٹ کرکے اُس کا رخ شہر کی جانب موڑ دیا۔ دلاور خان اُن کی گاڑی کو اُس وقت تک دیکھتا رہا۔ جب تک وہ اُس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

''دلاور خان کو شمع سے محبت تھی۔ وہ اُس کی

محبوبہ تھی اور پھر میں اُس کی محبت اور محبوبہ بن گئی۔ وہ شمع کو بھلا نہیں پایا۔ ہاں بھلانا...... معاف کر دینے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔'' اُس نے محبوب جو بدلا تو تعجب کیسا؟ لوگ کافر سے مسلمان بھی تو ہو جاتے ہیں۔''

ذویا نے سرخ گلاب کو سونگھتے ہوئے ہونٹوں اور گالوں سے لگاتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی ہنس پڑی۔

اُن سب کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا۔ سب بہت شاندار گریڈ لے کر کامیاب ہوئے تھے لیکن اس بار پہلی پوزیشن ذویا کی بجائے بوبی نے حاصل کی تھی۔ کیونکہ ذویا اپنی زخمی حالت اور خرابی صحت کے باعث بہت ہفتوں تک کتابوں سے دور رہی تھی۔ اور دلاور خان کا رویہ اُس کے اعصاب کو شل کر چکا تھا۔ اُس کا ذہن منتشر تھا۔ وہ ذہنی طور پر کافی اَپ سیٹ رہی تھی۔ لہٰذا اُس کی دوسری پوزیشن آئی تھی اور پپی تھرڈ پوزیشن لے کر بہت خوش تھا۔ ٹینا اور مونٹی کے بھی اے گریڈ تھے اس لیے انہیں پوزیشن نہ ملنے کا ملال نہیں تھا۔ وہ سب مل کر اس خوشی کو سیلیبریٹ کر رہے تھے۔ ٹینا اور مونٹی کی منگنی کے ساتھ، احتشام ولا میں خوب ہنستے ہوئے ملک شیک کا گلاس اُٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

''دلاور خان...... ہاں وہ رہا دلاور خان...... ارے اس نے مونچھیں منڈوا دیں۔'' مونٹی نے ٹی وی کی دیکھتے ہوئے دلاور خان کو پہنچاتے ہی شور مچایا تو سبھی متوجہ ہو گئے۔

''ہاں یہ تو دلاور خان ہی ہے واؤ کلین شیو میں بھی بڑا ڈیشنگ لگ رہا ہے۔'' مصطفیٰ نے کہا۔

''لوگ بے عزتی ہونے پر مونچھیں منڈوا دیتے ہیں اس نے کامیابی اور جیت ملنے پر مونچھیں صاف کروا دیں۔ پر لگ بڑا ہینڈسم رہا ہے۔'' پپی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' سب نے اُس کی بات کی تائید کی۔

''اللہ کرے کے یہ نوجوان جو اسمبلی میں پہنچے ہیں اس ملک کی بہتری کے لیئے ایمانداری سے کام کریں۔''

فائزہ نے دعا کی تو سب نے 'آمین' کہا اور ذویا نے اُسی وقت اپنے سیل فون سے دلاور خان کو 'مبارک ہو' کا میسج سینڈ کر دیا۔ حلف مکمل ہوا تو اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ آس پاس مبارکباد کا شور اٹھ رہا تھا۔ اُس نے اپنا سیل فون کوٹ کی جیب سے نکال کر آن کیا جو اسمبلی ہال میں پہنچتے ہی آف کر دیا تھا۔ میسج ٹونز بجنے لگیں۔ اُس نے تیزی سے ٹیکسٹ چیک کرنے کے لیے اِن بکس اوپن کیا تو سب سے پہلا میسج ذویا کا ہی اُس کی آنکھوں کے سامنے چمکا تھا۔ جس نے دلاور خان کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھا دی ہو۔

''مبارک ہو۔'' یہ دو حرفی سادہ سا جملہ اُسے دو جہان کی دولت اور مسرت دے رہا تھا۔ خوشی کا احساس اُس کے رگ و پے میں سرایت کرتا چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کامیابی اُس اکیلے کی نہیں ہے۔ ذویا کی سوچ، قلم، لہو میں لکھے لفظوں اور دعاؤں کی کامیابی بھی ہے۔

آئی دیکھو مہندی کی رات ہری ہری مہندی لگاؤ
ملی ہے نصیبوں والی رات ہری ہری مہندی لگاؤ
مہندی لگاؤ، گیت خوشیوں کے گاؤ
ملی ہے نصیبوں والی رات، ہری ہری مہندی لگاؤ

'احتشام ولا' کے لان میں مہندی کی تقریب ہورہی تھی۔ اسٹیج پر ماہ نور سائرہ' مصطفیٰ' مجتبیٰ خوب سجے سنورے' شرمائے لجائے سے بیٹھے تھے۔ مہندی کی رسم ادا کی جارہی تھی۔ ڈیک پہ مہندی کے محبت کے گیت فضا میں گونج رہے تھے۔ مہندی کی رسم شوخیوں، شرارتوں بھرے جملوں میں ادا ہورہی تھی۔ ذویا نے سب سے ہٹ کر الگ ہی ڈریسنگ کی تھی۔ لڑکیوں نے پیلے، ہرے لال رنگ کے ملبوسات زیب تن کیے تھے۔ جبکہ ذویا نے کرسٹل گرین رنگ کا جدید طرز کا لمبا سا اسٹائلش فراک زیب تن کیا تھا۔ مون لائٹ کلر کا چوڑی دار پاجامہ' فراک پر مون لائٹ کلر کا بہت ہی نفیس اور نازک موتیوں' بیٹس ,نگوں کا کام کیا گیا تھا۔ اُس کا لباس ڈائمنڈ کی طرح چمک رہا تھا۔ گلے میں مون لائٹ کلر کا نیٹ کا دوپٹہ اپنی بہار دکھلا رہا تھا۔ جس پر سفید ہیرے جیسے نگوں کے کام نے سجا دیا تھا۔ ہاتھوں میں میچنگ جیولری اور گجرے پہنے بالوں کو چنبیلی اور گلاب کے تازہ پھولوں سے گندھی چٹیا کی شکل دیے کانوں میں بہت اسٹائلش آویزے پہنے، پاؤں میں ہیل کے خوبصورت ڈیزائن والے جوتے پہنے، خوشبوؤں سے مہکتی ...... سب سے الگ اور سب سے جدا...... کی تصویر بنی سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ فائزہ نے ذویا سمیت سب بچوں کی نظر اُتاری تھی۔ صدقہ خیرات کیا تھا۔

پپی نے ذویا کا پسندیدہ گانا 'بسم اللہ کراں' ڈیک پر لگا دیا تھا۔

''ذوئی، کم آن۔'' ٹینا اور پپی اُس کا ہاتھ پکڑ کر سب کے درمیان کھینچ لیا۔ وہ مختلف سونگز پر ڈانس کر رہے تھے۔ ذویا بھی خوشی خوشی اُن کے ساتھ رقص کرنے لگی۔ حاضرین تالیاں بجا بجا کر انہیں خوب داد دے رہے تھے۔ انجوائے کر رہے تھے۔

ماڑا اے تے ماڑا صحیح یار جو ہے
کج دی ہووے اوساڈا پیار جو ہے
کیوں ماہی دا، کیوں ڈھولے دا
حیلہ کراں میں تے لکھ واری بسم اللہ کراں
بسم اللہ کراں......

ڈانس کرتے ہوئے ذویا کو محسوس ہوا کہ کوئی بہت توجہ سے اُسی کو دیکھ رہا ہے اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ دلاور خان اُس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ بہت جدید طرز کے کرتا شلوار میں ملبوس گلے میں سیاہ اور سنہری رنگ کا اسٹائلش مفلر ڈالے، سفید شلوار پر، کریم رنگ کا کرتا جس کے گلے اور دامن پر بہت نفیس کام کیا گیا تھا۔ ہلکی سی شیو بڑھی تھی۔ وہ بے حد دلکش' وجیہہ اور خوش جمال دکھائی دے رہا تھا۔ ذویا کو اُس کا وہاں ہونا اپنا وہم اور خیال محسوس ہورہا تھا۔ دھڑکنیں اتھل پتھل ہورہی تھیں۔

''اُف! دلاور خان تم اب مجھے تصور وخیال میں بھی بے چین کرو گے۔'' ذویا نے دل میں اُسے مخاطب کر کے کہا۔ وہ رقص کرتی رہی مگر دلاور خان کا مسکراتا چہرہ مسلسل اُس کے سامنے رہا تو بہانہ کر کے پنڈال سے باہر نکل آؤں۔ ابھی وہ اپنی دھڑکنوں کو سنبھال ہی رہی تھی کہ اُس کے کان میں دلاور خان کی آواز آئی۔

''باہر کیوں آ گئیں بہت اچھا ڈانس کر لیتی ہو۔''

''یہ ضرور دلاور خان کا بھوت ہے ورنہ وہ اور میرے ڈانس کی تعریف کرے ناممکن۔'' ذویا نے دل میں کہا اور تیزی اندر کی طرف بھاگی۔ وہ

بھی اُس کے پیچھے ہی لپکا تھا۔

''ذویا۔'' دلاور خان کی آواز پر وہ ہڑبڑا کر پلٹی۔

''آ...... آپ...... سچ میں آئے ہیں میں سمجھی شاید۔'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی اور وہ اُس کی کیفیت و حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''تم کیا سمجھیں؟ اپنا وہم، تصور و خیال؟''

''ہوں۔'' ذویا نے سر ہلایا تو وہ مسرور ہو گیا۔

''زہے نصیب، ہم آپ کے تصور و خیال میں رہتے ہیں۔''

''آپ تو صبح اسلام آباد میں تھے نا حلف برادری کی تقریب میں تو یہاں کیسے؟'' ذویا کی حیرانگی بدستور قائم تھی۔

''ہاں صبح میرا وہاں ہونا ضروری تھا اور شام میں میرا یہاں ہونا بہت ضروری تھا۔''

''مطلب!''

''بھئی ہمیں بھی آپ کے گھر میں ہونے والی شادی کی تقریبات میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے نا۔''

''جی بالکل!'' ذویا نے سنبھلتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''آپ باہر جا کر بیٹھیے، میں آپ کے پینے کے لیے کچھ بھجواتی ہوں۔''

''سنو!'' دلاور خان کی پکار پر اُس کے آگے بڑھتے قدم تھم گئے۔ اور دھڑکنیں بھی اُس نے گردن گھما کے اُس کی طرف دیکھا تھا۔

''اگر میں یہ کہوں تم سے
کہ تم بن، نامکمل ہوں
تو کیا تکمیل ممکن ہے؟''

دلاور خان کا دلکش، نرم، مدھر اور اپنائیت کا احساس دلاتا لہجہ، کچھ پوچھتا ہوا انداز، دھڑکن میں طلاطم بپا کر دینے والا سوال ذویا کو ساکت کر گیا۔

''کیا یہ وہی دلاور خان ہے جو اُس کی محبت کو فریب اور اُس کی باتوں کو گھسے پٹے ڈائیلاگز سمجھتا اور کہتا تھا۔''

آج کتنے خوبصورت لفظوں میں وہ اسے اظہار محبت بھی کر رہا تھا اور اُس سے اُس کے ساتھ کی اجازت بھی مانگ رہا تھا۔ اُسے اُس کی رضا سے چاہتا تھا وہ اور اُس پر اپنا ادھورا پن بھی ظاہر کر رہا تھا۔ کیا نہیں تھا ان چند لفظوں میں، پیار، مان، اقرار، اعتراف اور امید......

ذویا کو اپنی خوش بختی، خواب لگ رہی تھی۔ وہ حیران حیران نظروں سے اُسے تک رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں دلاور خان کی محبت کی شدت اور سچائی کئی ثبوت و شواہد گھومنے لگے۔ وہ اُس کا اسپتال میں اُس کے پاؤں کے قریب روز رات کو کھڑے ہو کر آنسو بہانا، اُس کے پاؤں کو اپنے ہونٹوں کے لمس سے معتبر اور لائق اُلفت بنانا، اُس کے لیے راتوں کو جاگنا، سجدے میں گڑگڑا کر دعائیں مانگنا اُس کی صحت و سلامتی کی، شدید گرمی میں اُس کے جیون کے لیے روزے رکھنا، اُس زمین پر گلاب اُگانا جہاں ذویا کا خون گر کر جذب ہو گیا تھا۔ اُس کی محبت پر نیت و سیرت پر یقین کا اظہار کرنا...... کیا نہیں تھا اس سب میں؟

دلاور خان نے اُسے پل پل حیرت میں مبتلا کیا تھا۔ وہ تو اُس کے تصور و خیال سے فکر اور خواب سے بڑھ کر سچا اور اچھا انسان ثابت ہو رہا تھا۔ محبت کا ہر انداز نیا، جدا اور ماورا تھا۔ وہ محبت کرنا اور کروانا جانتا ہے۔ یہ اُس نے ذویا کو پوری

طرح سے جتا بھی دیا تھا اور عمل سے ثابت بھی کر دیا تھا۔ کون لڑکی ہوگی جو ایسے پیارے اور انمول انسان کو گنوانے کی غلطی کرے گی؟

ذویا بھی یہ غلطی نہیں کرسکتی تھی۔ اُسے تو دنیا میں جنت مل رہی تھی پھر بھلا وہ اپنی جنت کو کیسے ٹھکرا دیتی؟

دلاور خان جو ذویا کے رگ وپے میں، دل و روح میں بس گیا تھا۔ وہ اُسے کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ اُس کی محبت میں واپسی کے سارے راستے بند ہوگئے تھے اُس کے لیے، وہ جانتی تھی کہ دلاور خان ہی اُس کی خوشیوں کا ضامن اور دل کا میت ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دلاور خان کو کیا جواب دے بس وہ مسکرا دی۔ اور تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔

''اس مسکراہٹ کو میں اقرار سمجھوں؟'' وہ بھی اُس کے پیچھے آیا۔

''پلیز، باہر جائیں ناں کوئی دیکھ لے گا تو۔'' ذویا اُس کے کمرے میں آنے پر سٹپٹا گئی۔

''ڈونٹ وری ہنی، تمہاری عزت مجھے ہر شے سے زیادہ مقدم ہے۔ میں دراصل یہاں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔''

''شکریہ، اب کس بات کا؟'' ذویا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''اس مبارک باد کا۔'' دلاور خان نے اپنا سیل فون آن کر کے اُس کا 'مبارک ہو' کا میسج اُسے دکھاتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ...... اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ...... یہاں تک آئے ہیں۔'' ذویا حیرت، مسرت اور بے خودی سے بھیگتی آواز میں بولی۔

''کیا ہے یہ شخص جو اُسے ہر پل حیرت و محبت کا ایک نیا جہاں دکھاتا ہے۔'' اُس نے سوچا۔

''ہاں۔'' وہ دلکشی سے مسکرایا۔

''یہ میسج تم نے کس ہاتھ سے ٹائپ کیا تھا؟''

''اس ہاتھ سے۔'' ذویا نے اُس کے چہرے کو حیرت اور محبت سے تکتے ہوئے بے خیالی میں اپنا بایاں ہاتھ اُس کے آگے کر دیا۔ جو اُس نے بلا جھجک پکڑ لیا۔ ذویا کے حواس گم ہونے لگے۔

''تھینکس، تھینکس آلوٹ ذویا، تمہاری مبارک باد نے میری خوشی مکمل کر دی تھی۔ میرے اندر خوشی کا ایک نیا احساس جگانے کے لیے بہت بہت شکریہ۔'' دلاور خان نے اُسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے دل سے ایمانداری سے کہتے ہوئے اپنے کُرتے کی جیب میں سے ایک نفیس و نازک سی ڈائمنڈ رِنگ نکال کر اُس کی نازک سی مخروطی انگلی میں پہنا دی۔ ذویا ہکا بکا اُسے تکے جا رہی تھی۔ دلاور خان کو اُس پر بے پناہ پیار آ رہا تھا اُس نے ذویا کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگایا تو ذویا کو جیسے ہوش آ گیا۔ اُس نے تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''یہ...... کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپ کو پتا ہے کسی لڑکی کو انگوٹھی پہنانے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''ہاں بالکل پتا ہے، اور تمہیں انگوٹھی پہنانے کا بھی وہی مطلب ہے۔'' وہ ڈھیرے سے ہنسا اور پھر سے اُس کا ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''ایسے کیسے؟ آپ تو شکریہ ادا کر رہے تھے ناں۔''

''ہاں' یہ انگوٹھی 'شکریہ' ہے تمہاری محبت بھری پُر خلوص مبارکباد کا۔ اور یہ انگوٹھی نشانی ہے اس لمحے کی جب میں تم کو خود سے منسوب کر رہا ہوں۔'' دلاور خان نے محبت اور نرمی سے کہتے

ہوئے ایک اور ڈائمنڈ رنگ اپنی جیب میں سے نکال کر اُس کی خالی انگلی میں پہنا دی۔ وہ اپنے حنائی ہاتھوں میں اُس کے نام کی انگوٹھی کو جگمگ کرتے دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں تشکر کے احساس سے چھلک پڑیں۔

''ذویا، کیا میں کچھ غلط کررہا ہوں؟'' وہ اُس کے آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ بے قرار ہو کر پوچھا۔

''تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو کیا؟ پلیز ٹیل می ذویا، تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔''

''میری مرضی!'' ذویا نے اُس کی بے قراری کو اپنے لیے محسوس کرتے ہوئے اُسے چاہ سے دیکھا۔

''ہاں ذویا، تمہاری مرضی۔''

''کیا آپ نہیں جانتے کہ میری مرضی کیا ہے؟'' ذویا نے اُلٹا اُس سے سوال کرلیا۔ وہ تو اُس کی مرضی اَزل سے جانتا تھا۔ اور اُس کے سامنے وہ محبت کی تصویر بنی کھڑی تھی وہ بھلا کیسے نہ جان پاتا کہ ذویا کی مرضی کیا ہے؟'' وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''آئی نو، مجھے پتا تھا تمہاری مرضی، میری مرضی سے الگ ہو ہی نہیں سکتی۔ اِن فیکٹ ہم دونوں ایک دوجے سے الگ ہو ہی نہیں سکتے۔ ہمارا ملن تو سوہنے رب نے ہماری تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اور اسی لیے ہمارے بڑوں نے بہت راز داری سے ہماری بات طے کرلی تھی۔ بس تمہاری ہاں کے بعد عمل ہونا تھا۔ اور 'ہاں' کروانے کی ذمہ داری بھی میری تھی۔'' وہ خوشی سے اُس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے ہونٹوں سے لگا کر بتا رہا تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ ہونٹوں کی طرح اُسے دیکھ رہی تھی۔

''ذویا، میں یہاں پوری تیاری سے آیا ہوں، بے جی، بابا سائیں اور سب گھر والے بھی ساتھ آئے ہیں۔ تمہارے مما، پاپا نے ہی مجھے تم سے بات کرنے کی اجازت دی ہے۔ اگر تم مان جاتی ہو تو یہ طے تھا کہ تمہاری مہندی بھی آج ہی ہوگی۔ اور میں نے تو مولوی صاحب کو بھی گاؤں سے بلوالیا ہے۔ ہمارا نکاح آج ہی ہوگا۔ اور رخصتی تمہارے بھائیوں کے ولیمے کے دن ہوگی۔'' وہ مزید انکشاف کررہا تھا۔ ذویا حیرت زدہ رہ گئی۔

''ایسے کیسے؟ مجھے میرے بھائیوں کی شادی انجوائے کرنی ہے۔'' ذویا نے پریشانی سے اِسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو ہم مل کر انجوائے کریں گے ناں مسٹر اینڈ مسز ذویا دلاور خان، مل کر مصطفیٰ اور مجتبیٰ کی دلہنیں بیاہ کر لائیں گے اور اُن کے ولیمے کے دن ہم بھی دولہا دلہن بن جائیں گے۔ کیوں؟ بنوگی نا میری دلہن؟'' وہ اُس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے چاہت سے پوچھ رہا تھا۔ ذویا نے اُس کی آنکھوں سے اُمنڈتے جذبوں کو خوشدلی سے دیکھا اور نظریں جھکا کر شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جنت بی بی سے بھی تو اُس نے یہی وعدہ کیا تھا۔

''یا اللہ تیرا لاکھ شکر ہے۔'' دلاور خان نے فرطِ مسرت سے کلمۂ شکر ادا کیا۔

''ماشاء اللہ! تم بہت حسین لگ رہی ہو۔'' دلاور خان نے اُس کے سندر سراپے کو نگاہوں سمویا۔

''لگ رہی ہو کیا مطلب؟ میں حسین وجمیل ہوں۔'' ذویا نے اپنے مخصوص پُراعتماد لہجے میں کہا

تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

''چشم بد دور' اُس میں تو دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ چلو پھر میرے نام کی مہندی لگواؤ۔''

''مہندی تو میں نے پہلے ہی لگوالی تھی۔'' ذویا نے اپنے حنائی ہاتھ اُس کے سامنے کھول دیے۔

''لیکن اِس میں میرا نام تو نہیں لکھا۔'' اُس نے ذویا کے ہاتھ پکڑ کر مہندی کے ڈیزائن کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ بول پڑی۔

''آپ کا نام تو دل پہ لکھا ہے نا۔''

''ہوں۔'' دلاور خان نے خوشی سے بے خود ہو کر اُس کے چہرے کو دیکھا وہ اپنی بے اختیاری پہ کچھ خجل سی ہوگئی۔

''سچ میں..... ڈائیلاگ نہیں بول رہی۔'' ذویا کو اُس کی پرانی بات یاد آ گئی تھی جبھی فوراً وضاحت کی تو وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''تمہاری اس سچائی، بے ساختگی اور خلوص پر مجھے مکمل یقین ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم ملیں..... جانتی ہو ذویا انسان دو وجہ سے بدل جاتا ہے کوئی بہت خاص اُس کی زندگی سے چلا جائے یا کوئی بہت خاص اُس کی زندگی میں آ جائے۔ شیخ کے میری زندگی میں آنے جانے اور جنت بی بی کے میری زندگی میں آنے سے میری زندگی بدل گئی تھی۔ میں، میں نہیں رہا تھا۔ دلاور خان کہیں کھو گیا تھا۔ پھر تمہارے میری زندگی میں آ جانے سے میں پھر سے جی اٹھا ہوں، کتنا بدل گیا ہوں میں..... پھر سے ہنسنے مسکرانے لگا ہوں۔ خوشی کا ہنسی کا زندگی کا یہ احساس مجھے تم نے دلایا ہے۔ اب کبھی میری زندگی سے دور مت جانا۔''

''فکر نہ کریں مرتے دم تک آپ کی جان نہیں چھوڑوں گی۔'' ذویا نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''ذویا، میری جان!'' دلاور خان نے بے اختیار اُسے اپنی بانہوں میں سمو لیا۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' وہ بوکھلا گئی اُس کے قرب اور پیار سے۔

''شادی سے پہلے کی گئی ہر زیادتی کا ازالہ۔''

''وہ تو آپ کر چکے۔'' ذویا کی نگاہوں میں ہاسپٹل کی شب کا منظر تھا۔ پاؤں پر اب اُس کے ہونٹوں کا لمس زندہ تھا۔ یہ احساس، یہ منظر اُسے آج تک ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔

''اچھا! ہاؤ سوئٹ یو آر، لیکن ایک چیز مجھے بہت غصہ دلاتی ہے خود پہ، میں نے تم پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا ناں۔''

''تو۔'' ذویا نے سوالیہ نظروں سے اُس کا چہرہ دیکھا۔

''تو یہ۔'' دلاور خان نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُس کے دونوں رخساروں پر اپنے ہونٹوں سے محبت کے گلاب کھلا دیے۔

''اف، دلاور، گندے بچے، گناہ ملے گا آپ کو۔'' ذویا بری طرح شرما، گھبرا اور بوکھلا کر اُسے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی تو وہ ہنس پڑا۔

''ابھی تھوڑی دیر میں ہمارا نکاح ہو جائے گا تو سب گناہ ثواب میں بدل جائیں گے۔ اور تم اتنی پیاری لگ رہی ہو میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ رخصتی بھی آج ہی کروا لوں۔''

دلاور خان نے اُس کے شرمیلے روپ کو بے خودی اور پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے شریر لہجے میں کہا تو وہ زور سے چیخی۔

''دلاور خان۔''

''جی میری جان۔'' اُس نے مسکراتے شوخ لہجے میں کہا تو ہنس پڑی اور شرما کر باہر بھاگ گئی۔

بوبی، ٹینا، پپی، مونٹی' فائزہ، رضیہ اُسی کو لینے آرہے تھے۔ دلاور خان کی خوشی اُس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اور اب اسٹیج پر ذویا اور دلاور خان کو ایک ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ رسمِ حنا ادا کی گئی۔ خوشیوں، رنگوں' قہقہوں اور خوشبوؤں کا سیلاب امنڈ آیا تھا چار سو...... عیشاں بی بی نے ذویا کو اپنے خاندانی سونے کے کنگن پہنا کر اُس کا ماتھا چوما تو وہ مسکرا دی۔

فائزہ، احتشام الحق ذویا کے بھائی، دوست سبھی اس سرپرائز رشتے پر بے حد خوش نظر آرہے تھے۔ رسمِ حنا کے بعد ذویا اور دلاور خان کے نکاح کی رسم ادا ہوئی، قبول و ایجاب کی رسم ادا ہوتے ہی دونوں کو دلی سکون، اور خوشی کا احساس ہوا۔ دونوں دل ہی دل میں رب کے حضور سجدۂ شکر ادا کر رہے تھے۔

''اللہ سائیں! تم دونوں کو سدا سکھی رکھے۔'' عیشاں بی بی (بے جی) نے دلاور خان اور ذویا کا ماتھا چوم کر دل سے دعا دی تو سب نے آمین کہا۔

''کھانا لگ چکا ہے سب بسم اللہ کریں۔'' مونٹی نے با آواز بلند سب کو اطلاع دی تو مہندی کے فنکشن میں شریک تمام خواتین و حضرات اور بچے کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ پپی تو ذویا اور دلاور خان کی مووی اور تصویریں بنانے میں مگن تھا۔ بوبی، ٹینا بھی وہیں موجود تھے۔ سب کے گروپ فوٹوز بھی کھینچے گئے۔

''بچو! آپ سب کے لیے کھانا میں اِدھر ہی بھجوا رہی ہوں۔ ذویا اور دلاور کے ساتھ کھانا آپ سب۔'' فائزہ نے خوشی سے اُن دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیے۔

''ارے آنٹی، آپ نہ بھی کہتیں تو ہم نے کھانا اِدھر ہی لے آنا تھا۔ اتنی جلدی تو چھٹی نہیں ملنے والی ان دونوں کو۔ ویسے یہ سرپرائز نکاح واقعی سرپرائز ڈکر گیا ہے ہم سب کو...... یار ہم نے اتنے پلان بنائے تھے۔ ان شادیوں کے اُن کا کیا ہوگا؟''

پپی نے اسٹیج پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا ذویا ہنس پڑی۔

''سب کچھ ہوگا یہ نکاح آپ لوگوں کے پلان پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ بس اپنے پلان میں مجھے بھی شامل کرلیں۔'' دلاور خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پھر ٹھیک ہے۔'' پپی خوش ہوگیا۔ ویٹر کھانا لے آیا تھا۔ مونٹی اور ٹینا نے مل کر ٹیبل پر لگا دیا۔

''دولہا بھائی، آپ ذویا پر پابندی تو نہیں لگائیں گے ہم سے ملنے دوستی رکھنے پر؟'' مونٹی نے بلا جھجک اُس سے پوچھا تو ذویا سمیت وہ سبھی دلاور خان کی طرف دیکھنے لگے۔

''ہرگز نہیں، اب سب کچھ کلیئر ہو چکا ہے۔ میں جانتا ہوں آپ سب بچپن کے دوست ہیں اور میں تو آپ سب کا بے حد احسان مند اور شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری ذویا کو اپنا خون دے کر اِن کی زندگی بچائی ان کا اتنا خیال رکھا۔'' دلاور خان نے مسکرا کر سنجیدگی سے جواب دیا تو سب خوش ہوگئے۔

''تھینک یو دولہا بھائی، لیکن آپ کو ہمارا احسان مند یا شکر گزار ہونے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم نے جو بھی کیا اپنی دوست کے لیے کیا اور حق دوستی نبھایا۔'' مونٹی نے کہا۔

''ہاں اور اس کے لیے تو ہم ذویا کا شکریہ بھی قبول نہیں کرتے۔ بھئی دوست وہی ہوتا ہے نا جو

کرے، برے وقت میں کام آتا ہے اور ہم تو بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ اپنے دُکھ، سکھ شیئر کرتے آئے ہیں۔'' پپی نے کہا تو ذویا کو اُن پر فخر محسوس ہوا۔

'' آئی ہوپ، آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور اپنی دوستی آئندہ بھی اسی طرح نبھاتے رہیں گے۔'' دلاور خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'' انشاء اللہ! آپ فکر ہی نہ کریں۔ ہمیں تو بس آپ کی طرف سے خطرہ تھا جو کہ اب نہیں رہا۔'' مونٹی نے کھانا پلیٹ میں نکالتے ہوئے کہا تو دلاور خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'' یار اب میں اتنا خطرناک بھی نہیں ہوں۔''

'' یعنی خطرناک ہیں تو۔'' ٹینا نے اُسے دیکھا۔

'' ہاں لیکن صرف دشمن کے لیے دوستوں اور بہن بھائیوں کے لیے نہیں۔'' دلاور خان نے مسکراتے ہوئے کولڈ ڈرنک اُٹھا کر ذویا کے سامنے رکھی۔

'' دیٹس گریٹ' ہماری دوست کی حفاظت اب آپ کی ذمے داری ہے۔'' ٹینا خوش ہو کر بولی تو اُس نے سر ہلا دیا۔

'' لگتا ہے سب حسین لڑکیاں پیا کو پیاری ہوگئیں ہیں یا اللہ کو..... آج کے فنکشن میں ایک بھی لڑکی ایسی نہیں ملی جسے دیکھ کے بندہ گرل فرینڈ بنانے کی خواہش کر سکے۔ سب رنگ و روغن لگا کے حسین نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔'' پپی نے کولڈ ڈرنک کی سیپ لے کر اپنے کیمرے میں دیکھتے ہوئے درد بھرے لہجے میں کہا تو اُن سب کو ہنسی آ گئی۔

'' چہ چہ چہ..... بے چارہ پپی' ساری تیاری اور محنت ضائع ہوگئی۔'' ٹینا نے اُسے چھیڑا۔

'' افسوس!'' پپی نے ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھ کر کہا وہ سب ہنسنے لگے۔

'' لیں بسم اللہ کریں۔'' مونٹی نے دلاور خان کو پلیٹ میں بریانی اور قورمہ ڈال کر پیش کیا۔

'' تھینک یو۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے شکریہ کے ساتھ پلیٹ لے لی۔

'' ذویا! لو بسم اللہ کرو۔'' دلاور خان نے اپنی پلیٹ ذویا کی طرف بڑھائی۔

'' ارے واہ! ابھی سے اتنا خیال ہے بیوی کا' دلاور بھائی ہمیشہ اسی طرح خیال رکھیے گا ہماری دوست کا۔'' ٹینا نے مسکراتے ہوئے بہت شوخ لہجے میں کہا۔ ذویا شرمیلے پن سے مسکرا رہی تھی۔

'' انشاء اللہ! آپ فکر نہ کریں اپنے سے بڑھ کر خیال رکھوں گا میں ذویا کا۔'' دلاور خان نے یقین دلایا۔

'' دلاور بھائی، آپ ذویا کو گاؤں میں حویلی میں رکھیں گے کیا؟'' مونٹی نے نان اور قورمہ کھاتے ہوئے پوچھا۔

'' نہیں، ہم شہر میں ہی مستقل رہائش رکھیں گے' ویسے گاؤں، حویلی آنا جانا تو رہے گا۔ گاؤں اور حویلی کا ماحول ذویا کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ میری طرف سے ذویا پر کوئی دباؤ نہیں ہوگا۔ یہ جہاں کہیں گی رہ لیں گے' جیسے کہیں گی جی لیں گے' جو کہیں گی وہ کر لیں گے۔ میری زندگی تو اب ان کی امانت ہے یہ اِسے جیسے گزارنا چاہیں یہ مالک ہیں ان کی مرضی چلے گی۔''

دلاور خان نے کھانا کھاتے ہوئے ذویا کو استحقاق اور پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو ذویا کو خود پر رشک آنے لگا۔

'' اوہو..... واہ بھئی' یعنی آپ فرمانبردار شوہر بننے کا کردار نبھائیں گے۔'' سب نے بہت شوخ

لہجے میں کہا۔

''حکم کا غلام کہو، حکم کا غلام!'' پپی نے کہا۔

''ہاں بالکل! مجھے ان کا غلام بننے میں کوئی شرمندگی نہیں ہوگی۔'' دلاور خان نے مسکراتے ہوئے بہت ایمانداری سے کہا تو سب شوخ جملے بولتے انہیں چھیڑ رہے تھے۔

''ذویا سن رہی ہو۔'' ٹینا نے اُس کی توجہ دلائی۔

''آپ میرے سر کا تاج ہیں اور تاج حکومت کرتا اچھا لگتا ہے غلامی کے لیے ہم ہیں ناں...... آپ کی اتنی عزت اور محبت پر ہم تو آپ کے غلام ہوگئے ہیں دلاور...... بس اسی محبت اور عزت کی توقع رکھیں گے آپ سے ہمیشہ۔'' ذویا نے اُسے دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا تو وہ نہال ہوگیا۔ دل و روح تک سے سرشار و سیراب ہوگیا۔

''میں تمہاری توقع سے بڑھ کر تمہیں مان، محبت، عزت اور خوشیاں دوں گا یقین رکھو میرا۔''

''مجھے یقین ہے آپ پر۔'' ذویا نے مسکراتے ہوئے اس کے پیار پر اپنے یقین کی مہر ثبت کی تو وہ اپنی ہی نظروں میں معتبر اور قابلِ رشک ہوگیا۔ وہ سب کھانے میں مصروف تھے اور باتوں میں بھی۔ ذویا اور دلاور خان نے ایک دوجے کی آنکھوں میں تشکر اور مسرت و انبساط کی نمی دیکھی تو دونوں دھیرے سے ہنس دی۔ ذویا کا دل بھر آیا۔ وہ اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے کے خیال سے نمازِ شکرانہ ادا کرنے کی نیت سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں چلیں؟'' دلاور خان نے اپنی پلیٹ ٹیبل پر رکھ دی۔

''سجدۂ شکر ادا کرنے۔'' ذویا نے محبت سے اُس کے چہرے کو دیکھا۔

''وہ تو مجھے بھی ادا کرنا ہے۔ تمام عمر۔'' دلاور خان نے اُسے محبت، مسرت اور تشکر سے دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا اور اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''آؤ مل کر سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں۔'' دلاور خان نے اپنا ہاتھ اُس کے سامنے پھیلایا تو ذویا نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''بالکل! اللہ کا شکر ادا کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ بسم اللہ کریں۔'' بوبی نے اپنی بہن کو اپنے من چاہے ہمسفر کی سنگت میں اُس کی محبت کے احساس کے ساتھ دیکھا تو خوش ہوکر بولا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔'' دلاور خان ذویا کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے اسٹیج سے نیچے اتر گیا۔ وہ رب کے حضور سجدۂ شکر ادا کرنے جا رہے تھے۔ جس نے اُن دونوں کو ایک دوسرے کے محبت اور عزت بھرے ساتھ سے نوازا تھا۔ اور وہ سب مما، پاپا، بوبی، مونٹی، پپی، ٹینا، مجتبیٰ، مصطفیٰ، عیشاں بی بی اور بختاور خان بھی شامل تھے۔ انہیں محبت اور مسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اور اُن دونوں کی دائمی خوشیوں کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ فضا میں محبتوں کے گیت بکھر رہے تھے۔

ساڈا رب نے جوڑ بنایا ازلاں دا\
آج سانوں اے پھل ملیا اے منتاں دا\
او ساریاں تو وڈا سردار جو ہے\
نج وی ہووے او ساڈا پیار جو ہے\
کیوں ڈھولے دا، کیوں ماہی دا\
حیلہ کراں، میں تے لکھ واری بسم اللہ کراں\
بسم اللہ کراں

☆☆......☆☆

قربانی اور خون

سرکار نے تو دو کی سواری پر پابندی لگائی تھی پر اس چھوٹی سی موٹر سائیکل پر تین تین لڑکے سوار تھے۔ سٹرڈے نائٹ کی عیاشیاں اس غریب ملک میں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ وہ جلتا بھنتا منہ سے اپنے دل کا درد گالیوں کی صورت میں نکالتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر......

''اری میں کہتا ہوں: میری آنکھوں میں تو جھانک کر دیکھ......''

''چل جا...... میں نہیں دیکھتی۔ میں دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ تُو مجھے نہیں بلکہ پڑوس کی غزالہ کو تاڑ رہا ہے۔''

''اری کیسی باتیں کر رہی ہے ثریا...... تیرے ان غزالی نینوں کی قسم...... سوائے تیرے مجھے کچھ کب دکھائی دیتا ہے۔''

''خیر...... مجھے تو کبھی نہیں لگتا کہ تُو مجھے دیکھ رہا ہے۔ اوپر والے نے تیری آنکھوں کا فریم ہی ذرا ٹیڑھا بنایا ہے، تو بندہ کیا کر سکتا ہے۔ پر سن لے...... میں تیری میٹھی میٹھی باتوں میں آنے والی نہیں...... بس سن لے کہ...... اس بار ہمیں قربانی میں حصہ ضرور لینا ہے۔''

ثریا نے حتمی طور پر اپنا فیصلہ سنایا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی بات کی اٹل ہے۔ جو کہہ دیا بس کہہ دیا۔ شادی کے ان دس برسوں میں اس نے کبھی ایسی ضد نہ کی تھی لیکن اچانک اسے کیا سنک سوار ہوگئی تھی جو قربانی میں حصہ لینے پر اڑ گئی تھی۔

خدا بخش کی زندگی میں سوائے ثریا کے کوئی اور بہار بھی تو نہ تھی۔ خدا نے اولاد تو کوئی دی نہیں تھی ماں باپ تو برسوں پہلے اوپری دنیا سدھار چکے تھے۔ بڑی آپا نے پال پوس کے بڑا کیا تھا اور پھر ثریا نے زندگی کے روکھے سوکھے ماحول میں جیسے گل سے کھلا دیے تھے۔ اب اس کی ہر خواہش کا خیر مقدم کرنا جیسے اس پر لازم و ملزوم تھا۔ لیکن اس کی یہ خواہش اتنی مہنگی تھی کہ اس کے لیے اسے پورا کرنا ممکن نہ تھا۔

''ارے کیا دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا...... تُو نے سمجھایا نہیں اسے۔'' بڑی آپا نے سنتے ہی اپنا پارہ چڑھا لیا اور کھٹ سے پاندان کا ڈھکن بند کیا۔ یہ اُن کے غصے کے اظہار کا پرانا طریقہ ہے۔

''آپا! سمجھایا تھا...... بیچاری جیسا دو کھا لیتی ہے۔ جو کہو پہن لیتی ہے۔ اتنے برسوں میں اس

کی یہ خواہش بھی کیا پوری نہیں کرسکتا۔'' خدا بخش نے اس کے حق میں دلیل دی۔

''دیکھ بخشے! اتنا بھی بیوی کے دام میں نا آ...... یاد رکھ کر اس نے تجھے اولاد نہیں دی ابھی تک...... اسے تب ہی تو اتنا ادب کررہی ہے۔''

''بڑی آپا! جو بھی ہو...... پر تم بھی یہ دیکھو مانو...... بخشے وہ معصوم نہیں ہے۔ چری ہو رہا ہے تو اپنے دولہا بھائی سے بھی مشورہ کرلے۔''

بڑی آپا نے پاندان کھولا اور اس کے لیے پان بنانے لگیں۔ وہ ذرا مطمئن ہوا لیکن دولہا بھائی سے بات کرکے بھی کچھ نہ بنا، مہنگائی کے اس دور میں کون کسی کو قرض ادھار دیتا، یار

ناں...... اور بیویوں کی طرح بنے سنورنے کے لیے میک اپ کا سامان، مہنگی سینڈلز اور نجانے کی کیا الا بلا...... کچھ نہیں مانگتی۔ میرے ساتھ ہی کریم احمد کام کرتا ہے۔ پانچ برس شادی کو ہوئے ہیں چار بچوں کا باپ ہے۔ قسم سے سارے بال سفید ہوگئے اس کے...... بچوں کے خرچے، بیوی کے نخرے اور تو اور سسرال والوں کی ہر وقت کی آر جار...... ہر وقت پیسوں کی جگاڑ میں لگا رہتا ہے۔''

''چل تو کر اس کی طرفداری...... پر میں نہ

دوستوں کو تو پہلے ہی آزما کر دیکھ چکا تھا۔ اب خالی ہاتھ گھر جانا ذرا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا منہ لٹکائے لوٹنا پڑا۔ اسے کتنا قلق تھا کہ اُس کی ایک آنکھ بھینگی ہے لوگ اُس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن ثریا نے کبھی اسے احساس نہ ہونے دیا لیکن قربانی کی اس کیل نے اس کے رشتے میں دراڑ ڈال دی تھی۔ قربانی کے اس فریضے کو لوگوں نے دکھاوے کی بھینٹ چڑھا دیا تھا پر کم عقل ثریا کو کون سمجھاتا کہ ایک نجی اسکول کے چپڑاسی کی اوقات ہی کہاں ہوتی ہے۔ اس پر قربانی فرض نہ

تھی لیکن ثریا کو شادی کے دس سالوں بعد بچوں کی طرح ضد سوار ہوگئی تھی۔ اسے یوں خالی ہاتھ گھر لوٹنا اچھا نہیں لگ رہا تھا، کچھ دیر وہ یوں ہی اپنی سوچوں کے بھنور سے اُلجھتا آپا کے گھر کے پاس ہی پلیا پر سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ خاصا وقت بیت چکا تھا مین روڈ پر ٹریفک کی روانی میں کسی حد تک کمی آ چکی تھی، عام حالات ہوتے تو وہ سیدھا بس اسٹاپ پر جاتا اور منی بس میں بیٹھ کر گھر کی راہ لیتا لیکن آج اس کا من کسی طور بھی نہیں لگ رہا تھا ویسے بھی منی بسوں کے چلنے کا وقت اب بند ہو چکا تھا۔ اِکا دُکا بسیں دور دراز کے علاقوں کی چل رہی تھیں اس نے ذرا رُک کر بھی نہ دیکھا اور دھیمے دھیمے قدم اٹھاتا چلتا گیا، بڑی سڑک سے اب وہ پتلی گلیوں میں داخل ہو چکا تھا۔

''بخشے......!'' پڑوس والی خالہ کہہ رہی تھی کہ ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی بڑی بہو بھی ڈاکٹر کے پاس گئی تھی بس معمولی سا علاج کروایا تھا اور دیکھ تو...... خدا نے اسے کتنے پیارے پیارے بچوں سے نوازا...... بخشے! چل ناں...... پانچ ہزار روپے کون سی بڑی بات ہے اب وہ ڈاکٹر زیادہ سے زیادہ سات یا آٹھ ہزار لے لے گی۔''

''او ثریا! یہ سب چونچلے ہوتے ہیں۔ خدا نے جب اولاد قسمت میں لکھ دی ہوتی ہے ناں...... تو پھر وہ دے ہی دیتا ہے۔'' اسے چڑ سی ہوگئی تھی اب اس موضوع سے۔

''ارے اگر ذرا سا علاج پر پیسے خرچ کرنے سے ہمارا سونا آنگن معصوم کلکاریوں سے گونجنے لگے تو...... حرج ہی کیا ہے؟'' اس نے دبی دبی سی شکایت کی تھی۔

''چل چل جا...... مجھے جلدی سے ایک کپ چائے بنا کر دے۔''

اس نے کتنی بری طرح اسے جھڑک دیا تھا وہ بیچاری اپنا سا منہ لے کر بیٹھ گئی تھی۔

بھوں بھوں بھوں، اچانک نجانے کہاں سے ایک کتا گلی سے نمودار ہو کر سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسے شاید چور سمجھ رہا تھا۔ تب ہی حلق پھاڑ پھاڑ کر واویلا کر رہا تھا۔

''سالا......! ایک دوں گا ابھی...... ابے کیا چور اور شریف انسانوں میں تمیز نہیں ہے تجھے...... بڑا وفادار بنا پھرتا ہے۔'' ساتھ میں دو تین مغلظات بھی اس کی خدمت میں عرض کر دی۔ پر کُتے نے اس پر ہی بس نہ کیا اب باقاعدہ وہ بھونکتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی بکھرے بال، شکن آلود لباس...... ویسے شکل و صورت سے وہ کسی چور سے کم بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اب مجبوری سی آ پڑی تھی اس نے جھک کر زمین سے ایک ڈھیلا اٹھایا اور ذرا تاک کر وار کیا۔ کتا عجیب سی کھسیانی آوازیں نکالتا ایک اندھیری گلی کے کسی گوشے میں روپوش ہو گیا۔

''سالا......'' زیرِ لب وہ بڑبڑایا اور پھر اپنی دھن میں سست روی سے چلنا شروع کر دیا۔

''مالک مکان پھر آیا تھا......'' توے پر پراٹھا سینکتے اس نے ذرا دھیمی آواز میں کہا تھا۔ لیکن اس کی سماعت نے فوراً اچک لیا، پلاسٹک کی گندی سی بالٹی میں جمع شدہ پانی کا آخری ڈونگا بھی اُس نے اپنے منہ کی گرد رگڑنے میں بہا دیا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز ذرا تھمی تھی۔

''کیا کہہ رہا تھا......؟''

''کہتا کیا...... وہی رونا...... کرایہ بڑھا دو ...... ورنہ......'' اس کی آواز دب گئی تھی یا وہ خاموش ہوگئی تھی۔

''حرام زادہ...... جب سارا سارا دن کھڑے رہ کر ڈیوٹی انجام دینی پڑے۔ سارا دن کچر کچر میں مغز خالی کرنا پڑے ناں تو پتا چلے اسے کہ...... غربت کیا ہوتی ہے۔ کرائے داروں کو غلام سمجھتے ہیں۔ ابھی دو سال پرے تو پانچسوں روپے بڑھائے تھے۔ تم نے کہا نہیں اسے...... کہ ابھی گنجائش نہیں ہے۔'' وہ اس کے سامنے غیض و غضب سے بھرا کھڑا تھا جیسے وہ ثریا نہیں بلکہ مالک مکان ہی ہو۔''

''میں نے تو کہا تھا کہ......''

''اری ذرا آواز میں دم لگا کر کہتی ناں...... اس حرامی کے کان ذرا اونچا سنتے ہیں۔ دو بیویاں کھا چکا ہے۔ اب تیسری شادی رچانے کا بڈھے کھوسٹ کو شوق چڑھا ہے۔ ہزار بار کہا ہے کہ میرے پیچھے نہ گھر آیا کر...... پر وہ میری سنتا ہی نہیں، سن...... تو نے...... پردے کے پیچھے سے بات کی تھی ناں......'' اس کی کھوجتی نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ پسینے سے تربتر چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔

''ہاں تو اور کیا...... میں نے تو آج تک...... اس کا چہرہ ہی نہیں دیکھا۔''

ڈری سہمی سی وہ بھیگی چڑیا لگ رہی تھی جسے برسات کی اندھیری رات میں اپنا آشیانہ نہیں ملتا اور وہ اِدھر اُدھر خوفزدہ نظروں سے دیکھتے گرجتے بادلوں کی دھمک سے سہم سہم کر اپنے ہی اندر مرتی چلی جاتی ہو۔ اس کے اندر کا مرد مطمئن سا ہو گیا۔

اس کے بالکل نزدیک سے موٹر سائیکل زن سے نکلی تھی وہ بری طرح چونک گیا تھا۔ قہقہوں کی زہریلی آواز میں سوئیوں کی طرح اس کی سماعت میں چھید کر رہی تھیں۔

سرکار نے تو دو کی سواری پر پابندی لگائی تھی پر اس چھوٹی سی موٹر سائیکل پر تین تین لڑکے سوار تھے۔ سنڈے نائٹ کی عیاشیاں اس غریب ملک میں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ وہ جلتا بھنتا منہ سے اپنے دل کا درد گالیوں کی صورت میں نکالتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر درد کی شدت میں ابھی کچھ کمی آئی تھی۔ گھر اب بھی بہت دور تھا۔ اب اس کی پیروں میں درد سا محسوس ہونا لگا تھا چمڑے کی گھسی پٹی چپل اب کاٹنے لگی تھی۔ آدھا سفر تو پھر بھی طے ہو چکا تھا اب اس وقت رکشہ ٹیکسی ہی مل سکتے تھے اور بلاوجہ کے اس خرچے سے وہ اپنی جیب پر بار نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

''سن...... ناراض ہے کیا؟'' وہ اپنے گھنگھریالے بالوں کو بڑی بیدردی سے سلجھا رہی تھی۔ یک لخت ہی اس کا دل ڈول سا گیا۔

''سن رہی ناں...... کیا سر سے خون ہی نکال دے گی۔'' اس نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اس کی بڑی بڑی کٹورہ آنکھوں میں اس کا دل جیسے ڈوب سا گیا۔

''عجیب مرد ہے تو بھی...... پل میں تولہ پل میں ماشہ...... بخشے! کبھی بھی تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔'' وہ دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ روٹھی روٹھی سی وہ بڑی سندر لگ رہی تھی۔

''تو کیوں سمجھتی ہے مجھے...... اری میں حساب کا سوال تھوڑی ہوں۔ سیدھا سادا سا انسان ہوں۔''

''ہونہہ...... سیدھا سادا انسان! کل بڑی آپا کے سامنے کیسے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جانتی ہوں، خوب کان بھر رہی ہوں گی، وہ میرے خلاف......''

''اری میری جان! بڑی آپا کی تو یوں ہی بڑبڑ کرنے کی عادت ہے۔ جو منہ میں آتا ہے بک

دیتی ہیں۔ اب ذرا سی دیر کو مجھے دیکھنے چلی آئی تو کیا کرنا...... لڑنے بیٹھ جاتا اُن سے......"

"ہونہہ...... ذرا سا بخار چڑھا تو بھائی کو دوڑ کر دیکھنے چلی آئیں۔ میں ہفتہ بھر بخار میں جلتی بھنتی رہی۔ خیریت کے دو بول بھی نہ بولے انہوں نے۔" شکایتوں کے دفتر کھل گئے تھے۔

"اب جانے بھی دے ناں...... اچھا اب بالوں کو نوچنا بند کر...... اور یہاں میرے پاس دو گھڑی تو بیٹھ......"

"آہ...... آہ......" اس کی سست روی سے اٹھتے قدم اب ذرا تھم گئے تھے۔ اس نے کان آواز کی جانب لگا دیے۔

"آہ...... آہ...... بلاشبہ آواز اسی اندھیری گلی سے آرہی تھی۔ یہ آوازیں تو کسی انسان کی تھیں۔ انسانی جذبے کے تحت خود بخود اس کے قدم آواز کی سمت بڑھنے لگے۔ گلی تنگ ضرور تھی لیکن اندھیرا اتنا بھی نہ تھا کہ ہاتھ بھی نہ سجھائی دیں، زمین پر پڑا کوئی شخص کراہ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا ہوا تھا۔ وہ کسی کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس کو...... اور وہ اس کی آواز پر چلا آیا تھا۔

"کون...... کون ہو تم بھائی......" دل میں دردمندی کے سارے جذبات امنڈ کر آرہے تھے۔

"آہ...... آہ......" کراہ میں اب شناسائی کی سی کیفیت شامل ہو چکی تھی۔ وہ ایک انسان تھا اور کسی انسان کی مدد کو پکار رہا تھا ایک انسان کی قربت محسوس کر کے شاید اس انسان کے درد میں راحت سی گھل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے اس کے وجود پر پھسلنے لگے وہ ایک صحت مند جوان انسان تھا۔ اس کے کپڑوں سے پرفیوم کی دھیمی خوشبو اُٹھ رہی تھی اس کے ایک پیر میں چپل جبکہ دوسرا پیر بغیر چپل کے تھا، شاید وہ کہیں سے بھاگتا آیا تھا یا کسی نے موقع پا کر اسے یہاں اسی گلی میں نشانہ بنایا تھا اس کے سینے کے مقام سے ذرا پہلے اسے اپنے ہاتھ گیلے محسوس ہوئے۔ تازہ خون کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی اور اس کے وجود کے رونگٹے انجانے جذبے سے کھڑے ہو گئے۔ وہ زخمی تھا۔ شاید کسی نے اسے گولی ماردی تھی۔ وہ کچھ دیر سن سا بیٹھا رہا، شاید اسے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔

"آہ...... آہ......" ایک بار پھر کراہیں بلند ہو رہی تھیں وہ چونک اٹھا اور اس کے ہاتھ پھر تیزی سے چلنے لگے ایسے جیسے وہ ہاتھ اس کے نہیں کسی اور کے ہوں۔ اس کی وہی جیب بھاری ہو رہی تھی اس نے لمحہ بھر کی دیر نہ کی جو کچھ تھا سب نکال لیا موبائل فون کا حجم بتا رہا تھا کہ وہ خاصا مہنگا ہے اندھیرے میں وہ خوب محسوس کر سکتا تھا، اس کا والٹ ابھی تک بھرا تھا اسے گولی مارنے والوں نے چھوا تک نہ تھا یقیناً یہ دشمنی کی واردات کا شاخسانہ تھا سرد سی ایک لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

قربانی کا حصہ......

ڈاکٹر کا خرچہ......

مالک مکان کا کرایہ، لمحہ بھر میں ایک فلم کی ریل رخنہ لگا کر دوڑ گئی۔

"آہ...... آہ......" اس شخص کی یہ آہ اب بہت خفیف سی تھی۔ اس نے جلدی سے اس کا والٹ اپنی شلوار کی خفیہ جیب میں ڈالا۔ نجانے درزی نے کس جذبے کے تحت اس کی یہ خفیہ جیب بنائی تھی جو پہلی بار کام آرہی تھی موبائل قمیض کی جیب میں ٹھونسا وہ اٹھنا چاہتا تھا لیکن اس کا گھٹنا

کسی سخت سی شے سے ٹکرایا کسی اور فیلنی شے کا خیال نے اس کے وجود میں عجیب سی سرشاری سی بھر دی۔ اس نے لپک کر اسے تھاما اور دوسرے ہی لمحے اس نے اسے یوں جھٹک دیا جیسے وہ آگ کا گولہ ہو۔ وہ آگ کا گولہ تو نہیں البتہ آگ اگلنے والا شیطانہ چرخہ ضرور تھی۔

پستول..... خوف سے اُس کا وجود کپکپانے لگا اس زخمی شخص کی کراہیں..... اس کے وجود کا خون سب کچھ ایک ہی خوف کے جذبے میں کہیں دور بہتا چلا گیا وہ تیز تیز قدم اٹھانا چاہتا تھا لیکن قدم جیسے من من بھر کے ہورہے تھے۔ گلی سے نکلتے ہی جیسے جسم میں کچھ گرمی اتری اور اس نے تیز قدم اٹھانے شروع کیے ابھی چند قدم ہی چلا ہوگا کہ چوکیدار کی کڑک دار آواز نے خوف کی جھرجھریاں سی جسم میں ابھرنے لگی۔

''کون ہو اوئے.....'' چوکیدار تقریباً دوڑتا ہوا اس کے نزدیک آیا۔ اس نے فرار چاہی لیکن وہ اسے دبوچ چکا تھا۔

''کون..... اوئے..... تم خدا بخش ہو ناں۔ تم کریم احمد کے ساتھ کام کرتے ہو ناں..... اوئے یارا..... ام..... ولی خان ہیں..... کریم احمد کا بھائی..... چچا کا بیٹا اے وہ میرا..... پہچانا نہیں..... پر..... تم اس وقت اِدھر..... امارہ مطلب ہے..... اِتی رات کو یارا کیوں اِدھر سے جاتا ہے۔ اِدھر اچھا ماحول نہیں ہے۔ ڈاکو شاکو، لٹیرے فنٹیرے گھومتے ہیں اس وقت.....

''ہاں..... ہاں..... ٹھیک کہتے ہو تم بھائی۔'' خوف سے سرسراتی آواز اسے اجنبی سی محسوس ہوئی۔

''تم اِدھر سے نکلو یارا..... زمانہ خراب ہے..... سب ٹھیک تو اے ناں، تم ام کو پریشان لگتا ہے۔''

چاند کی دھیمی روشنی میں ولی خان کچھ بھانپ رہا تھا لیکن اس پر شناسائی کا غلبہ زیادہ تھا۔ لہٰذا شک کی گنجائش کم ہی تھی۔

''ہاں...... سب ٹھیک ہے۔ چلتا ہوں بھائی، گھر والی پریشان ہورہی ہوگی۔'' اس نے اپنے آپ کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں...... ام کو معلوم ہے بھابی پریشان ہورہا ہوگا......تم جاؤ......تم جاؤ فوراً شاباش......''

خدابخش کا بس چلتا وہ اڑ کر اس وقت گھر پہنچ جاتا لیکن گھر اب بھی اتنا نزدیک نہ تھا۔ جیسے تیسے کر کے گھر پہنچا تو اس کی زندگی میں ایک بھونچال آچکا تھا۔ آج اس نے ایک زندگی طلب کرنے والے شخص کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کیا تھا، آج اس نے ولی خان کو اپنی زندگی کا سب سے خطرناک شخص محسوس کیا تھا زندگی لمحہ بھر کے ہی انسانوں کا معیار کیسے بدل دیتی ہے۔

قربانی کا حصہ......

ڈاکٹر کا خرچہ......

مالک مکان کا کرایہ...... سب کچھ اتنا مشکل تو نہ تھا۔ دل میں اطمینان تو تھا پر نجانے کیوں وہ رات بھر سو نہ سکا۔

دوسرے دن کے اخباروں میں یہ خبر بہت نمایاں تھی۔ شہر کا بڑا ڈان ''پپو جیمس'' شہر کے مضافاتی علاقے کی اندھیری گلی میں خون آلود حالت میں مردہ پایا گیا۔ اُس کے موبائل اور نقدی کی غیر موجودگی ثابت کررہی تھی کہ اسے لوٹنے کے بعد گولی کا نشانہ بنادیا گیا یہ بھی شک ظاہر کیا گیا تھا کہ اسے باقاعدہ ٹارگٹ کر کے ہلاک کیا گیا، پپو جیمس منشیات فروشی کے علاوہ بھتہ خوری' قبضہ مافیا اور ٹارگٹ کلنگ جیسے مجرمانہ فعل میں بھی ملوث تھا۔ یہ وہی پپو جیمس تھا جس نے پولیس کے اعلیٰ افسران کی نیندیں حرام کررکھی تھیں۔

وقت کتنی جلدی سرک جاتا ہے، آج اس کے چھوٹے سے صحن میں ستارا اور چندا کی کلکاریاں گونجتی تو اُس کا دل خوشی سے بھر جاتا بہرحال وہ قربانی میں حصہ ضرور لیتا تھا، اس نے مالک مکان کا چھوٹا سا گھر چھوڑ کر ذرا بڑا گھر کرائے پر لے لیا تھا، گلی کے نکڑ پر ہی اس نے چھوٹی سی دکان ڈال لی تھی، اس کی دکان اچھی چل رہی تھی زندگی کتنی خوبصورت تھی لیکن آج بھی وہ سوتے میں چونک کر اٹھ جاتا تھا۔ اس کے وجود میں چونٹیاں سی سرسرانے لگتی اور اسے اپنے ہاتھوں سے تازہ خون کی خوشبو آتی...... ثریا اسے وہمی قرار دینے لگی تھی۔ وہ روزانہ شام کو بن سنور کر تیار ہو کر پردے کی اوٹ سے اسے جھانکتی رہتی لیکن وہ جانتا تھا کہ ثریا کے خوبصورت نین اسے نہیں بلکہ اس کی دوکان کے اردگرد ان لونڈوں پر ہوتے جو بلند بانگ قہقہے مارتے اردگرد کے گھروں کی کھڑکیوں دروازوں میں جھانکتے، دبی دبی شرارتی اور فضول سی باتیں بڑے مزے سے کہہ جاتے، اب ثریا نے اس سے ڈرنا سہمنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اس کے دو بچوں کی ماں تھی اس کی صحت اس کی مسکراہٹیں اس کے دل کے سکون کو ظاہر کرتی تھیں۔ وہ آئینے میں اپنا آپ دیکھتا تو اسے کوئی اور خدابخش نظر آتا جس کی بھینگی آنکھوں سے زیادہ کمزور مریل جسم اور سر کے کھچڑی بال کھلتے۔ اپنے نفس کی قربانی دے کر وہ اپنا ہی مجرم بن بیٹھا تھا۔

ستارا اور چندا کا دودھ

ثریا کے میک اپ کا سامان

ثریا کے کپڑے

کھانے پینے کا سامان' کیبل سب کچھ زندگی کے پہیے میں گھومتا جارہا تھا، بس اس کے وجود کے خون کا قطرہ قطرہ نجانے کیسے کب اور کہاں اسے اس کے جرم کی پاداش میں سزاوار قرار دیے جارہا تھا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

نسیم سکینہ صدف

سفینۂ زیست ڈوب گیا

''فاری...... یہ کیا؟'' مٹھائی کی طرف اشارہ کیا تو وہ میرے گلے لگ گئی۔ منیبہ آپی کو خدا نے بیٹے سے نوازا ہے۔ سیزیرین کی وجہ سے وہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ مجھے تو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ناک نقشہ کیسا ہے۔ منیبہ آپی کے بے بی کا سن کر اظفر بھائی تو......

عجیب سی کشادہ گلی تھی۔ گلی کے اطراف میں قدیم طرز کے خاموش کھڑے گھر گویا اپنی بیتی ہوئی عمر کے حساب کتاب میں مشغول تھے۔ اُس میں سے زیادہ تر مکانات کی دراڑیں نظر آ رہی تھیں۔

جسے لوگ مدتوں کے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ کئی مکانوں کی دیواروں پر جگہ جگہ بڑے بڑے سیاہ دھبے اُن کی داستان رقم کر رہے تھے۔ انہی سیلن زدہ گھروں میں ایک گھر میری دوست فاریہ کا بھی تھا۔ جس کی آج برتھ ڈے تھی۔ جو ہمارے گھر کی تیسری گلی میں تھا۔

جس کو ملنے اور وش کرنے میں 20 فروری کو برتھ ڈے گفٹ کے ساتھ اُس کے گھر موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی خوشی دیدنی تھی۔ پاس رہتے ہوئے بھی ملاقات دیر سے ہی ہوتی تھی۔ ہم کمرے میں بیٹھے چائے اور باتوں میں مشغول تھے کہ برآمدے میں نماز پڑھتی منیبہ آپی خدا کے حضور ہاتھ اٹھائے دعا گو تھیں۔ اور بنا ہونٹ ہلے ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو تواتر کے ساتھ پھسل رہے تھے۔ کوئی ایک لہر میرے اندر مقید ایک سوالیہ نشان کے ساتھ ہوگئی۔

فاری منیبہ آپی کو کوئی پریشانی ہے کیا؟

وہ ایک دم سے چپ کر گئی اور غم کے استغراق میں ڈوب گئی۔ اُس کے چہرے پر حزن و ملال چھا گیا۔ شاید کبھی کوئی یہ سمجھ ہی لے کہ اس کے اندر آسودگیوں اور محرومیوں کا کیا تناسب ہے۔

ابھی وہ جواب دینے کے لیے لفظ ترتیب دے رہی تھی کہ اچانک سے باہر کا دروازہ کھلا اور اُس کا بہنوئی ہنستے چہرے کے ساتھ بڑے بڑے فروٹ کے شاپر لیے اندر داخل ہوا۔ اتنے میں منیبہ آپی نماز ختم کر کے جائے نماز تہہ کرتے ہوئے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

اظفر بھائی (فاری کے بہنوئی) نے بڑی محبت آگیں نظروں سے منیبہ کی طرف دیکھا تو وہ اُداس چہرے کے ساتھ مسکرا دیں پھر باتوں باتوں میں کوئی ایسی سرگوشی کی کہ دیر تک منیبہ آپی کے دل پر ڈال کا اک کی تک تک چھائی رہی۔

فاری نے اب اُن کی مہمان نوازی کرنی تھی۔

فاری اور منیبہ آپی دو بہنیں تھیں۔ جب فاری آٹھ برس اور منیبہ آپی بارہ برس کی تھی تو امی کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوا اور ابو کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ اور وہ ابدی سفر پر روانہ ہوگئی تھیں۔ افسوس کے لیے آئے ہوئے مہمان بھی چلے گئے۔ بہت دن سناٹوں کا راج رہا۔ کسی کے پاس بولنے کو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ پھر بابا نے آہستہ آہستہ ان کو غم کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالنے کے لیے انہیں صبح آفس جانے سے پہلے اور واپسی پر تھوڑا تھوڑا سمجھاتے۔

بہت سے لوگ ہیں جن کے ماں کے ساتھ ساتھ باپ بھی نہیں ہے۔ یہ سب ہمارے خدا کی مرضی ہے، جسے چاہے زندگی دے اور مرضی ہو تو اُس کو پہلے ہی اٹیک میں اپنے پاس بلالے۔ آج سے طے کرلو کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کا سہارا بن کے جینا ہے۔ میں تمہارا باپ بھی ہوں اور ماں بھی۔

تم سمجھ لو کہ خدا نے مجھ پر دونوں رشتوں کی ذمہ داری ڈال دی ہے اور میری خوشی اسی میں ہے کہ تم دونوں خوش رہو۔ اُداسی کو دور بھگاؤ۔ کچھ توقف سے انہوں نے کہا۔

''پرامس.....'' اور دونوں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر خود کو بے شمار غموں کے باوجود انتہائی مضبوط سمجھنے لگیں۔ یوں رفتہ رفتہ گھر کے ان تینوں لوگوں نے آپس میں سمجھوتہ کرلیا۔

فاری کے ساتھ کچن میں اظفر بھائی کے لیے چائے کے ساتھ شامی کباب تلنے کے بعد میں نے واپسی کی راہ لی۔ وہ مجھے روکتی رہ گئی مگر مجھے شام کے بعد کسی بھی فرینڈ کے گھر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ سو میں گھر لوٹ آئی۔

بہت سارے دن..... بند مٹھی میں ریت کی طرح پھسلتے چلے گئے اور جانے کتنے ماہ بیت گئے۔ دسمبر کی دھند نے دن کو بہت جلد شام کی تاریکی میں بدل دیا تھا اور سب ہیٹر کے پاس جمع تھے کہ فاری سرخ چہرے کے ساتھ قصرِ شیریں کی مٹھائی لیے چلی آئی تو میں نے لپک کر اُسے بیٹھنے کو جگہ دی۔

''فاری..... یہ کیا؟'' مٹھائی کی طرف اشارہ کیا تو وہ میرے گلے لگ گئی۔ منیبہ آپی کو خدا نے بیٹے سے نوازا ہے۔ سیزیرین کی وجہ سے وہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ مجھے تو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ناک نقشہ کیسا ہے۔ منیبہ آپی کے بے بی کا سن کر اظفر بھائی تو بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ میرے اتنے سارے سوالوں کا جواب آنے والے دن میں مل گیا۔

جب دوسرے دن ان کے ساتھ ہسپتال آئی تو منیبہ آپی کے پاس صرف فادیہ تھی۔ اور اظفر بھائی ابھی ابھی گئے تھے اور جوس منیبہ آپی کے لیے لے کر آئے اور جلدی میں تھے۔ کیونکہ انہیں رات کو پھر منیبہ آپی کے پاس رُکنے کے لیے آنا تھا اور میں حیران تھی فاری بتا رہی تھی کہ منیبہ آپی کی ساس صرف دنیاداری پوتے کو دیکھنے ضرور آئی تھیں۔ دوبارہ نہیں آئیں۔ میں حیرت میں غوطہ زن تھی کہ فاری نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک کاؤنٹر پر لے گئی۔

منیبہ آپی کا بچہ دکھانے کو کہا تو 16 نمبر کارڈ والا بچہ دکھایا گیا۔ جو ہو بہو اظفر بھائی کی صورت تھا۔ امی نے منیبہ آپی کے ہاتھ میں بے بی سوٹ اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ایک پیکٹ رکھا۔ جسے فادیہ نے کے بعد فاری نے آپی کے بیڈ کے ساتھ پڑی سائیڈ ٹیبل کے دراز میں رکھ دیا۔ بہت سی دعائیں دیتے ہوئے ہم اُس کی ساس اور نند کے برے سلوک پر اظہار افسوس کرتے گھر لوٹ آئے۔ جو اپنی پہلی بہو اور پہلے پوتے کی پیدائش پر ہسپتال غیروں کی طرح چکر

موبائل

بالشت بھر کی دنیا
جادو نگر کی ڈبیا
ویران دل کی نگری پل میں آباد کر دے
دُور کرے اُداسی روشن حیات کر دے
بکھرے ہوئے پرندے مل کر سر ملاتے
بتی بنیرے رکھ کے اب کون راہ تاکے
کھٹ سے سندیسہ آیا گھر کا یہ ڈاکیا ہے
کھلتا ہے دعوت' نامہ شادی مبارک بادی
عید سعید مبارک' مبارک عید آزادی
ہوتی نہ کوئی خبر پہلے دورانِ سفر
پل پل کی اب خبر ہے مسافر کہاں کہاں ہے
شام ہو یا سحر ہو یا رات کا پہر ہو
بارش برس رہی ہو تھالی پکوان والی
کوسوں سے لا دکھائے
کیا آپ نے نہ یہ سنا ہے
حیرت کدہ ہے یارو' ہر جا رسائی ہے
چھوٹی سی ڈبیا میں دُنیا سمائی ہے
دوری کہیں اب دوری
دوری نہیں مجبوری
گر چہ یہ سچ ہے لیکن
پورا یہ سچ نہیں ہے
دوری نہ دور ہوتی شعلہ بیانیوں سے
انکھیاں نہ ٹھنڈی ہوتی آواز کے جہاں سے
پانی جو مانگے میا' پانی پلا نہ پائے
کاندھے پر غیر کے ہو بابا کا سفر آخر
میلوں کی دُوریوں سے فرزند دیکھتا ہو
ظالم کی قید میں جو ہو دلدار اپنا
خاک ایسے رابطے پہ سمندر پار اپنا
آتش بھڑکتی ہو، کوسوں کی بے بسی ہو
جاں سولی پر چڑھی ہو خدا نہ کرے کبھی ہو
پر ہو کبھی جو جائے
دوری سی دوری ہو

دردانہ نوشین خان۔ مظفر گڑھ

لگا کر چلے گئے تھے مگر بہو کی خدمت اس کی بہن اور باپ، یا پھر اظفر بھائی کے ذمہ تھی۔ اور وہ آفس کی ڈیوٹی کے ساتھ ہسپتال کے چکر بھی کاٹ رہے تھے۔ شاویز بھائی کے اسپین سے آنے کی دیر تھی۔ (جو کہ میرے خالہ زاد تھے) کہ میری آپی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ پھر اس کے بعد بڑے چچا کی ڈیتھ ہوگئی کوئٹہ میں......

ہم وہاں چلے گئے۔ انہی چکروں میں فاریہ کا حال احوال ہی نہ جان سکی۔ بڑی عید کے گزرنے کے بعد محرم جو آیا تو ہم صبح صادق کی مجلس امام بارگاہ میں سننے گئے مجلس کے اختتام پر علم برآمد ہوا تو میری نظر پڑی آپی منیبہ علم کے کونے کو پکڑے چوم رہی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں اُس کے سر ہوگئی۔

''مجھے بتاؤ فاری آپی منیبہ کو کیا پریشانی ہے۔ اتنا کیئرنگ، لوونگ شوہر اور دو پیارے پیارے بیٹے ہیں گود میں پھر کیا مسئلہ ہے، کیا دکھ ہے اُن کو؟'' فاریہ کی آنکھیں پہلے سے تر تھیں۔ آہ بھر کے بولی۔

''بس یار سب کچھ ٹھیک ہے مگر اُن کی ساس اور نند اُن کو جینے نہیں دیتیں۔ زوال ہمیشہ اندر سے آتا ہے یہ بات موہنجوداڑو نے ثابت کی۔ جس کی سات تہیں ہیں جو سات بار اُجڑ کر آباد ہوا۔ اور ان میں سے ہر تہہ اپنے سے نیچے والی زمانی لحاظ سے ماہ قبل کی تہہ سے کمتر ہے۔ یاد رکھنا جن بیٹیوں کی مائیں زندہ نہیں ہوتیں ناں ان کی سسرال میں عزت افزائی نہیں ہوتی۔ مفلسی بھی ذلت کا باعث بنتی ہے۔

کیونکہ سسرال والوں کو پتا ہوتا ہے کہ چاہے کیسا بھی سلوک کریں کون سا ماں نے پیچھے آنا ہے۔ باپ کو کاروباری بکھیڑوں سے فرصت نہیں ہوتی۔ کہنے سننے والا کوئی نہیں۔ ماؤں کا دھیان ہی بیٹی کے گھر کی طرف رہتا ہے کہ اس طرف سے ٹھنڈی ہوا آئے اور اُن کو سکون رہے۔ فاری کے ننھیال والے

تقسیم کے وقت پاکستان آنے کی چاہ میں سمجھوتہ ٹرین کی نظر ہوگئے تھے۔ بس پورے خاندان میں اِک بابا ہی بچے تھے جو آدھے پاگل ہوئے پھر رہے تھے۔ پھر وہیں کیمپ میں انہی کی طرح تنہا سہمی سی لڑکی سے بزرگوں نے نکاح پڑھوا دیا۔ لہٰذا کوئی اضافی رشتہ بھی نہ تھا۔ جس کا آسرا ہوتا وہ بات سناتے سناتے رو پڑی۔

''تو اظفر بھائی اپنے گھر والوں کو روکتے نہیں؟''

''نہیں اُن کے سامنے نہیں کرتیں۔'' اُن کے آفس جانے کے بعد بہت بے عزت کرتے ہیں۔ اگر بھائی پوچھتے ہیں تو صاف مکر جاتی ہیں۔ مفلس اور بن ماں کی بے بس بیٹیاں اپنی خدمت سے اپنے تئیں ان کا دل جیتنے کی ناکام کوششیں کرتی رہتی ہیں۔ کیونکہ وہ نہیں سمجھتیں کہ مفلسی کا بدلا خدمت نہیں۔ انہوں نے تو قیمتی جوڑوں کی امیدیں باندھ رکھی ہوتی ہیں۔

اور اُن کا فارغ وقت مشغلہ ہی یہی تھا۔ اس کے جہیز پر تنقید کرنا جسے سُن کر منیبہ آپی کی ذات ریزہ ریزہ ہوتی رہتی اور وہ منتظر ہی رہتی کہ بغیر طنز کے بھی اس سے کوئی بات کرے۔ بتاتے بتاتے فاریہ آنسوؤں پر جبر کرنے کی کوشش میں چہرہ تر ہوتا جا رہا تھا۔

اُس کی باتیں سُن کر صدمے سے کچھ نہ بول سکی اور امی کے ساتھ گھر آگئی۔

دن رات دل سلگتا رہتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے جہیز کو پلڑے میں رکھا جاتا ہے۔ بہو کی خدمت وتابعداری کو اہمیت کیوں نہیں دی جاتی کچھ عرصے بعد پتا چلا منیبہ آپی کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اس ظالم دنیا سے دستبردار ہوگئیں۔

یوں ایک ظلم جبر کی کہانی اپنے انجام کو پہنچی۔

☆☆......☆☆

ماہنامہ دوشیزہ کراچی ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

- ...... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے' جس کا گزشتہ چوالیس (44) برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کررہی ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔
- ...... اِس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔
- ...... پوری دنیا میں پھیلے' اِس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں' جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔
- ...... اِس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔
- ...... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔
- ...... اِس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں' جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔
- ...... آپ کی مصنوعات کے اشتہار باکفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔
- ...... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: دوشیزہ

II C-88 فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7' کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

افسانہ

مہتاب خان

محبت ایک روگ

''ابو کبھی چچا نے آپ کو اپنے ہاں نہیں بلایا؟'' کچھ سوچ کر عینی نے سوال کیا اس سوال پر ابو کے مسکراتے لب ساکت ہو گئے تھے۔ ''کتنے عرصے تو میں انہیں یاد ہی نہیں آیا۔ اب جو آ کر ملے ہیں تو بلا گئے ہیں۔'' وہ بولے۔ ''لوگوں کے کتنے رشتے دار ہوتے ہیں ہماری تو......

عورت کو کھیل تماشے کی شے سمجھنے والے مردوں کو آئینہ دکھاتی تحریر

اس دن وہ کالج سے گھر آئی تو اس کے سادہ سے ڈرائنگ روم میں ایک بڑی شاندار شخصیت موجود تھی۔ اس کے لیے ان کا چہرہ قطعی اجنبی تھا۔ بہترین تراش خراش کا سوٹ پہنے ہوئے اس شخص کو پہلی بار اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ امی اور ابا ان کی آمد پر کتنے خوش تھے اس کا اندازہ ان کے چہرے سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

یہ تمہارے چچا ہیں، ابا کے لہجے سے بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے انہیں سلام کیا اور دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگی۔ اسے یاد آیا کہ ابا اکثر اپنے سوتیلے بھائی اور بہن کا ذکر کیا کرتے تھے لیکن نہ تو وہ کبھی ان سے ملنے گئے تھے اور نہ ہی کبھی ان کے گھر آئے تھے۔ ابا نے ایک بار ذکر کیا تھا جب وہ چھوٹی تھی جب وہ ایک بار ان کے گھر آئے تھے۔ پھر وہ ملک سے باہر چلے گئے تھے اور ان سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

آج اتنے سالوں کے بعد انہیں بھائی کی یاد آئی تھی۔ قیمتی لباس پہنے وہ کہیں سے اس کے ابا جیسے سادہ مزاج انسان کے بھائی نہیں لگ رہے تھے۔ یہاں آ کر عینی میرے پاس بیٹھو۔'' انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

وہ جھجکتی ہوئی ان کے پاس جا بیٹھی، انہوں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بہت پیاری بچی ہے آپ کی بھائی جان۔''

امی نے اس دن بڑا پر تکلف کھانا تیار کیا تھا۔ جس کی انہوں نے دل کھول کر تعریف کی پھر وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر چلے گئے تھے۔

عینی کی سترہ سالہ زندگی ایک مخصوص خوش باش پیار بھرے ماحول میں گزار رہی تھی۔ وہ امی، ابا اور چھوٹا بھائی حمزہ۔ امی کی ایک بہن جو جوانی میں ہی بیوہ ہو گئیں تھیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا عدیل جو کہ میڈیکل کالج میں پڑھ رہا تھا۔ عدیل کے والد نے اچھے وقت میں شہر کے وسط میں ایک بڑا مکان بنوایا تھا۔ جس کے ایک پورشن میں یہ دونوں ماں بیٹا رہائش پذیر تھے جبکہ دو پورشن اور نچلے حصے میں بنائی ہوئی دکانیں کرائے پر دی ہوئی تھیں جن کی آمدنی سے ماں بیٹا کی گذر بسر آسانی سے ہو رہی تھی۔

مستقبل کا ڈاکٹر عدیل بڑا ہی سادہ مزاج اور خوش باش فطرت کا مالک تھا۔ جنی اور حمزہ سے اس کی بڑی دوستی تھی دونوں گھرانوں میں بڑا اچھا میل ملاپ تھا۔ ابا کے سگے بہن بھائی کوئی نہیں تھے۔ ان کے دو بہن بھائی دوسری ماں سے تھے جو ایک امیر کبیر گھرانے سے تھیں۔ والد کا انتقال تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ والدہ کے مرنے کے بعد ان کی تمام دولت اور جائیداد ان کے ان ہی دونوں بچوں میں تقسیم ہوئی تھی۔ جبکہ ابا کے حصے میں کچھ نہیں آیا تھا اور آج اتنے عرصے بعد بھائی کی یاد آئی تھی۔

"ابو چچا اور پھوپھی ہم سے کیوں نہیں ملتے۔ آج آئے تو اتنی جلدی کیوں چلے گئے۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی تھی۔

"ایک تو وہ بہت مصروف رہتے ہیں، دوسرے یہ امیر لوگ اپنے غریب رشتے داروں سے کم ہی ملتے ہیں۔

"اور آپ کی بہن انہیں تو ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ پرجوش انداز میں بولی۔ اسے مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے ایک رضوان ہی ہے جسے کبھی کبھار میرا خیال آ جاتا ہے بہت سمجھ دار ہے اس نے بڑی کم عمری سے کاروبار شروع کیا تھا اب اسے بڑی کامیابی سے چلا رہا ہے۔"

"چچا کے بچے بھی تو ہوں گے۔" اس کا تجسس ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"ہاں ایک ہی بیٹا ہے ان کا۔"

"صرف ایک۔"

ابو اس کے سوال پر ہنس پڑے تھے پھر بولے۔

شہریار نام ہے اس کا۔ آخری بار جب میں نے اسے دیکھا تھا تو بہت چھوٹا تھا اب تو ماشاء اللہ جوان

ہوگیا ہوگا۔'' ابو خیالوں میں کھو کر بولے تھے۔

''ابو کبھی چچا نے آپ کو اپنے ہاں نہیں بلایا؟''

کچھ سوچ کر عینی نے سوال کیا اس سوال پر ابو کے مسکراتے لب ساکت ہوگئے تھے۔

''کتنے عرصے تو میں انہیں یاد ہی نہیں آیا۔ اب جو آکر ملے ہیں تو بلا گئے ہیں۔'' وہ بولے۔

''لوگوں کے کتنے رشتے دار ہوتے ہیں ہماری تو بس ایک ہی خالہ ہیں۔ جو کبھی کبھار آ جاتی ہیں یا ہم چلے جاتے ہیں کیا یہ لوگ اس لیے ہم سے نہیں ملتے کہ ہمارے مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔''

''عینی تم کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو کچن میں برتن پڑے ہیں جا کر دھو۔'' امی جو نہ جانے کب ان کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی تھیں بولیں۔

امی کے کہنے پر اسے اٹھنا پڑا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ کچن میں اس کے آجانے کے بعد امی اور ابو میں اسی موضوع پر باتیں ہو رہی ہوں گی جو موضوع وہ چھوڑ کر آئی تھی۔

وہ کچھ دیر پہلے ہی نہا کر نکلی تھی، اس نے گلابی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اس سادہ سے لباس میں وہ گلاب کی ان کھلی کلی سی نظر آ رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی جب حمزہ کمرے میں چلا آیا۔

''آپی چچا جان آئے ہیں اور آج تو چچی جان کو بھی ساتھ لائے ہیں۔''

''ارے واقعی! مگر ابو تو آفس سے واپس آئے ہی نہیں ہیں پھر جلدی سے کنگھا ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور حمزہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں چلی آئی جہاں چچا جان مع چچی جان بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سامنے ہی صوفے پر وہ دونوں بیٹھے تھے۔ چچا جان کی بارعب شخصیت کے باعث وہ تو سلام کے علاوہ ان سے کوئی بات ہی نہ کر سکی تھی۔ ان کے برابر قدرے سانولی رنگت اور نرم نقوش والی خاتون یقیناً چچی جان تھیں۔ انہوں نے اٹھ کر بڑی محبت سے اُسے گلے لگالیا۔

چچا جان نے اس کے سلام میں اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور کوئی بات نہیں کی تھی۔

چچی جان اس سے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہی تھیں۔

''بھابی کچن میں اکیلی گئی ہونگی جاؤ جا کہ ان کا ہاتھ بٹاؤ۔'' چچا جان نے بے حد سنجیدگی سے چچی جان کو حکم دیا تھا۔

''نہیں، نہیں آپ بیٹھیے، چچی جان میں دیکھتی ہوں۔

یہ کہہ کر وہ کچن میں امی کے پاس چلی آئی، وہ کھانا بنانے میں مصروف تھیں مجھے دیکھ کر بولیں۔

تم یہاں کیوں چلی آئی، وہاں مہمانوں کے پاس بیٹھو میں کھانا تیار کرلوں گی۔ تمہارے ابو کو میں نے فون کر دیا ہے وہ بھی بس آنے والے ہوں گے۔'' امی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''چچی جان تو بہت اچھی عادت کی ہیں امی بے حد مہربان سی لگتی ہیں۔''

''ہاں واقعی میرا خیال نہیں تھا کہ رضوان جیسے بندے کی بیوی اتنی سادہ ہوں گی۔ فون پر جب تمہارے چچا نے بتایا کہ بیگم کے ساتھ آ رہے ہیں تو میں گھبرا ہی گئی تھی۔

''آپ نے مجھے نہیں بتایا کہ ان کا فون آیا تھا۔''

''تم اس وقت نہانے میں لگی ہوئی تھی۔''

''یہ ماں بیٹی میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ چچی جان بھی کچن میں چلی آئی تھیں۔

''آپ چل کر بیٹھیں بھابی ادھر گرمی میں کیوں چلی آئیں۔'' امی نے کہا۔

''نہیں گرمی کیسی اور عورت تو آدھی زندگی کچن میں ہی گزارتی ہے۔
''آپ کے گھر میں تو ملازم کھانا بناتے ہوں گے چچی جان۔''
''نہیں بیٹا کھانا تو میں خود ہی پکاتی ہوں۔ شہریار کو ملازم کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں آتا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں تھیں۔
''پھوپھی کیسی ہیں چچی جان ان کے کتنے بچے ہیں؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔
''تمہاری پھوپھی کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔''
''آپ کے ہاں تو آنا جانا ہو گا ان کا۔''
'ہاں عانیہ، مومنہ اور ایاز کی تو بہت دوستی ہے شہریار سے۔'' انہوں نے سرسری انداز میں کہا تھا۔
چچی جان امی کی ہم عمر ہی تھیں۔ مگر امی کی طرح خوبصورت نہیں تھیں اور پراعتماد بھی نہیں تھیں خصوصاً چچا جان کے سامنے تو وہ بہت مؤدب اور سہمی ہوئی سی دکھائی دیتی تھیں۔ یقیناً چچا جان کی بارعب شخصیت ان پر حاوی تھی۔ کھانا کھا کر چچا تو ٹی وی دیکھنے میں مگن ہو گئے اور وہ چچی جان امی کے کمرے بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں اب وہ خاصی ریلیکس نظر آرہی تھیں۔
''تمہارے چچا نے بتایا تھا کہ میری بھتیجی بہت ہی پیاری ہے۔'' وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
'اچھا وہ ہمارے بارے میں آپ سے باتیں کرتے ہیں۔ اس نے حیرانی سے کہا تھا۔
''ہاں، کرتے ہیں بھائی کی کمی وہ بہت محسوس کرتے ہیں۔ بہن جو ہے لیکن اس کا مزاج کچھ اور طرح کا ہے۔ یہ ان کے ہاں کم ہی جاتے ہیں اور ان سے زیادہ بے تکلف بھی نہیں ہیں۔''
اور شہریار کیسا ہے۔ کیا وہ بھی اپنے والد جیسا مزاج رکھتا ہے۔'' امی نے پوچھا تھا۔

''نہیں بھابی شہریار تو ان سے بہت مختلف ہے بہت شوخ اور کھلنڈری طبیعت کا مالک ہے بلکہ انہیں افسوس ہے کہ وہ ان پر کیوں نہیں گیا لیکن اکلوتا ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلا ہے نا صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ اپنی پھوپھو کا بھی انہوں نے اسے جی بھر کے بگاڑا ہے۔''
چھوٹی چھوٹی خوشیاں زندگی کی کتنی بڑی دولت ہوا کرتی ہیں، یہ انسان کو اندازہ نہیں ہوتا اس وقت تک جب تک کہ وہ ان سے نہ روٹھ جائیں یہ چھوٹا سا گھرانہ بھی ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھرپور زندگی گزار رہا تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی اپنے تعلیمی مدارج نمایاں کامیابیوں کے ساتھ طے کر رہے تھے جہاں قدم قدم پر ابو کی رہنمائی حاصل تھی۔ ہر چھٹی والے دن کہیں نہ کہیں باہر سیر سپاٹے کا پروگرام بنالیا جاتا ہے وہ اپنی ہر خوشی اور مسئلے بھی ایک دوسرے سے شیئر کیا کرتے تھے۔ امی ابو کا تعلق ان سے بڑا دوستانہ تھا اور ان کی ہی بدولت زمانے بھر کی خوشیاں ان کی مٹھی میں تھیں لیکن وقت ایک جیسا نہیں رہتا کاتب تقدیر ان کے نصیب میں کچھ اور لکھ رہا تھا۔ یہ خوشیاں بھی ناپائیدار ثابت ہوئیں تھیں کہ اچانک وہ حادثہ ہو گیا جو اپنے ساتھ سب کچھ سمیٹ کر لے گیا۔ اس دن ابو کے کسی دوست کے بیٹے کی شادی تھی، اور دوسرے دن صبح حمزہ کا پیپر تھا امی نے عینی سے کہا۔ ''عینی تم تیار ہو کر ابو کے ساتھ چلی جاؤ۔ میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔''
عینی جو اسٹڈی میں مصروف تھی بولی۔ ''امی آپ اور ابو چلے جائیں مجھے پڑھنا ہے صبح ٹیسٹ ہے میں حمزہ کو بھی پڑھالوں گی۔''
امی بادل نخواستہ تیار ہونے چلی گئی اسے رہ رہ کر ماں کا ابو کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ہاتھ ہلانے کا منظر یاد آرہا تھا۔ وہ اسے حمزہ کا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے رخصت ہوئیں تھیں۔
وہ دونوں اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی حادثے

کا شکار ہو گئے تھے ایک تیز رفتار ٹرک نے ان کی موٹر سائیکل کو اس زور سے ٹکر ماری تھی کہ موٹر سائیکل کئی قلابازیں کھاتی دور جا گری تھی وہ دونوں شدید زخمی ہوئے اور ابتدائی طبی امداد ملنے سے پہلے ہی زندگی کی بازی ہار گئے۔

صدمہ بہت بڑا تھا وہ تو سکتے کے عالم میں تھی کون آ رہا تھا کون جا رہا تھا اسے کچھ احساس نہ تھا عدیل اور خالہ فوری طور پر آ گئے تھے انہوں نے اسے دلاسے دیے تھے۔ عدیل نے حمزہ کو سنبھالا ہوا تھا جو بری طرح روئے جا رہا تھا۔ اس کا سکتہ ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا لیکن جب چچا جان نے آ کر اسے سینے سے لگایا تو جیسے سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

''صبر کرو عینی خود کو سنبھالو، حمزہ کو دیکھو وہ کس قدر رو رہا ہے۔ بہت بڑا نقصان ہوا ہے بیٹی لیکن خود کو بے سہارا بالکل نہ سمجھنا ابھی میں زندہ ہوں تم میرا خون ہو میرے بھائی کے بچے ہو، میرے بچے ہو میں تم لوگوں کو بے سہارا نہیں چھوڑوں گا آج سے تم دونوں میری ذمہ داری ہو۔'' چچا جان کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

چچا جان کا دلاسہ سن کر اس کے آنسو تواتر سے بہنے لگے، خالہ جان ان دونوں کو اپنے گھر لے جانا چاہتی تھیں مگر چچا جان نہ مانے۔

آنے والے دنوں میں کتنے ہی فیصلے ہوتے چلے گئے چچا جان نے سب سے صاف کہہ دیا کہ اب یہ دونوں بچے ان کی ذمہ داری ہیں وہ انہیں اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھیں گے۔ ان کا گھر چچا جان نے بیچ دیا تھا اور کچھ رقم ابو کے فنڈ وغیرہ کی ملی تھی یہ سب رقم چچا جان نے اس کے نام فکس ڈپازٹ کرادی تھی۔

وقت کا کام ہے گزرنا اور ان کی زندگیوں میں وہ لمحہ آ کر خاموشی سے گزر بھی گیا جب وہ اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر اپنے چچا جان کے گھر شفٹ ہو گئے۔

''شہر یار بھائی کہاں ہیں چچی جان.....؟'' حمزہ نے پوچھا۔

''اس کی اپنی مصروفیات ہیں بیٹا وہ گھر میں کم ہی نکلتا ہے دس پندرہ دنوں کے لیے مری گیا ہوا کسی دوست کے ساتھ۔'' آمنہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایک خدشہ جو عینی کے دل میں یہاں آتے ہوئے پیدا ہوا تھا کہ نجانے ان لوگوں کے ساتھ یہاں کیا سلوک کیا جائے گا اب ختم ہو چکا تھا۔

چچا جان نے انہیں شہر کے بہترین تعلیمی اداروں میں ایڈمیشن دلوایا تھا۔

صبح ڈرائیور انہیں ڈراپ کرنے جایا کرتا اور واپسی پر بھی گاڑی گیٹ پر ان کی منتظر رہا کرتی۔

ماں باپ کی نیکیاں کام آ رہی تھیں جو وہ دونوں وقت کی آندھی کی زد میں آنے سے محفوظ رہے تھے۔ خدا نے چچا کے دل میں ان لوگوں کی محبت ڈال دی تھی۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا یہ چھٹی کا دن تھا عینی کافی دیر تک سوتی رہی تھی کہ ملازمہ نے اسے آ کر اٹھایا کہ چچی جان ناشتہ کی ٹیبل پر بلا رہی ہیں۔ حمزہ بھی فریش ہو کر آ گیا ہے۔ وہ ناشتے کی ٹیبل پر پہنچی تو کسی اجنبی کو وہاں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی تھی۔

''آؤ بچوں بیٹھو۔ چچی انہیں دیکھ کر بولیں۔

وہ خاموشی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

اچھا تو آپ ہیں حمزہ۔'' اس نے حمزہ سے ہاتھ ملایا۔ اور آپ عینی اس نے اس کی جانب دیکھا تھا۔ پتا نہیں اس کی براؤن آنکھیں ایسے ہی جگمگاتی تھیں یا پھر یہ جگمگاہٹ اسے دیکھ کر ابھری تھی۔ اس نے ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تو وہ جھجکی اور اپنی گردن جھکا لی تو اس نے مسکرا کر ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔

اس نے شہر یار کی طرف دیکھا تو وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا وہ ایک دم کھسیا گئی اسے لگا کہ شہر یار کی موجودگی

کچھ آسان ثابت نہیں ہوگی۔

''می پھوپھو کو فون کیا تھا آپ نے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی......؟'' اس کا انداز جتانے والا تھا۔

''تمہارے ابو نے کر دیا تھا۔'' آمنہ بیگم صفائی پیش کرنے لگیں۔

''میں پھپھو کی طرف جا رہا ہوں رات کو دیر ہو جائے گی۔'' شہریار نے اطلاع دی۔

''رات ہی تو آئے ہو بیٹا پھر جا رہے ہو۔''

''تو کیا ہوا......؟'' اس نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا تھا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ لیکن اس نے جانے کا ارادہ شاید ترک کر دیا تھا کیونکہ اب وہ پاؤں پسارے بڑے آرام سے بیٹھ کر ناشتہ کر رہا تھا۔

پہلی مختصر سی ملاقات میں ہی عینی اور حمزہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شہریار الگ مزاج کا ہے مگر اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی انہیں اس کے گھر میں اس کے ساتھ ہی وقت گزارنا تھا۔

چچا جان کا بنگلا بہت بڑا اور شاندار تھا یہ ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ یہاں آس پاس جو بنگلے تھے وہ بھی بڑے شاندار تھے۔

کئی ملازم مختلف قسم کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان دونوں کی رہائش کے لیے چچا جان نے گھر کے اوپر والا پورشن مخصوص کیا تھا۔ ان دونوں بہن بھائی کے کمرے ویل فرنشڈ تھے جہاں ضرورت کی ہر چیز کا خیال رکھا گیا تھا۔ چچا جان اور چچی جان کا بیڈ روم نیچے کے پورشن میں تھا۔ جبکہ شہریار کا روم انہیں کے پورشن میں تھا۔

''میں تم لوگوں کو اپنے پورشن میں بھی رکھ سکتا تھا مگر میں نے سوچا کہ شاید تم لوگ ریلکس فیل نہ کرو۔ تم لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف چچی جان کو بتا دینا۔'' انہوں نے عینی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

دونوں نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

چچا جان کو کسی کام سے جانا تھا وہ شام تک آنے کا کہہ کر چلے گئے تھے اور چچی جان ان ہی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں تھیں۔

''میں نے تمہاری پھوپھی کو تمہاری آمد کے بارے میں بتا دیا ہے تھا وہ چند روز میں تم لوگوں سے ملنے آئیں گی۔ وہ ذرا اور مزاج کی ہیں ان کی باتوں کا تم لوگ برا نہیں منانا، وہ میری بھی عزت نہیں کرتیں ہاں اپنے بھائی اور شہریار کو بہت چاہتی ہیں اور شہریار بھی تو ان پر جان چھڑکتا ہے۔ پھوپھو سے ملے بنا ہی ان کی کافی ہیبت ناک تصویر دونوں کے ذہنوں میں ثبت ہو چکی تھی۔ رات کے کھانے پر چچی جان نے بہت اہتمام کیا تھا۔

''شہریار تم جلدی واپس آ جانا کھانا سب ساتھ ہی کھائیں گے۔'' انہوں نے بیٹے کو مخاطب کر کے کہا۔ ''نو ممی! میں پھوپھو کے گھر سے ہی کھانا کھا کر آؤں گا۔'' اس نے بنا لحاظ کیے ماں کو جواب دیا پھر اٹھ کر چابی اور موبائل اٹھا کر باہر کی طرف چلا گیا۔ اور چچی جان بے چارگی سے اس کی پشت کو تکتی رہ گئیں۔

صبح وہ سیدھی کچن میں آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ ناشتہ وہ ہی بنایا کرے گی چچی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ صبح چچی کو اٹھنا پڑے۔ وہ کچن میں آئی تو چچی جان ناشتہ بنا رہی تھیں۔ السلام و علیکم! چچی جان، انہیں کچن میں دیکھ کر اس نے انہیں سلام کیا۔ جیتی رہو بیٹی، رات نیند ٹھیک سے آئی۔ جی بہت اچھی، اچھا چلو ناشتہ کر لو پھر کالج بھی تو جانا ہے۔ چچی جان اب سے ناشتہ میں بناؤں گی۔

''ارے نہیں بیٹا! تم جانے کی تیاری کرو میں بنا رہی ہوں۔ وہ مسکرا کر بولیں۔ آج میں آپ کو قیمہ بھرے پراٹھے بنا کر کھلاؤں گی۔'' بہت اچھے بناتی ہوں اس نے چائے کے برتن ٹرے میں سجاتے ہوئے کہا۔

''چلو بیٹی، جیسی تمہاری مرضی۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کالج سے واپس آ کر وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر کچن میں چلی آئی۔ اور جلدی سے پراٹھے تیار کرنے لگی۔

''کیا پکا رہی ہیں امی! اتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔'' شہریار کچن میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''آج عینی کھانا بنا رہی ہے۔'' چچی نے مسکراتے ہوئے بولیں تھیں۔

''یہ میں کھا سکتا ہوں۔'' اس نے عینی کے جواب کے انتظار کیے بغیر وہیں کھڑے ہو کر کھانا شروع کر دیا۔

تھوڑا صبر کر لیں میں اس کے ساتھ چٹنی بنا رہی ہوں۔

''مجھ سے صبر نہیں ہوتا ایسے ہی ٹھیک ہے۔ بہت مزے دار ہے۔''

''بیٹا صبر کر لو ساتھ مل کر کھائیں گے۔'' اب کے چچی بولیں تھیں۔

''امی کچھ یاد ہے آخری بار ہمارے کچن میں پراٹھے کب بنے تھے......؟'' وہ ماں کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

''میری صحت اجازت نہیں دیتی بیٹا۔'' چچی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''پھوپھو کے ہاں بھی تو سادہ کھانا بنتا ہے۔ ایسے مزے دار کھانے نہیں بنتے۔ ارے ہاں یاد آیا۔ آج شام کو پھوپھو آ رہی ہیں بمعہ اپنے بچوں کے۔'' وہ عینی کے قریب ہی کھڑا مزے سے پراٹھوں پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

شام کو آصفہ پھوپھو اپنی دونوں بیٹیوں عانیہ اور مومنہ کے ساتھ آئیں تھیں۔ لڑکیوں کی سج دھج اور ان کی تیاری دیکھ کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ تو بہت سادہ رہتی ہے۔ عینی نے پھپھو کو سلام کیا اور عانیہ اور مومنہ سے ہاتھ ملایا۔ آصفہ نے اس کے سلام کا جواب سر ہلا کر دیا اور اس پر بڑی گہری اور سرد نگاہ ڈالی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا چھپے۔

''بھائی بڑے دن ہو گئے آپ نے ہماری طرف چکر نہیں لگایا۔'' ''آپ اب بھولتے جا رہے ہیں ہم۔'' زور ''اب'' پر تھا۔ عینی سمیت سب نے محسوس کیا تھا۔

میں پہلے بھی کب زیادہ آتا تھا۔ شہریار جاتا رہتا ہے اور سناؤ تمہارے میاں اور بیٹا کیسے ہیں......؟''

''ٹھیک ہیں ابرار کو تو آپ ہی سمجھائیں کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرے پھر کاروبار شروع کرے۔ وہ بزنس شروع کرنے کے لیے ضد کر رہا ہے۔''

''اچھا میں اس سے بات کروں گا۔''

چچا جان کچھ دیر ان کے پاس بیٹھے پھر اٹھ کر چلے گئے۔ دونوں لڑکیاں شہریار سے چپکی بیٹھی تھیں۔ وہ لوگ کچھ فاصلے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ان میں سے کسی کا زوردار قہقہہ عینی کی سماعت سے ٹکراتا تو وہ چونک اٹھتی تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر پھپھو اس سے بولیں۔

''اے لڑکی کیا نام ہے تمہارا ذرا میرے لیے پانی لاؤ۔'' بڑی رعونت سے اسے حکم دیا تھا۔

وہ اٹھنے لگی تو آمنہ بیگم نے چپکے سے اس کا ہاتھ دبایا اور سکینہ کو آوازیں دینے لگیں۔

جی بی بی! ہاتھ پونچھتی کمرے میں داخل ہوئی۔

''پانی لاؤ سکینہ۔'' چچی نے سکینہ سے کہا۔ وہ چلی گئی تو آمنہ بیگم بولیں بھابی اب اتنے ملازموں کی کیا ضرورت ہے نکال دیں اسے۔

انہوں نے اسے دیکھ کر جیسے جتاتے ہوئے انداز میں دیکھ کر کہا تھا۔ عینی کے ہاتھ کانپ گئے تھے۔

''اب تو زیادہ ضرورت ہے ملازموں کی ہم لوگ زیادہ ہو گئے ہیں نا۔'' آمنہ بیگم نے رسان سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد عینی خاموشی سے اٹھی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے پردے برابر کرتے ہوئے دیکھا کہ وہ دونوں لڑکیاں شہریار کی گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں شاید وہ لوگ باہر جا رہے تھے۔ کھڑکی کے شیشے کے باہر دھند گہری ہونے لگی تھی۔

رات کو کھانے کی ٹیبل یہاں سے وہاں تک بھری ہوئی تھی اس نے چچی جان کے ساتھ مل کر بہت سی ڈشیں تیار کی تھیں۔ شہریار ٹیبل سے دور کھڑا موبائل پر دھیمی آواز میں کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ عانیہ اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔

''اتنی لمبی باتیں کس سے کر رہے ہو......؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''نہیں کوئی نہیں تم جاؤ کھانا کھاؤ۔'' وہ مسکراتے ہوئے اسے چھیڑ رہا تھا۔

سب ڈشیں بہت ہی اچھی بنیں تھیں۔ پھپھو بھی تعریف پر مجبور ہو گئیں تھیں۔'' بھابی آج کسی خاص ریسپی سے کھانا بنایا ہے۔''

''آج کھانا عینی نے بنایا ہے، اس نے مجھے کچھ نہیں کرنے دیا تمام چیزیں اسی نے بنائی ہیں۔'' وہ پیار بھری نظروں سے عینی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔''

''واقعی! عینی بیٹی تم نے تو کمال کر دیا۔ چچا جان بھی بول اٹھے۔

''چلیں بھابی ایک آسانی تو آپ کو ہو گئی پھپھو نے بھابی کی طرف دیکھا۔

عینی اب خود کچن دیکھنے لگی تھی بہت جلد اس نے سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔

اس دن سردی معمول سے زیادہ تھی وہ چچی جان کے کمرے میں بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ شہریار نہ جانے کب دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔

''کھانا کھاؤ گے بیٹا!'' چچی جان نے شہریار سے پوچھا جو کہیں باہر گیا ہوا تھا ابھی گھر پہنچا تھا۔

نہیں میں آصفہ پھوپھو کی طرف چلا گیا تھا وہیں کھا لیا ہے اور ایک نئی خبر بھی ہے، پھپھو نے مومنہ کی بات تقریباً پکی کر دی ہے۔ عنقریب منگنی کی تقریب متوقع ہے۔'' وہ خوشی سے بھرپور لہجہ میں انہیں بتا رہا تھا اور اس کے نزدیک ہی آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے لیکن جب وہ آئیں تھیں تو ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔'' آمنہ بیگم بولیں۔

دراصل یہ رشتہ مومنہ کی خواہش سے ہی طے پایا ہے وہ اسے پسند کرتی ہے۔''

''ہوں انہوں نے ہنکارہ ابھرا۔''

''ابھی ابا سے رشتے والی بات مت کیجیے گا وہ سوچیں گے کہ بہن نے انہیں بتایا تک نہیں پھپھو ایک دو روز میں مٹھائی کے ساتھ آنے والی ہیں۔''

اگر تمہارے ابا ایسا سوچیں گے تو غلط بھی نہ ہوگا۔ وہ ہمیشہ سے اپنی بہن کا بہت خیال رکھتے رہے ہیں اب جب بیٹی کی شادی کا وقت آیا تو انہوں نے مشورہ تک نہیں کیا بات پکی کر کے اب بتانے آئیں گے تو انہیں دکھ تو ہوگا۔''

بس ایک تو آپ کوئی نہ کوئی اعتراض کا پہلو نکال لاتی ہیں، آپ رنجش پیدا کرنے والی کوئی بات مت کیجیے گا بس۔'' وہ اچھا خاصا خفا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

چچی جان کو اس کا انداز اچھا نہ لگا ان کی آنکھوں میں عینی کو دکھ کے سائے نظر آئے۔

''چھوڑیں چچی جان آپ سوچ کر اپنی طبیعت کو کیوں خراب کرتی ہیں۔ اس نے انہیں دلاسا دیا۔

افسوس ہوتا ہے عینی ان کی خود غرضی دیکھ کر۔ انہوں نے تاسف سے سر ہلا دیا۔

چچا جان کو تب ہی خبر ہوئی جب چھٹی والے دن گیارہ بجے آصفہ بیگم ابرار کے ساتھ مٹھائی لیے آئیں

شہریار جو حمزہ کے ساتھ لان میں کرکٹ کھیل رہا تھا نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور انہیں ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے عینی ان کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔ ابرار بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شہریار نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی اور کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔

''میرے بھائی تمہاری دعاؤں سے اللہ نے مومنہ کا رشتہ کافی اونچے خاندان میں طے کر دیا ہے۔'' وہ مٹھائی کا ڈبہ کھولتے ہوئے بولیں۔

''اس سے پہلے تو تم نے ذکر تک نہیں کیا تھا۔

چچا شکایتی لہجے میں بولے۔

''بس بھائی کیا بتاؤں سب کچھ اتنا اچانک ہی طے ہوا تھا۔'' وہ مٹھائی کا ٹکڑا بھائی کو کھلاتے ہوئے بولیں۔

''میں کہے دیتی ہوں بھائی منگنی کی ساری تیاری تمہیں ہی کرنی ہے کیا دینا دلانا ہے کیا کھانے میں رکھنا ہے میں نے کہہ دیا ہے تمہارے بہنوئی سے جو میرا بھائی فیصلہ کرے وہ ہی ہوگا۔ چچی جان حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''مجھے تو آپ کی خوشی عزیز ہے جو آپ کہیں ویسا ہی ہوگا۔ چچا نے رسان سے جواب دیا۔

''چلو عینی کھانے کی تیاری کر لی ہے۔'' چچی عینی سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔''

''اتنی کیا جلدی ہے مامی۔ ابرار جو بڑی محویت سے عینی کو دیکھ رہا تھا بولا۔

''آپ لوگ باتیں کریں ہم ابھی آتے ہیں۔ عینی ان کے ساتھ ہی کچن میں آ گئی۔ شہریار نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ آج پھپھو کا سارا دن ادھر ہی گزرنا تھا اسے بھی کچن میں آنا غنیمت لگا وہ ابرار کی بے باک نظروں سے گھبرا گئی تھی۔

منگنی کی تقریب تو آصفہ بیگم کے گھر تھی، مگر ساری رونق ان کے گھر میں اتر آئی تھی۔ کبھی عانیہ اور مومنہ شہریار کے ساتھ شاپنگ کرنے کے لیے چلی جاتی تو کبھی ابرار آمنہ بیگم اور چچی جان کو ساتھ لے کر جاتا۔

اس دن بھی ابرار آیا ہوا تھا۔ آج آصفہ بیگم ساتھ نہیں آئی تھیں۔ وہ ابرار کو دیکھتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی گھر میں اس وقت چچی جان ہی تھیں۔

جلدی سے تیار ہو جائیں مامی کپڑے لینے جانا ہے اور یہ عینی کہاں ہے اسے بھی ساتھ لے لیں اکیلے گھر میں کیا کرے گی۔ حمزہ بھی اسکول گیا ہوا ہے۔'' وہ کھوجتی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ تم اسے بلا لو وہ اپنے کمرے میں ہی ہوگی۔ چچی کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

''یہ تم مجھ سے اتنا چھپتی کیوں ہو؟ کیا مسئلہ ہے.....؟ ابرار اچانک ہی اس کے کمرے میں آ دھمکا تھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔''

''ایسی بات نہیں ہے تو فٹافٹ تیار ہو جاؤ ہم بازار جا رہے ہیں۔''

''میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔''

''آپ کی چچی جان نے کہا ہے آپ ساتھ چلیں گی۔ میں باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں جلدی سے آ جائیں۔'' وہ کہتا ہوا چلا گیا۔

باول نخواستہ اسے تیار ہونا پڑا۔

'' ہلکے رنگ کے لباس میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ انتہائی سادہ لباس بھی اس پر جچ جاتا تھا۔ وہ تھی بھی اتنی نازک اور پیاری۔ ابرار مبہوت سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ عینی نے اس بار اس کی آنکھوں میں اپنے لیے واضح پسندیدگی دیکھی تھی۔ اور یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ اس مشہور شاپنگ سینٹر میں وہ کافی دیر شاپنگ کرتے رہے۔ ابرار نے عینی کو بھی ایک

خوبصورت ڈریس دلایا تھا۔ اس کے بہت منع کرنے کے باوجود وہ نہیں مانا تھا۔ پھر چچی جان نے بھی اصرار کیا تو اسے قبول کرنا پڑا تھا۔ چچی جان خاصی تھک گئی تھیں۔ ابرار انہیں ریسٹورنٹ میں لے آیا تا کہ تھکن کچھ دور کی جا سکے۔

کافی پینے کے دوران ابرار کی گہری نظریں عینی کے حسین چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ چچی جان سے نظریں بچا کر وہ اسے گھور رہا تھا۔ وہ سب چیزوں سے بے نیاز سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''مامی جی آپ کی بھتیجی اتنی خاموش کیوں رہتی ہے۔'' اس نے چچی جان سے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں مجھے بھی اس سے یہی شکایت ہے کہ بہت چپ رہتی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

اور عینی نے کسمسا کر پہلو بدلا اسے ابرار کا یوں گھورنا پریشان کر رہا تھا۔

شام کو وہ لدے پھندے گھر پہنچے تو شہریار آ چکا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے شہریار نے ان تینوں کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ وہ لوگ کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ ابرار کے ساتھ عینی کو دیکھ کر شہریار کو ایک ناگواری کا احساس ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے اچھا نہیں لگا تھا وہ اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پایا تھا کچھ دیر وہ وہیں کھڑا رہا پھر کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہاں اس کی مڈ بھیڑ عینی سے ہوگئی۔ جو اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

''سنو تم ابرار کے ساتھ کہاں گئی تھیں؟'' اس نے بارعب انداز میں عینی کو مخاطب کیا۔

''جی کیا مطلب؟'' اس نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

تمہیں مجھے بتا کر جانا چاہیے تھا۔ وہ حکم صادر کرتا ہوا تیز قدموں سے چلا گیا۔

''خواہ مخواہ رعب ڈال رہے ہیں.....؟'' اس کی حیرانی برقرار تھی۔

ابرار تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر چلا گیا۔

بی بی صاحب کوئی عدیل صاحب آئے ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ ایک خاتون بھی ہیں۔'' وہ حمزہ اور چچی جان اس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ملازم نے آ کر اس سے کہا۔ اسی وقت شہریار بھی کمرے میں داخل ہوا۔

''عدیل بھائی آئے ہیں۔'' وہ ایک دم جوش سے بولی وہ اور حمزہ تیزی سے کھڑے ہوگئے اور باہر کی طرف لپکے۔ دروازے کے پاس جا کر عینی چچی جان کی طرف مڑی اور کہا۔

''چچی جان خالہ اور عدیل بھائی کو اپنے کمرے میں لے جاؤں نا۔''

''ارے نہیں ادھر ہی بلا لو نہیں یہ تمہارا اپنا گھر ہے میں چائے وغیرہ کا انتظام کرتی ہوں۔''

عینی خالہ کو دیکھتے ہی ان کے گلے لگ گئی، عدیل کو سلام کیا، عدیل حمزہ کو لپٹائے ہوئے کھڑا تھا۔ وہ انہیں لیے چچی جان کے کمرے میں آ گئی تھی۔

شہریار نے آج پہلی بار اسے اتنا خوش دیکھا تھا اس نے پہلی بار اس کی خوشی سے بھرپور آواز سنی تھی۔ شہریار عدیل اور خالہ سے بہت اچھے انداز میں ملا تھا۔ کچھ دیر وہ ان کے پاس بیٹھا پھر اسے کہیں جانا تھا۔ اس لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ خالہ کو اس کی اور حمزہ کی بڑی فکر تھی۔ اب انہیں خوش و خرم دیکھ کر وہ کچھ مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ اتنی دیر میں چچی جان بھی آ گئیں اور خالہ سے گلے ملیں عدیل کے سر پر ہاتھ پھیرا پھر ان سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں۔

''تم دونوں یہاں آ کر تو ہمیں بھول ہی گئے ہو، کتنے دن ہو گئے ہیں ملنے بھی نہیں آئے خالہ کی یاد نہیں آئی تم لوگوں کو۔'' خالہ نے شکایتی لہجے میں عینی سے

کہا۔

''نہیں خالہ ایسی بات نہیں میں آنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔

پھر وہ ان کی پڑھائی وغیرہ کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ وہ دونوں شام تک ٹھہرے۔ خالہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں کچھ دنوں کے لیے لیکن چچی جان نے یہ کہہ کر ان دونوں کو روک لیا کہ مومنہ کی منگنی کے بعد وہ خود انہیں لے کر خالہ کے گھر آ جائیں گی۔ جہاں چند دن وہ ان کے ساتھ رہیں گی۔

مومنہ کی منگنی کی تقریب میں انہیں بھی شریک ہونا پڑا تھا۔ عینی نے اس روز ہلکی سی ایمبرائیڈری کا فیروزی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ میچنگ جیولری پہن کر تیار ہو کر جب وہ سامنے آئی تو شہر یار نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا وہ عمر کے اس دور میں تھی جب دامن بچانا مشکل ہوتا ہے اور شہر یار کوئی نظر انداز کر دینے والی ہستی تو نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنے اور اس کے درمیان فرق سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ وہ چچا جان کی مشکور تھی کہ انہوں نے سہارا دیا تھا۔ لیکن شہر یار کی آنکھوں میں اس نے جن جذبوں کو کروٹ لیتے دیکھا تھا۔ اس نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیا تھا۔ وہ اپنی ہتھیلیوں پر نمی لیے اس کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ لیکن کہاں تک چھپ سکتی تھی۔ تقریب میں کئی بار ان کا سامنا ہوا تھا۔

دو بھوری آنکھیں مسلسل اس کا تعاقب کر رہی تھیں جن میں اس کے لیے پسندیدگی کی جھلک نمایاں تھی۔

دو اور آنکھیں بھی مسلسل اس کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں اور وہ آنکھیں ابرار کی تھیں۔

''باجی! یہ ابرار بھائی آپ کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔'' حمزہ نے اس سے کہا تو وہ جھینپ گئی تھی۔ اس نے حمزہ کے احساس دلانے پر سامنے دیکھا تو ابرار اپنے چند دوستوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا مگر اس کی نظریں عینی کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ وہاں سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔

تقریب کا انتظام پھوپی جان نے اپنے گھر کے لان ہی میں کیا تھا۔ پھوپی کے گھر سے وہ واقف نہیں تھی اور آج پہلی بار ہی وہ ان کے گھر آئی تھی۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اس کے قدم جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے۔

شہر یار اور عانیہ ایک دوسرے کے لیے بے حد قریب تھے۔ قابلِ اعتراض حد تک قریب تھے۔ ایک تو وہ اندھیرے میں تھی دوسرے وہ اس عالم میں تھے کہ انہیں اس کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا، وہ بے جان قدموں سے واپس پلٹ آئی تھی۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ وہ بار بار سر کو جھٹکتی تھی مگر وہ منظر ذہن سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔

''عینی خیریت تو ہے کیا ہوا تمہارا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟'' چچی جان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''چچی جان سر میں بہت درد ہو رہا ہے گھر کب چلیں گے؟'' وہ انہیں کیا بتاتی۔ وہ غیر شعوری طور پر شہر یار سے بہت محتاط ہو گئی تھی اور حتی الامکان کوشش کرتی تھی کہ اس کا سامنا شہر یار سے نہ ہو۔ وہ اس کمرے میں جانے سے گریز کرتی جہاں شہر یار موجود ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر کچن میں رہتی یا اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھتی رہتی تھی۔

اس دن بھی وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی کہ اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب شہر یار اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا بن رہا ہے بھئی۔'' وہ ایک دم چونک گئی۔ اس کے اس طرح چونکنے پر وہ ہنس پڑا۔ وہ آہستگی سے اس کے قریب سے ہٹ گئی تھی۔ دوپٹہ اس نے اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا تھا جیسے اپنے گرد حفاظتی حصار بنا رہی

ہو۔

''آج کل تم کہاں ہوتی ہو نظر ہی نہیں آتیں؟ مجھ سے اتنا کیوں کترانے لگی ہو یار۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھے اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''جی! کہیں نہیں یہیں ہوتی ہوں، پڑھتی رہتی ہوں۔ ایگزام قریب ہیں نا۔'' اس نے بہانہ بنایا تھا۔

''کچھ مشکل تو پیش نہیں آ رہی۔ اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو ضرور بتانا۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے رُخ پھیرا اور دیگچی میں چمچ چلانے لگی۔

''تم ہنستی بولتی کیوں نہیں۔'' شہریار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ اچھل پڑی۔

''جی ہنستی بولتی تو ہوں۔'' وہ گھبرا کر ایک دم پیچھے ہٹی تھی۔

عورت کا گھبرانا اور کترانا مرد کو مردانگی کا احساس دلاتا ہے شہریار نے مسکراتے لبوں کے ساتھ گہری سانس لی تھی۔

بہت سادہ بہت سویٹ ہو تم کبھی کبھی تو میں تمہیں دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اس زمانے میں بھی ایسی لڑکیاں موجود ہیں۔ شہریار نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں۔'' اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ کھینچا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''ارے پگلی رو کیوں رہی ہو یہ لو ہاتھ چھوڑ دیا۔'' اس نے اپنی انگلی سے اس کے رخسار پر آیا ہوا آنسو چن لیا۔

شہریار یہ جان گیا تھا کہ وہ اس سے کترانے لگی ہے اور اب وہ جان بوجھ کر اس کے قریب آتا اور کوئی ذومعنی جملہ بول جاتا تھا۔ وہ بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ اسے یہی حل سوجھا کہ کچھ دنوں کے لیے خالہ کے گھر چلی جائے۔ چچی جان سے اجازت لے کر اس نے عدیل کو فون کر دیا کہ وہ آ کر اسے اور حمزہ کو لے جائے اور بیگ میں ضرورت کی چیزیں رکھنے لگی۔ اسی وقت شہریار اس کے کمرے میں آیا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' اس نے بیگ تیار کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

''حمزہ اور عینی چند روز کے لیے اپنی خالہ کے گھر جا رہے ہیں۔'' چچی جان بولیں۔

''کیوں خیریت تو ہے؟'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''ہاں! اس دن خالہ بھی شکایت کر رہی تھیں کہ یہ لوگ ان کے ہاں رہنے نہیں جاتے۔ ان لوگوں کا بھی دل چاہ رہا تھا۔'' اس بار بھی چچی جان نے جواب دیا۔ ناگواری کے آثار اس کے چہرے پر نظر آ رہے تھے۔ وہ اس کی خفگی کی وجہ بالکل نہیں سمجھتی تھی۔

''چلو میں تم لوگوں کو چھوڑ آؤں۔'' کچھ دیر خاموش رہ کر شہریار بولا۔

''نہیں عدیل بھائی ہمیں لینے آ رہے ہیں ہم چلے جائیں گے۔ عینی نے کہا۔

''ہاں بیٹا عینی نے عدیل کو فون کر دیا ہے بس وہ آتا ہی ہوگا۔'' شہریار چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

وہ حمزہ کو جلدی جلدی تیار ہونے کا کہہ کر باتھ لینے کے لیے چلی گئی۔ نہا کر نکلی تو جلدی جلدی تیاری مکمل کی اور حمزہ کو دیکھنے اس کے کمرے کی جانب جا رہی تھی کہ جب سامنے سے آتے شہریار کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ اس کو بہت غصے سے گھور رہا تھا۔

انہیں اپنے ہاں دیکھ کر خالہ بے حد خوش ہو گئیں تھیں رات وہ سب دیر تک جاگتے اور باتیں کرتے رہے تھے۔ موضوع عدیل کی شادی کا تھا خالہ چاہ رہی تھیں کہ اب عدیل کی شادی کر دی جائے۔ اس کا ہاؤس جاب مکمل ہونے والا تھا۔ ان کی یہ باتیں سن کر مسکراتے ہوئے عدیل بھائی اسے بہت اچھے لگ رہے

تھے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ خالہ نے کس لڑکی کو بہو کے طور پر پسند کیا ہے مگر چاہتے ہوئے بھی پوچھ نہ پائی۔

صبح عدیل بھائی کے ساتھ وہ کالج گئی اور واپسی پر وہ اُسے لینے آئے تھے۔

راستے میں ان کے برابر سیٹ پر بیٹھی عینی ان سے بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی آج وہ وہ دل کھول کر ہنس رہی تھی۔ عدیل بھائی کی ہمیشہ کی طرح بڑی سنجیدگی سے اس کی باتیں سن رہے تھے کہ وہ اچانک بولے۔

''عینی تمہیں کچھ پتا ہے کہ امی نے میرے لیے کسے پسند کیا ہے؟''

''نہیں تو خالہ نے کچھ بتایا ہی نہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی تھی۔

''جلد ہی تمہیں پتا چل جائے گا'' وہ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولے تھے۔

ان کی ہنسی اسے بہت معنی خیز لگی۔ ابھی اسے خالہ کے ہاں آئے ہوئے دو ہی دن گزرے تھے کہ اس شام شہریار آ گیا۔ خالہ اور عدیل نے بڑے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا تھا وہ کچھ دیر بیٹھا اور پھر عینی سے مخاطب ہوا۔

''میں تم لوگوں کو لینے آیا ہوں تیار ہو جاؤ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

''کیا چچی جان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔''

''ہوں!'' اس نے مختصراً کہا تھا۔

''اچھا میں تیار ہوتی ہوں لیکن حمزہ تو باہر گیا ہوا ہے۔۔'' کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''حمزہ کو رہنے دو وہ بعد میں آ جائے گا تم میرے ساتھ چلو۔'' شہریار بدستور سنجیدگی سے بولا تھا۔ کچھ دیر وہ تذبذب کا شکار ہو کر خاموش کھڑی رہی۔

خالہ بولیں!'' جاؤ بیٹا چچی جان کو تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی، جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

شہریار کی غیر معمولی سنجیدگی اسے کچھ انہونی کا احساس دلا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر شہریار کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اس نے راستوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیا کہ گاڑی کہاں جا رہی ہے یہ سفر تو خاصا طویل ہو گیا تھا اس نے چونک کر کھڑکی کے باہر دیکھا تو راستے بھی انجانے لگے تھے آبادی کے آثار ختم ہوتے جا رہے تھے وہ کسی غیر آباد جگہ گزر رہے تھے اِکا دُکا نئی تعمیر ہونے والی عمارتیں تھیں۔ وہ بری طرح گھبرا گئی اور بولی۔

''یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

خاموش بیٹھی رہو۔ اس کے چہرے کی سنگینی اسے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔

''یہ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟'' وہ رونے والی ہو گئی تھی۔

''رونے کی ضرورت نہیں ہے یہاں تمہارے رونے چلانے کی آواز سننے والا دور دور تک کوئی نہیں ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا تھا۔

''پلیز رحم کریں واپس چلیں میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ آپ نے چچی جان کی بیماری کا جھوٹا بہانہ بنایا تھا نا۔'' وہ باقاعدہ رونے لگی۔

''ارے بابا بس کرو میں نے کیا کیا ہے تمہارے ساتھ، تسلی رکھو۔ اس نے اس ویرانے میں ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی تھی۔

میں تم سے صرف بات کرنا چاہتا ہوں تم گھر میں تو مجھ سے چھپتی پھرتی ہو میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے تمہیں یہاں لایا ہوں۔''

تم مجھے سچ سچ بتاؤ تم مجھ سے اتنا کیوں کتراتی ہو۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

عینی کے تو ہوش ہی اڑ گئے وہ کیا جواب دیتی۔ اب مجھے فوراً گھر لے چلیں اس نے منت کرتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے چھوڑ دوں گا۔ مگر میری بات کا جواب دو پہلے اور تم نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے جملہ

پھسل گیا۔

"آپ اور عانیہ منگنی والے دن......" اچھا تو یہ بات ہے۔ تم غلط سمجھتی ہو ہم دونوں بہت اچھے دوست نہیں اور ہماری کلاس میں ایسی باتوں کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ سچ پوچھو تو میری ایسی بہت سی لڑکیوں سے دوستی رہی ہے لیکن جو بات تم میں ہے کسی میں نہیں تم نے میرا چین وسکون چھین لیا ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور رہی عانیہ کی بات تو اس سے مجھے محبت نہیں ہے وہ ایک آزاد خیال لڑکی ہے وہ شادی کرنا بھی نہیں چاہتی۔ اس نے عینی کی جانب پرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے شادی نہیں کروں گی۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"اچھا!" شہریار نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

تم مجھے جانتی نہیں ہو۔ جو میں ٹھان لیتا ہوں وہ کر کے رہتا ہوں تمہیں اپنا بنا کے رہوں گا۔ اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور گاڑی واپسی کے لیے موڑنے لگا۔

اور یہ بھی سن لو مجھے تمہارا ابرار اور عدیل سے یوں ہنس ہنس کر باتیں کرنا بالکل پسند نہیں۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ اس نے تنبیہ کی، عینی کو ایک دم اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی باقی سارا راستہ دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔

گھر پہنچنے پر چچی جان اس کی یوں اچانک آمد اور اکیلے چلے آنے پر حیران ہوئی تھیں۔ ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی شہریار بتانے لگا کہ عینی نے اسے آفس میں فون کیا تھا کہ خالہ کے گھر دل نہیں لگ رہا اسے آ کر لے جاؤں اسی لیے وہ آفس سے سیدھا عینی کو لینے چلا گیا تھا۔

وہ چچی جان کو سلام کر کے خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

دروازہ لاک کر کے لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں ایک فلم سی چل رہی تھی۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

پھر رات کھانے کے لیے چچی نے اسے بلوایا۔ کھانے کی ٹیبل پر شہریار نے سب سے نظر بچا کر اسے دو تین بار گھور کر دیکھا تھا۔ لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے کھانا کھاتی رہی۔ اس دن کے بعد وہ شہریار سے بہت محتاط ہو گئی تھی۔

اپنے کمرے کا دروازہ لاک کر کے سونے لگی تھی۔ دو تین دن بعد حمزہ بھی واپس آ گیا تھا۔ اب وہ حمزہ کو اپنے ساتھ سلانے لگی تھی۔ امتحان بھی سر پر تھے۔ وہ ہر خیال جھٹک کر صرف نوٹس بنانے میں محو تھی جب رات گئے وہ اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ اسے دیکھ کر عینی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ آج کیسے وہ دروازہ لاک کرنا بھول گئی تھی۔ حالانکہ وہ تو بہت محتاط رہنے لگی تھی۔

"آپ اس وقت یہاں؟" وہ ڈر گئی اور بری طرح کانپنے لگی۔

ارے بابا جا رہا ہوں تمہارے کمرے کی لائٹس جلتی دیکھی تو چلا آیا اور ہاں یہ زیادہ پڑھائی وڑھائی کی ضرورت نہیں ہے آرام کرو۔"

اسے گھبراہٹ میں کھڑی ہو جانے والی عینی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ چھوڑیں مجھے۔" اس کے ہاتھ اب بھی اس کے کندھوں پر تھے۔

"میری ہونے والی بیوی ہو آخر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا عینی نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔

"کبھی مسکرا کر پیار سے بھی دیکھ لیا کرو۔ ترس گیا ہوں، تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے پیار دیکھنے کے لیے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھوں گا۔"

"آپ یہاں سے جارہے ہیں یا میں چچی جان کو آواز دوں؟" وہ تیز لہجے میں بولی تھی۔

"جارہا ہوں۔" کہتا ہوا وہ چلا گیا۔" اور عینی کافی دیر سر تھامے بیٹھی رہی۔"

اس دن پھوپھی جان بمعہ اپنی لڑکیوں کے کسی خاص مقصد سے آئی تھیں۔ انہوں نے چچا جان سے عینی کے رشتے کی بات کی تھی۔ اسے اپنے بیٹے ابرار کے لیے مانگا تھا۔ جب ہی یہ عقدہ کھلا کہ خالہ جان نے بھی عدیل کے لیے عینی کا رشتہ مانگا ہے۔ چچا جان اور چچی جان سر جوڑے بیٹھے تھے۔ انہوں نے پھوپھی کے جانے کے بعد عینی کو بلایا تھا۔ چچا جان نے عینی کو ان دونوں رشتوں کے بارے میں بتایا اور اس کی رائے لی۔"

اچھا تو عدیل بھائی اس روز اسے اشاروں کنایوں میں اس رشتہ کے بارے میں بتانا چاہ رہے تھے۔ اس نے دل میں سوچا۔ عدیل کی عادت واندازا سے بہت پسند تھیں مگر کبھی اس نے ان کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ جبکہ ابرار کے بارے میں اس کے دل میں کوئی جذبہ نہیں تھا گو کہ وہ اسے بے حد پسند کرتا تھا اور پھوپھی جیسی گھمنڈی خاتون اپنے بیٹے کے مجبور کرنے پر ہی اس رشتے پر آمادہ ہوئی تھیں۔

اس نے فیصلے کا اختیار چچا جان کو سونپ دیا کہ وہ جو مناسب سمجھیں وہ کریں اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ چچا جان کو اس کی فرمانبرداری بہت اچھی لگی۔

"عینی حالانکہ ابرار میری بہن کا بیٹا ہے مگر میں تمہارے لیے اسے بہتر نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے عدیل ہر لحاظ سے تمہارے لیے بہترین شوہر ثابت ہوگا۔" انہوں نے اسے بڑے نپے تلے انداز میں سمجھایا۔

"ہم نے ابھی ان دونوں سے جواب دینے کی مہلت لی ہے۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ زندگی تمہیں ہی گزارنی ہے۔" چچی جان نے کہا اور وہ مسرور اور شادی اپنے کمرے میں چلی گئی آج اس کو ماں باپ بہت یاد آرہے تھے۔ کاش یہ فیصلہ اس کے امی ابو کرتے اور وہ آنسو لڑھک کر اس کی گود میں آگرے۔

شہریار کو جیسے ہی پتا چلا وہ بے چین ہوگیا اور تنہائی پاتے ہی اس سے بولا۔

تمہیں صاف انکار کردینا چاہیے تھا۔" اس نے ناگواری سے شہریار کی جانب دیکھا اور سختی سے بولی۔" میں نے فیصلہ چچا جان پر چھوڑ دیا ہے وہ جو میرے لیے مناسب سمجھیں گے وہ کریں گے۔" اور یہ فیصلہ انہی کا ہے۔

"میں خود ابو سے بات کروں گا۔" وہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

پھر جب اس نے اپنے ابو سے بات کی کہ وہ عینی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ اچھل پڑے۔

"میں تو سمجھتا تھا کہ تم عانیہ میں دلچسپی رکھتے ہو۔ بلکہ تمہاری پھوپھو بھی یہی سمجھ بیٹھی ہیں۔ تم دونوں کی تو بچپن سے گہری دوستی رہی ہے۔"

"دوستی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

شہریار کی امی تو یہ سن کر بہت خوش ہوگئیں تھیں لیکن ابو سوچ میں پڑ گئے تھے۔ انہوں نے اسے صاف کہہ دیا کہ کہ "وہ تمہارے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی، جیسے تم میرے بیٹے ہو ویسے ہی عینی کو بھی اپنی بیٹی سمجھتا ہوں، اگر مجھے انتخاب کرنا ہے تو میں اس کے لیے عدیل کو پسند کروں گا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں کہہ رہے تھے۔

ابو میں اسے پسند کرتا ہوں میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔ اس کی خاطر میں خود کو بدل دوں گا پلیز آپ اپنے بیٹے کا دل نہ توڑیے۔ آپ نے بچپن سے لے کر آج تک میری ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش پوری کی ہے تو میری زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کرتے ہوئے آپ میری خواہش کا خیال کیوں نہیں کر رہے۔ میں اس کے بغیر خوش نہیں رہوں گا ابو۔" وہ

بڑے التجا آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔
رضوان صاحب سوچ رہے تھے کہ آج تک ان کے بیٹے نے ان سے اس طرح کچھ نہیں مانگا تھا ہاں وہ ماں سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کیا کرتا تھا مگر ان سے زیادہ بے تکلف نہیں تھا۔ انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔
''اگر عینی کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں عینی سے بات کروں گا۔''
کچھ دن بعد انہوں نے عینی کو پھر طلب کیا۔
''بیٹی! شہریار تم سے شادی کا خواہش مند ہے۔ مجھے تمہاری خوشی ہر حال عزیز ہے۔ اگر تمہاری مرضی ہے تو تمہیں اپنی بہو بنا کر مجھے بے حد خوشی ہوگی۔''
عینی کے لیے یہ بہت مشکل مرحلہ تھا وہ اپنے چچا اور چچی کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی مگر شہریار اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا وہ شش و پنج کا شکار تھی اس کی پریشانی کو دونوں نے محسوس کیا تب ہی چچی جان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی تم پر کوئی جبر نہیں ہے شادی زندگی بھر کا ساتھ ہے ہم تمہیں مکمل اختیار دیتے ہیں کہ تم اپنی پسند سے آگاہ کرو۔''
تب اس نے جھجکتے ہوئے عدیل کا نام لے لیا۔
چچا اور چچی دونوں نے ہی اس کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے اس کو گلے لگا کر دعائیں دیں۔
شہریار کو جب اس فیصلے کے بارے میں پتا چلا تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔ اس کو Rejection کی عادت ہی نہ تھی۔ وہ عینی سے دوٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔
اور اس دن کے بعد جب وہ اپنے لیے چائے بنا رہی تھی تو وہ کچن میں آدھمکا۔ ایک لمحے کو تو وہ اسے دیکھ کر ڈر گئی بھوری آنکھوں میں سرخ ڈورے، شیو بڑھی ہوئی، آج وہ اسے کئی دن بعد دیکھ رہی تھی۔
تم نے میرے لیے کیوں منع کیا عینی وہ غرایا۔
ایک لمحے کے لیے وہ اس کے پاؤں کانپے مگر اپنی ساری ہمت جمع کر کے اس نے بیزاری سے کہا۔ اس لیے کہ مجھے آپ اچھے نہیں لگتے۔
''کیا برائی ہے مجھ میں لڑکیاں مجھ پر مرتی ہیں مجھ سے دوستی کرنا چاہتی ہیں۔ ایک سے ایک فیشن ایبل لڑکی مجھ سے شادی کرنے کی خواہاں ہے مگر میں تم پر مرنے لگا ہوں تم مجھے کیسے انکار کر سکتی ہو......؟ اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔ بار بار اپنی مٹھیاں بھینچتا ہوا شہریار اس کو بالکل پاگل لگ رہا تھا۔
شہریار مجھے آپ کی یہی بات سخت ناپسند ہے کہ لڑکیاں آپ پر مرتی ہیں میں کسی ایسے شخص کی زندگی کا حصہ نہیں بننا چاہتی جہاں پہلے سے بے شمار لڑکیاں آتی جاتی رہی ہوں۔ کلاس کے نام پر چیٹ کرنے والوں سے میں نفرت کرتی ہوں۔''
پتا نہیں اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ وہ سب کچھ بول گئی۔
میں صاف ستھری زندگی گزارنے والے شخص کی منکوحہ بننا پسند کروں گی کیونکہ مجھے بھی زندگی ایک ہی بار ملی ہے اور میں اس میں تجربے کرنے کی بالکل بھی قائل نہیں اور ہاں ایک صاف مرد کو ہی صاف اور نیک عورت نصیب ہوتی ہے اور بدقسمتی سے آپ وہ نہیں۔''
شہریار منہ کھولے اس سادہ سی لڑکی کو دیکھتا رہ گیا جو اپنی بات ختم کر کے تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔
آج شہریار کو احساس ہوا تھا کہ ہر لڑکی اتنی کمزور نہیں کہ ہر بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام لے یا STATUS کی چمک دمک سے مرعوب ہو جائے وہ جن لڑکیوں کو بہن جی ٹائپ کہہ کر مذاق اڑایا کرتا تھا، ان کی سادگی پر جملے کسا کرتا تھا آج ویسی ہی ایک سادہ سی لڑکی اس کو آئینہ دکھا گئی اور آئینہ میں اپنا مسخ چہرہ دیکھ کر وہ خود شرمندہ ہوگیا...... عینی کی محبت کا روگ اب اس کی قسمت میں تھا۔

☆☆......☆☆

خوبصورت جذبوں کی عکاسی کرتی

بے مثال تحریر جو اپنے پڑھنے والوں پر سحر طاری کردے (قسط نمبر 5)

''اب نکاح کے بعد تو اس کی شکل بھی نہیں دیکھیں گی۔ بس زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ وہ خود ہی جان چھڑانے کی کرے گی۔

اور وہ بھائی صاحب ذکیہ بیگم نے یاد دلایا۔

''ارے رہنے دو انہیں اماں بس تم دیکھنا اب وہ خود جائے گی تو وہ بھی کیا کر پائیں گے بس ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔'' وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

''چلو دیکھتے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔'' ذکیہ بیگم سر پکڑ کر بولیں۔

☆......☆......☆

نکاح کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ کب مولوی صاحب آئے؟ کتنے لوگ تھے اسے خبر نہیں ہوئی بس ماں کا چلانا یاد تھا اور اس کے بعد کے وسوسے کہ اب کیا ہوگا۔ عالی کے ساتھ یہ بندھن اب کیا رنگ لائے گا پہلے ہی اس گھر میں جینا دشوار تھا اب تو سانس لینا بھی محال ہو جائے گا اسے ای ابو شدت سے یاد آرہے تھے اگر ہوتے تو یقیناً وہ آج اس حال میں ہرگز نہ ہوتی۔ اس نے عام لڑکیوں کی طرح شادی کے حوالے سے کوئی حسین خواب تو نہیں سجائے تھے مگر اس طرح ہنگامی نکاح کا بھی اسے تصور نہیں تھا۔ رخصتی بھی کیا ہوگی اسے کون سا کوئی دوسرے گھر جانا تھا اس گھر میں تو رہنا تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی اس نے پاس پڑے پھولوں کے ہار کے اوپر سے پتیاں نوچنا شروع کر دیں وہ مسلسل سوچے جارہی تھی اب اس کے علاوہ اس کے پاس کرنے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔

''بیٹا ودیعہ کا خیال رکھنا وہ بن ماں باپ کی بچی ہے اور اپنی ماں کا رویہ تو تم اچھی طرح جانتے ہو۔ ہم نے اسے کبھی بچی خوشیاں نہیں دی ہیں مگر اب تم اسے ہر وہ خوشی دینا جس کا وہ حق رکھتی ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں ابو میں پوری کوشش کروں گا کہ اسے خوش رکھ پاؤں۔'' عالی نے وقار صاحب کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''ویسے ابو عجیب ہنگامے میں سارا کام ہوا ہے۔ میرا نکاح تو عجیب ہی ہے۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

ہاں کیونکہ تم خود عجیب ہو۔ وہ بھی مسکرائے۔ دونوں باہر صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔
''مجھے کبھی نہیں لگا کہ تمہاری اور ودعیہ کی بنی ہے تم اس سے بے زار اور وہ تم سے خفا خفا، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے تم نے اس سے نکاح کا فیصلہ کیا۔'' وقار صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔
''ابو وہ میرا بچپنا تھا اب مجھے عقل آ گئی ہے ناں آخر کو پولیس والا بن گیا ہوں۔'' وہ اکڑا۔
''جی A.S.P صاحب مان گئے کہ آپ کو عقل آ گئی ہے۔
اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں دے۔'' انہوں نے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔
''چلو شکر ہے کہ سب ہو گیا'' وہ بولے۔
''ابو امی کیا کریں گی۔'' وہ فکر مند تھے۔
''بیٹا شاک تو اسے لگا ہے اور جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے اب اس کا رویہ ودعیہ کے ساتھ بدترین ہوگا ان تمہیں ہی ودعیہ کا خیال رکھنا ہے اور اس کی ڈھال بننا ہے۔'' وہ تشویش سے بولے۔
''ہوں میں سمجھتا ہوں ابو'' وہ بھی فکر مند تھا۔
چلو یار اندر چلیں وقار صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔
عالی اپنے کمرے میں جانے لگا کہ ایک دم اس کا دل چاہا کہ وہ ودعیہ کو ایک نظر دیکھ لے وہ چلتا ہوا اس کے کمرے کے باہر تک آیا تھا اس نے مسکراتے لبوں سے دستک دی۔
دوسری دستک پر اندر آنے کی اجازت ملی۔
وہ داخل ہوا کمرے میں بھینی بھینی سی گلابوں کی خوشبو تھی۔ جو غالباً ہار کی پتیوں سے آ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے ہرے اور پیلے کاٹن کے سادہ سے جوڑے میں بیٹھی پتیوں کو مسل رہی تھی۔
عالی کی موجودگی کا احساس پاتے ہی اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ وہ آ جائیں گے۔
''بھائی آپ۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔
عالی کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔ کیا کہا تم نے ابھی؟''
''میں نے کہا کہ آپ یہاں کیسے؟'' وہ شرمندہ سے بولی۔
''آپ سے پہلے کیا بولا تھا وہ ہنس رہا تھا۔''
''کیا بولا تھا۔'' وہ پریشان ہو گئی۔
بھائی بولا تھا آپ نے وہ چند قدم بڑھا۔
اوہ..... اس نے اپنی غلطی کا احساس پاتے ہی سر جھکا لیا۔
''تم خوش ہو ودعیہ۔'' عالی اب سنجیدہ ہوا۔
''خوشی کیا ہوتی ہے؟'' میں شاید اس سے واقف نہیں ہوں۔ وہ طنزیہ ہنسی۔
عالی کو کچھ ہوا تم یہ مت سمجھنا کہ کسی نے زبردستی کی ہے میرے ساتھ۔'' وہ گھمبیر لہجے میں بولا تھا۔
ودعیہ نے سر اٹھایا اس نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں سفید شلوار سوٹ میں وہ دلکش لگ رہا تھا۔
یہ میرا ذاتی فیصلہ ہے وہ ہاتھ پیچھے باندھتے ہوئے بولا۔
کون سا فیصلہ؟ آواز میں سادگی تھی۔
تم سے نکاح کا۔ وہ بھی صاف گو تھا۔
کس چیز کا بدلہ لینا رہتا ہے؟ وہ مسکرائی۔
بدلہ نہیں رہتا بلکہ اب مداوے کا وقت آ گیا ہے وہ سنجیدہ تھا۔
مداوا وہ حیرت سے بولی۔
آپ کو یاد بھی ہے کہ آپ کو کس چیز کا مداوا کرنا ہے۔'' وہ سر جھکا گئی۔
یاد تو نہیں مگر کوشش پوری کروں گا کہ میں ان

تمہیں وہ تمام خوشیاں دے پاؤں جو تمہارا حق ہے اور اب میرا فرض ہے۔

''اب تم اکیلی نہیں ہو اب میں ہوں تمہارا۔'' وہ آخری جملے کو زور سے بولا اور پھر پلٹ گیا۔

ہوں۔ اس نے سر جھکائے بڑے مداوا کرنے والے اب ان ہی کی وجہ سے اور زخم لگیں گے ان کا حساب کون دے گا۔

اگلے دن عالی اور وقار صاحب کے جاتے ہی مامی آئیں اور انہوں نے اسے بے بھاؤ کی سنائیں بلکہ غصے میں تھپڑ بھی جڑ دیا۔ وہ چپ رہی نہ بولی، نہ احتجاج کیا اور نہ ہی آنسو بہائے کیونکہ وہ یہ کام بہت پہلے چھوڑ چکی تھی۔

زندگی معمول پر آ گئی تھی نکاح کو ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ نائلہ کی آمد ایسے ہی جاری تھی بلکہ اب وہ زیادہ آنے لگی تھی۔ عالی کا سامنا ودعیہ سے گن کر دو، تین بار ہوا تھا اب ودعیہ کو اس کی آنکھوں میں بے زاری نظر نہیں آتی تھی اب ودعیہ کو دیکھ کر عجیب سی چمک پیدا ہو جاتی تھی، ودعیہ کترا کر نکل جاتی اور اسے بات کرنے کا موقع ہی نہ دیتی۔

مامی کا چیخنا چلانا معمول تھا۔ اب اس میں شائلہ اپنا حصہ ڈالنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ اور وہ بس خاموش رہتی تھی۔

☆......☆......☆

عالی ان دنوں کافی مصروف تھا۔ شہر کے حالات کو بہتر بنائے اور دہشت گردوں سے اسے بچانے کے لیے سیکیورٹی کے انتظامات کا ذمہ اُس کے پاس تھا۔ اسے دوسرے عہدے داروں کے ساتھ مل کر شہر بھر کا سروے کرنا ہوتا تھا اور جہاں جہاں پر سیکیورٹی کی ضرورت ہوتی اسے وہ دیکھنا ہوتا تھا۔ اس لیے اس کے پاس ٹائم کی کمی تھی۔

وقار صاحب عشاء کی نماز پڑھنے گئے تھے اور ولی بھی اپنے کمرے میں تھا۔ آج مامی کا غصہ دوچند ہوا تھا۔ آج کھانے میں نمک زیادہ ہو گیا تھا جس کا سارا ملبہ ودعیہ پر گرنے والا تھا۔

وہ اب بھی نجانے کون کون سے گناہ اسے یاد دلا رہی تھیں۔

''نہ جانے کیا سمجھ رکھا ہے تو نے اپنے آپ کو منحوس لڑکی، سبز قدم نہ ہوا تو تیرے، اپنے ماں باپ کو کھا گئی پھر نانی کو کھا گئی اور پھر اپنے دادا کو نگل لیا اس بدکردار نے بے حیا کیا ڈورے ڈالے ہیں میرے بھولے بیٹے پہ کہ تیرے چکر میں پھنس گیا ہے وہ بول رہی تھیں۔ بولتی کیوں نہیں تو کیوں بت بنی کھڑی ہے ہاں بول۔'' وہ اس کے بازو کو جھٹکا دے کر بولی۔

''ہاں تو اور کیا شکل سے دیکھو کتنی بھولی لگتی ہے میسنی نہ ہو تو۔'' شائلہ بھی مزے لے کر بولی۔

آج عالی معمول سے جلدی آ گیا تھا ورنہ وہ تقریباً مہینے سے رات کے 12، 1 بجے ہی لوٹتا تھا اس کے قدم پیچھے ہی تھم گئے امی اور بھابی بری طرح سے لتاڑ رہی تھیں اس نے ودعیہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا۔

''بدحرام کہیں کی سالن دیکھا ہے تو نے کتنا زہر کیا ہوا ہے۔'' اب وہ اصل مقصد کی طرف آئیں۔ آنکھیں لاوا اگل رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کچا چبا جائیں اسے۔

''دماغ کہاں ہوتا ہے تیرا منحوس لڑکی، وہ اسے دھکا دے کر بولیں۔

عالی کا دماغ گھوم گیا اور زیادہ غصہ اسے ودعیہ کی خاموشی پر آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے بڑھا اس سے پہلے کہ وہ گرتی اس نے جلدی سے تھام لیا۔

شائلہ تو ایک دم پیچھے کو ہوئی مگر رقیہ بیگم کا اشتعال کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یہ سب؟'' وہ چنگھاڑا۔

''پوچھو اس سے کہ ہوا کیا ہے ہمیں مارنا چاہتی ہے اتنا زیادہ نمک ڈال کر۔ پتہ بھی ہے کہ میں بی پی کی مریضہ ہوں مگر یہ منحوس ہمیں جان سے مارنا چاہتی ہے۔'' رقیہ بیگم نے بات کا بتنگڑ بنالیا۔

''امی نمک زیادہ ہو گیا اور آپ نے اسے اتنی باتیں سنا دیں میں نے سب سن لیا ہے۔'' وہ غصہ دبا کر بولا۔

رقیہ بیگم تھوڑی کسمسائیں اور شمائلہ تو ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے انجان ہو۔

عالی نے ایک نظر امی اور دوسری بھابھی پر ڈالی پھر ودعیہ کی طرف مڑا۔

''اور تم کچھ بول نہیں سکتی چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے کیا تم نے کہ قسم کھائی ہوئی ہے سب سہنے کی۔'' وہ اسے بازوؤں سے جھنجھوڑ کر بولا۔ ودعیہ نے خود سے اسے دیکھا جس کا غصہ کے مارے برا حال تھا۔ اور عالی کے غصے سے تو خدا ہی بچائے یہ سب جانتے تھے۔

تم چلو میرے ساتھ وہ اسے کھینچتا ہوا اوپر لے گیا۔

رقیہ بیگم نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا پھر ایک جاندار مسکراہٹ لبوں پر رینگ گئی۔ اچھا ہے عالی بھی اسے دو لگائے تو عقل ٹھکانے پر آئے گی۔ وہ کہہ کر کمرے میں آرام سے چلیں گئیں جبکہ شمائلہ تازہ ترین اطلاع اپنے میکے میں دینے کے لیے فون پر لگی۔

وہ اسے کمرے میں لایا اور بیڈ کی طرف دھکا دے دیا۔ وہ دھڑام سے گری بیڈ پر اور اس کے پیچھے سے ایک زوردار آواز سے دروازہ بند کیا۔

''تم کیا نیچے چپ کر کے سن رہی تھی ہاں اب وہ اس کی طرف بڑھا۔ وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ خوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''امی اور بھابھی تمہیں فضول میں سنائی جا رہی تھیں اور تم گونگی بنی سب سن رہی تھیں ہاں۔'' وہ دھاڑا۔

وہ ڈر کر پیچھے ہوئی۔ پہلے تو وہ جان بوجھ کر خاموش تھی مگر اب ڈر کے مارے اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔ وہ اسے شانوں سے پکڑ کر بولا اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اسے لگا کہ اسی ہڈیوں کا سرما بن گیا ہو۔''

جواب دو اسے کھڑے کر کے بولا۔

و......و......ہ......ہ وہ اس سے ڈر کے مارے بولا ہی نہیں جا رہا تھا الفاظ جیسے حلق میں اٹک ہی گئے ہوں۔

''کیا وہ......وہ؟'' وہ چلایا۔

جواب نہ پا کر اس نے ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا اور پھر ایک دم پلٹ گیا اور اپنی انگلیاں بالوں میں پھنسالیں اب وہ اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا ودعیہ اب بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

ماتھے پر ننھی ننھی بوندیں تھیں اور ہاتھ بھی گیلے ہوئے محسوس ہو رہے تھے چٹیا سے بال نکل کر جان بجان بکھر گئے تھے کچھ بالوں نے اس کا چہرہ چھپانے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔

''ودعیہ، ودعیہ میں کیا کروں تمہارا وہ ایک دم پلٹا اگر آج یہ ہوا ہے تو یقیناً پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہوگا وہ اب آرام سے بول رہا تھا۔ اور تم چپ چاپ سنتی رہی ہوگی۔

''اس نے اس کے لرزتے وجود کو دیکھا پھر ایک دم اسے بھینچ کر سینے سے لگا لیا تم کب تک چپ رہو گی ودعیہ اپنے لیے بولنا سیکھو۔''

اس نے اسے مضبوطی سے اپنی بانہوں میں تھاما ہوا تھا اور اب اس کا لہجہ یکسر بدل چکا تھا۔

وہ کچھ لمحوں کے لیے حواس باختہ ہوگئی۔ عالی کی اچانک حرکت پر اسے کچھ سمجھ نہیں آیا مگر جب حواس بحال ہوئے اور احساس ہوا کہ وہ عالی کے سینے سے لگی ہے تو اس کا دل عجیب سی لہر پر دھڑکنے لگا اور لرزتا جسم مضبوط سا سائبان پا کر ٹھہرنے لگا۔

ودعیہ کی کان کی لوئیں شرم کے مارے سرخ ہو گئیں۔ اس نے آہستگی سے خود کو عالی کے مضبوط حصار سے الگ کیا۔

عالی کی حرکت جوش جذبے کی وقتی کیفیت تھی اسے جب احساس ہوا تو اس نے بھی جلدی سے اسے علیحدہ کیا۔

پھر وہ پلٹ گیا دونوں چند لمحے اپنے جذبات پر قابو پاتے رہے۔

''دیکھو ودعیہ اب تم خاموش مت رہو بلکہ اپنا دفاع میں بولو۔ اگر چپ رہوگی تو دنیا کی سب سے گناہ گار انسان لوگ تمہیں ہی سمجھیں گے اس لیے بولو اپنے حق کے لیے آواز اٹھاؤ۔'' وہ بغیر پلٹے ہی بولا۔

ودعیہ اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔ میں جاؤں وہ بولی۔

''ہوں۔''

ودعیہ خاموشی سے نکل کر روم میں چلی گئی۔ دل اب بھی بے طرح دھڑک رہا تھا۔

کمرے میں بستر پر لیٹ کر اس کی کیفیت عجیب سی تھی۔ عالی کے بارے میں اس کے خیالات کبھی بھی مثبت نہیں رہے تھے۔ مگر نکاح کے بعد شاید رشتے کا تقاضہ تھا کہ وہ بھی عالی کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کرنے لگی تھی۔ بستر پر لیٹے تو لبوں پر ہلکا سا تبسم رقص کر رہا تھا عالی نے پہلی بار اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے بارے میں سوچے اور یہ بات اسے بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

''یہ کیا پہن کر آئی ہو تم؟'' شمائلہ نے نائلہ کا سر سے پیر تک جائزہ لے کر ناگواری سے کہا۔

''کیا ٹھیک تو ہے میرا سویٹ کاٹن کے ڈھیلے سے جوڑے کو ایک نظر دیکھ کر وہ نا سمجھی سے بولی۔

''ڈھنگ سے تیار ہوا کرو۔ تمہیں یہ بھی سمجھانا پڑے گا نائلہ۔'' وہ قریب آ کر بولی۔

''اچھا لیکچر نہ دیا بتاؤ عالی ہے کیا؟'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''ہاں ہے گھر میں ہی اچھے وقت پر آئی ہو ویسے بھی گھر میں کم ہی ٹکتا ہے۔'' شمائلہ نے تفصیل بتائی۔

''اچھا بتاؤ اماں ابو ٹھیک ہیں۔'' وہ جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''ہاں انہیں کیا ہونا ہے بھلا۔'' وہ بدتمیزی سے بولی۔

''رضوان کا سناؤ کیا حال ہے۔ شمائلہ نے بھی جوس کا سپ لیا۔

''اس کا کیا ہونا ہے وہ ہے اپنی پرانی روش پہ۔ وہ ناگواری سے بولی۔

ہائے میرا بھائی کیا کیا نہیں سوچا تھا اس کے لیے مگر منحوس عین ٹائم پر دغا دے گئی۔ شمائلہ نے غائبانہ ودعیہ کو کوسا۔

ہاں اس کے بارے میں سناؤ کیا حال ہیں اس کے۔ نائلہ دل پر پتھر رکھ کر پوچھا۔

''حال کیا ہونے ہیں اس کے میں نے اور خالہ نے تو جینا ہی حرام کر دیا ہے مگر مجال ہے جو آگے سے کچھ بول جائے۔ چپ کر کے سر جھکا کر سنتی رہتی ہے۔ نجانے کون سی ڈھیٹ ہڈی کی بنی ہے کہ اتنا

صبر اور برداشت ہے لگتا ہے خدا نے ہم سب کے حصے کا صبر بھی اسے ہی دے دیا ہے۔"

"ہاں آپا ہے تو بڑی صبر والی چلیں چھوڑ اس کے صبر کو تو یہ بتا کہ عالی کا رویہ اس کے ساتھ پہلے جیسا ہی ہے نا.....؟"

"مجھے کیا پتا رات کو دیر سے آتا وہ اور میں نے اس کے ساتھ بھی عالی کو دیکھا نہیں مگر میرا خیال ہے یہ پہلے جیسا ہوگا مگر تم اپنا کام جلدی کرلو۔ نائلہ نکاح رشتہ ہی ایسا ہے کہ انسان کا دل کتنا ہی بنجر کیوں نہ ہو نکاح کے بول اس پر رم جھم کی طرح گرتے ہیں اور حق احساس اس میں بیج کا کام کرتا ہے۔ محبت کی کونپل لگنے میں دیر نہیں لگتی سمجھیں۔"

"دیکھنا آپا میں کیسے عالی کو اپنا دیوانہ بناتی ہوں۔ بس تم بے فکر ہو جاؤ۔" نائلہ نے فرضی کالر جھاڑا ہے۔

"مجھے پتہ ہے۔" شائلہ بھی مسکرائی۔

"ودیعہ میری بات سنو وہ گزر رہی تھی کہ عالی کی نظر پڑی تو بلا لیا۔

جی! وہ جھجکتے ہوئے داخل ہوئی۔ اس رات کے بعد وہ اس کے سامنے جھجکنے لگی تھی شرم کی سرخی چہرے پر دوڑ جاتی تھی عالی کا سامنا کرتے ہوئے۔ اور یہ سرخی عالی کو بے حد پسند تھی۔

"میری ریڈ والی شرٹ نہیں مل رہی تم نے رکھی تھی نا کہاں ہے؟" وہ الماری میں منہ گھسا کر بولا۔

وہ میں نے کل دھوئی تھی میں لاتی ہوں۔" وہ واپس پلٹی۔ دروازے پر ناک ہوئی تو اسے لگا ودیعہ ہوگی وہ وہیں سے بولا آ جاؤ یار اب اندر تم بار بار ناک تو نہ کیا کرو" اس کا لہجہ شوخ تھا۔

"مجھے پتا ہے کہ میرا تم پر اتنا حق ہے کہ ناک کرنے کی ضرورت نہیں مگر ادب اداب بھی کوئی چیز ہے۔" نائلہ بے تکلفی سے داخل ہوئی۔

"عالی کا منہ ایسے ہوا جیسے میٹھے باداموں میں کوئی بہت ہی کڑوا بادام منہ میں آ گیا ہو۔" یہ یہاں کیا کرنے آ گئی ہے۔ وہ اکتا گیا۔

"کیسے آئی ہو؟" لہجے کی شوخی یکدم سنجیدگی میں بدل گئی۔

"رضوان کے ساتھ آئی تھی وہ چھوڑ کر چلا گیا ہے۔" وہ بیڈ پر بے ترتیبی سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میرا مطلب ہے کہ میرے کمرے میں آج کس خوشی میں تشریف لائیں ہیں نائلہ بیگم وہ چڑ گیا۔ ایک اس کے بے فضول بات بڑھانے میں دوسرا اس کے بیٹھنے کے انداز پر وہ بے ڈھنگے طریقے سے بیٹھی تھی جس سے عالی ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

"مجھے لگا کہ تم مجھے یقیناً مس کر رہے ہو گے تو سوچا اپنے دیدار کا شرف بخشوں عالی صاحب۔" وہ شوخ ہو کر اپنے شولڈر کٹ بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔

"بڑی مہربانی اب آپ جائیں۔ کیونکہ مجھے تیار ہونا ہے اور کہیں جانا ہے وہ اس کو دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"کہاں جانا ہے آپ کو عالی صاحب، لہجہ شیرینی میں ڈوبا ہوا تھا۔

جہنم میں آپ کو چلنا ہے۔ وہ چڑ کر بولا اسے اس کا بولنا انتہائی زہر لگ رہا تھا۔

"چلیں ہم تو وہاں بھی آپ کے ساتھ چلنے کو کب سے تیار ہیں وہ ایک دم سے کھڑی ہو کے اس کے قریب آ گئی۔" عالی دو قدم اچھل کر پیچھے ہٹا۔

"جاؤ یہاں سے اس سے پہلے کہ میرا دماغ گھوم جائے۔" اب کے لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دوبارہ اشارہ کیا۔

"اورنا جاؤں تو، وہ قریب ہوئی۔

''تو میں اٹھا کر کر باہر پھینک دوں گا۔'' وہ سفاکی سے بولا۔

''تو اٹھاؤ نا......'' وہ بازو پھیلا کر بولی۔

عالی کا دماغ اس کے بانک پن پر گھوم گیا۔''Oh stop this and get lost''

وہ دھاڑا۔

اچانک ودعیہ شرٹ پریس کر کے آ گئی۔ اس نے ناک کرنے کے ساتھ ہی دروازہ کھول دیا۔

اندر وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ نائلہ نے اپنے دونوں بازوں عالی کے سامنے پھیلائے ہوئے تھے اسے دیکھتے ہی بازو گرادیے۔

عالی نے دل میں شکر ادا کیا کہ نائلہ سے جان چھوٹی۔

کہاں رہ گئیں تھیں تم ایک شرٹ لانے میں اتنی دیر لگتی ہے وہ الٹا اس پر برس پڑا اس کے ہاتھ سے شرٹ کھینچی اور واش روم میں گھس گیا۔ جبکہ نائلہ ایک مکروہ مسکراہٹ سے اس کی بے وقوفی پہ ہنس کر چلی گئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ ودعیہ بڑبرائی یہ پہلی بار نہیں تھا کہ نائلہ اس طرح عالی کے کمرے میں ہو وہ کئی بار نائلہ کو عالی کے کمرے میں اس کے قریب ہی کھڑے دیکھ چکی تھی اور ایک بار تو وہ قریب بہت زیادہ ہی تھی اور نکاح کے بعد بھی یہ سلسلہ رکا نہیں تھا۔ بلکہ نائلہ کا آنا اور بھی بڑھ گیا تھا مگر اب وہ نائلہ کو غور سے دیکھنے لگی تھی کھلے بالوں میں شوخ رنگ کے کپڑے، گہرے رنگوں کی لپ اسٹک، اور فٹنگ زدہ کپڑوں میں وہ ادائیں لوٹاتی اکثر ہی آتی تھی اور زیادہ تر اس وقت آمد لازمی ہوتی جب عالی گھر پر ہو۔ اب وہ اتنی بھی بچی نہیں تھی کہ سب سمجھ نہ سکے۔

عالی کا کردار مشکوک ہو رہا تھا ودعیہ کی نظر میں۔

☆......☆......☆

آج ایک بار پھر مائی نے چھوٹی سی بات پہ اسے اچھی خاصی سنائیں تھیں اس کا موڈ خراب تھا رات کا کھانا بھی اس نے نہیں کھایا تھا اور دوپہر میں بھی وہ کپڑے دھونے کے چکر میں کھانا گول کر گئی تھی اب اسے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکلی اور سیدھا کچن میں آ ئی۔

اس نے کھانا گرم کیا اور پانی کا گلاس لینے لگی تھی کہ وہ ڈر گئی۔

''ودعیہ کھانا مجھے بھی دو بھوک لگی ہے۔'' عالی نے پیچھے سے کہا۔

اس کی دبی چیخ نکل گئی۔

کیا ہوا ہے؟ عالی گھبرا گیا۔

ڈر گئی تھی آپ کی آواز پر وہ ہلکی آواز میں بولی مبادا امی ہی نہ آ جائیں ان کا کمرہ کچن کے ساتھ تھا اور نیند کی بھی وہ کچی تھیں۔

''اوہ اچھا Sorry۔'' وہ بولا۔

''پلیز کھانا دے دو۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔

جی! اس نے کہہ کر منہ موڑ لیا عالی پانی کی بوتل نکال کر اور گلاس لے کر ٹیبل پر چلا گیا۔

ودعیہ نے کھانا گرم کیا اور لے کر ٹیبل پر آ گئی۔ وہ عالی سے ایک کرسی کے فاصلے پر بیٹھی۔ عالی نے نوٹ کیا مگر بولا کچھ نہیں۔

ودعیہ نے گھڑی دیکھی رات کا 1 بج رہا تھا۔

''آپ اتنی دیر سے کھانا کھا رہے ہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔''اس کے گیلے بال بال بتا رہے تھے کہ وہ نہا کر آیا تھا۔

''ہاں میں تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں اس لیے۔'' وہ پلیٹ میں چاول ڈال کر بولا۔

''ہوں! ودعیہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

''تم اتنی دیر سے کیوں کھا رہی ہو؟'' وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''و... ہ... وہ مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے نہیں کھایا تھا۔'' وہ سر جھکا کر مصروف انداز سے بولی۔

اب بھی دونوں کے درمیان بات چیت نہ ہونے کے برابر ہی تھی۔

عالی ضرور تا اسے بلاتا تھا اور وہ بھی جی، ہاں، اچھا جیسے الفاظ میں بات تکمیل کر لیتی تھی۔ ہاں البتہ عالی کا احساس اس کے لیے بدل گیا تھا۔ اب اس کی نظروں میں بے زاری نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لیے بلکہ اب ایک اطمینان کا احساس جھلکتا تھا۔

''تم پڑھائی دوبارہ شروع کر لو ودعیہ۔'' عالی پانی پیتے ہوئے بولا۔ مجھے آگے بڑھ کر کیا کرنا ہے اس نے سوچا مگر بولی نہیں۔

''میری طرف سے تمہیں مکمل آزادی ہے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ مگر دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔

اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ودعیہ پر ڈالی اور پھر خاموشی سے چلا گیا۔

ودعیہ نے سر اٹھا کر اس کی پشت کو دیکھا اور دوبارہ پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

وہ دودھ لے کر کمرے میں آئی تو وہ تھکن کے باعث گہری نیند سو چکا تھا کالے بال ماتھے پر تھے، پر سکون نیند سوتے ہوئے اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔ جس نے ودعیہ کی توجہ حاصل کر لی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ماتھے سے بال ہٹانے چاہے مگر مامی کی شام کو سنائی گئیں باتیں ایک دم کانوں میں گونجنے لگیں۔

بے حیا، بے شرم جادوگرنی، بدکردار۔ اس نے تیزی سے ہاتھ کھینچا اور کمرے سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

جب سے پتا چلا تھا کہ شائلہ امید سے ہے مامی کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی انہوں نے ودعیہ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ شائلہ کے آس پاس بھی نہ پھٹکے اور اسے سارے کام کا ذمہ بھی دے دیا تھا پہلے بھی وہی کرتی تھی مگر دیکھتا کون تھا۔

یہ خاص ہدایت بھی اسے معلوم تھا کہ خالہ کی طرف سے آئی ہو گی کہ منحوس کے سبز قدم ہیں اسے میری بیٹی کے آس پاس بھی نہ آنے دینا۔

ودعیہ اور عالی کے نکاح کو تین مہینے ہو گئے تھے۔

دونوں کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا عالی زیادہ ہی مصروف ہو گیا تھا اور ودعیہ بھی گھر کے کاموں میں الجھی رہتی تھی۔

جب بھی ودعیہ کے دل میں کوئی عالی کے نام کی کونپل کھلتی مامی کی باتوں اور کبھی کبھی نائلہ اور عالی کے رویے سے وہ مرجھا جاتی اور وہ یہ سوچتی کہ عالی وقار بدلنے والا انسان نہیں ہے۔ اس کے دل میں کم سے کم ودعیہ کے لیے نیک جذبات نہیں ہو سکتے۔

عالی کی ٹرانسفر کے آرڈرز آئے تھے اسے لاہور سے فیصل آباد ٹرانسفر کیا جا رہا تھا اور وہاں کا چارج اسے دو دنوں میں سنبھالنا تھا۔ اس نے شام کی چائے پر سب کو بتایا ابو کو تو کوئی اعتراض نہیں تھا البتہ امی کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔

''تمہارا جانا ضروری ہے کیا؟'' انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔

''امی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ جانتی تو ہیں کہ میری جوب ہی ایسی ہے۔'' عالی نے انہیں شانوں سے تھاما۔

''تم کچھ کرا نہیں سکتے مجھے ڈر لگتا ہے۔ ملک کے حالات ہی ایسے ہیں اور اوپر سے تمہاری نوکری بھی خطرے عالی ہے لاکھوں دشمن بن جاتے ہیں ایماندار پولیس والوں کے۔'' وہ فکر مند تھی آخر کو ماں تھی۔ اور ویسے بھی جب سے تمہارا اس سبز قدم عالی

لڑکی سے نکاح ہوا ہے ناں تب سے زیادہ ہی فکر کھائے جاتی ہے تمہاری۔ انہوں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹوروں میں لیا۔

''امی زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے بھلا کوئی انسان اسے کیسے چھین سکتا ہے آپ خدا پر بھروسہ رکھیں اور اگر میری جان وطن کے کام آ جائے تو اس سے بڑھ کر فخر اور کیا ہوگا۔''

وہ تفاخر سے بولا ایک سچے سپاہی کے یہ ہی جذبات ہوتے ہیں۔

''شاباش بیٹا مجھے تم پر فخر ہے۔'' وقار صاحب خوش ہو کر بولے۔

جبکہ موت کا نام سن کر اس کے دل میں عجیب سے وسوسے آنے لگے۔

اگر خدانخواستہ عالی کو بھی کچھ ہوا تو اس کی ذمہ دار میں ہی ہوں گی۔

جانے سے پہلے عالی اس سے خاص طور پر ملنے آیا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا ودیعہ اور اگر کوئی پریشانی ہو تو مجھے فون ضرور کرنا او کے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''جی! آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔'' وہ پہلی بار اسے دیکھ کر مسکرائی۔ عالی اس کے منہ سے ایسے کلمات سن کر نہال ہو گیا۔

''پہلے کا تو پتہ نہیں مگر ہاں اب ضرور رکھوں گا آخر تم نے کہا ہے ناں وہ مسکرا کر بولا اور خدا حافظ کہہ کر نکل گیا۔

ماں نے اسے ڈھیروں دعائیں دیں او خدا کے حوالے کیا۔ فیصل آباد کے پوش علاقے میں اسے کوئی کوٹھی الاٹ ہوئی تھی گھر کافی کشادہ اور ہوادار تھا باہر بہت خوبصورت لان تھا گھر مکمل ویل فرنشڈ تھا۔

وہ اپنے ساتھ سامان کے طور پر بس ایک بیگ لایا تھا جس میں اس کا ضروری سامان تھا۔

سلام صاحب! ایک ادھیڑ عمر ملازم نے کہا اور جوس کا گلاس بڑھایا۔ وعلیکم السلام بابا۔ وہ مسکرایا اور گلاس تھام لیا۔

میرے سے پہلے جو صاحب تھے آپ ان کے پاس بھی تھے۔

جی صاحب میں اور میری گھر عالی ادھر ہی تھے۔

وہ باادب بولا۔

ہوں اور کون کون ہے؟'' وہ تفصیلی نگاہ وسیع لاؤنج میں ڈال کر بولا۔

''بس صاحب ہم دونوں ہی ہوتے ہیں اور مالی آتا ہے ایک دفعہ دن میں پودوں کی دیکھ بھال کو اور چوکیدار ہوتا ہے۔'' وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ ویسے آپ کا نام کیا ہے؟'' وہ گلاس واپس دیتے ہوئے بولا۔

''رمضان نام ہے جی مگر مجھے رمضو کہتے ہیں۔''

ہوں ٹھیک ہے اب آپ جائیں رمضو بابا۔

وہ کہہ کر اٹھا اور بیڈروم کی طرف فریش ہونے کے لیے بڑھا۔

☆......☆......☆

اسے آئے ہوئے دو دن ہوئے تھے دن کا تو پتا ہی نہیں چلتا تھا البتہ گھر آ کر ویران گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ گھر میں صرف دو ملازم ہوتے تھے اور کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی انتظار کرنے والا اور نہ کوئی مسکرا کر استقبال کرنے والا۔ اسے گھر والے بہت یاد آ رہے تھے۔

عالی نے گھڑی دیکھی 10 بج رہے تھے اس نے موبائل اٹھایا اور گھر کا نمبر ملایا۔

تیسری بیل پر ریسیو کیا گیا۔

السلام علیکم ابو جان! وہ جوش سے بولا۔

دوسری طرف وقار صاحب بھی اس کی آواز سن کر تر و تازہ ہو گئے۔

وعلیکم السلام بیٹا کیسے ہوتم؟"

ٹھیک ہوں ابو۔ آپ سنائیں گھر میں سب کیسے ہیں۔"

اللہ کا کرم ہے سب ٹھیک ہیں تم بتاؤ کیا ہو رہا ہے۔"

"بور ہو رہا ہوں، ہونا کیا ہے؟ خالی گھر اور میں اکیلا۔" آواز بےزار ہوگئی۔

"ہاں یہ تو ہے انسان اپنی روزی روٹی کے لیے یہ سب تو برداشت کرتا ہی ہے۔" انہوں نے رسان سے کہا۔

"ہوں امی کہاں ہیں انہیں بلائیں وہ ان کی آواز سننے کو بے تاب تھا صرف دو دن ہی ہوئے تھے اور اسے لگا کہ نہ جانے کتنا عرصہ ہوگیا ہے اسے گھر والوں کی آواز سنے۔

"ہاں بیٹا یہ لو آ گئی ہے تمہاری امی۔" انہوں نے ریسیور رقیہ بیگم کی طرف بڑھایا۔ یہ لو عالی کا فون ہے۔"

"ہیلو عالی بیٹا کیسے ہوتم اب فرصت ملی ہے دو دنوں سے کوئی اطلاع نہیں تھی اتنے مصروف ہوگئے ہوتم کیا؟" وہ گلہ کر رہی تھیں۔

"جی امی ٹھیک ہوں وہ دراصل یہاں سارا نظام ابتر ہوا ہے وہیں مصروف تھا کل رات میری واپسی ہی 1 بجے ہوئی تھی۔ اور سارا دن تو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملتا یہاں حالات سازگار ہیں امی۔" وہ مصروفیت بتا رہا تھا اور دوسری طرف رقیہ بیگم کا دل ہول رہا تھا۔

"خطرے کی تو کوئی بات نہیں ہے نا بیٹا۔" وہ پریشان ہوئیں۔

ارے نہیں ایسی بھی بات نہیں بس ذرا نظام خراب ہے یہاں کا اور تو کچھ نہیں وہ انہیں ٹال گیا۔" ورنہ حالات اس علاقے کے کافی سنگین تھے۔

"اچھا! تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔" انہوں نے جیسے خود کو تسلی دی۔ کھانا وغیرہ کا کیا انتظام ہے بیٹا۔

"ارے امی یہاں ملازم ہیں گھر بھی بہت بڑا ہے اور آرام دے ہے آپ فکر نہ کریں اور سنائیں بھابھی اور بھائی کیسے ہیں؟" وہ دانستہ ودعیہ کے بارے میں نہیں پوچھ رہا تھا۔

"ہاں یہاں سب ٹھیک ہیں بس تمہاری کمی محسوس ہوتی ہے تم کبھی اس طرح کہیں گئے نہیں ہو ناں بس اس لیے۔" وہ اداس ہوگئی۔ وہ عالی سے کافی قریب تھیں لہذا اس کی کمی ظاہری طور پر انہیں سب سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

"مجھے بھی آپ سب کی بہت یاد آتی ہے امی بس آپ دعا کریں امی کہ اللہ میرے ملک اور ہم سب کا بہترین کرے۔ وہ عزم سے بولا۔

"ہاں بیٹا بس دعائیں ہی تو رہ گئیں ہیں۔ وہی کرتے ہیں۔"

"اچھا امی میں رکھتا ہوں سب کو سلام کہیے گا اوکے اللہ حافظ۔

"ہاں بیٹا اللہ حافظ اور ساتھ ہی فون رکھ دیا۔

☆......☆......☆

عالی کے جانے سے زیادہ فرق نہیں آیا تھا زیادہ کمی رقیہ بیگم کو محسوس ہوتی تھی ولی اور وقار صاحب تو آفس چلے جاتے تھے۔

شمائلہ اپنی ہی دھن میں مگن رہتی تھی اور ودعیہ کے دل میں اس کے لیے ایسے کوئی خاص جذبے تو تھے نہیں جو اسے یاد کرتی اور ویسے بھی اس کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ سکون سے چند لمحے بیٹھے اور یاد کرے۔

"ودعیہ بیٹا اگر فارغ ہو تو ایک کپ چائے ہی پلا دو سر بھاری ہو رہا ہے۔" وقار صاحب عصر پڑھ کر

آئے تو اسے لان میں پھولوں کے ساتھ مصروف دیکھ کر بولے۔
''جی ماموں فارغ ہوں لاتی ہوں۔'' وہ ادب سے کہہ کر اندر چلی گئی۔
''ارے آگئے آپ۔'' رقیہ بیگم ہاتھ میں تسبیح لیے باہر ہی آگئیں۔ بہار کے دن تھے شام ڈھلے موسم خوشگوار ہو جاتا تھا پھولوں کی خوبصورت رنگ اور پورے جوبن پر لہلہاتے پودے بڑا دلکش منظر پیش کرتے تھے اور ان کی بھینی بھینی خوشبو مزاج پر خوشگوار اثر چھوڑتی تھی۔
''ہاں سر ذرا بھاری لگ رہا ہے ودعیہ سے کہا ہے چائے کا۔'' وہ سر پر ہاتھ رکھ کر اسے مسل کر بولے۔
''بخار تو نہیں۔'' رقیہ بیگم فکر مندی سے گویا ہوئیں۔
''ارے نہیں بس ایسے ہی۔'' وہ عینک درست کرتے ہوئے بولے۔
''یہ عالی آیا نہیں اس اتوار خیر تو ہے ناں۔'' وہ تسبیح کے دانے گراتے ہوئے بولیں۔
''ہاں بات ہوئی تھی میری کہہ رہا تھا مصروف تھا وہ کافی اس لیے نہیں آیا۔ اس اتوار آئے گا۔
''ماموں چائے! اس نے ٹرے ان کی طرف بڑھائی مامی آپ بھی لے لیں وہ دوسرا کپ اپنے لیے لائی تھی مگر مامی کو دیکھ کر ان کی طرف ٹرے بڑھا دی۔
''جا جا کر اندر سے سر درد کی گولیاں بھی لا۔'' وہ کپ پکڑتے ہوئے بولیں۔
جی! وہ کہہ کر اندر چلی گئی۔
''اب تو ذرا نرم لہجے میں بات کر لیا کرو بہو ہے وہ تمہاری۔''
وقار صاحب خوشامدانہ لہجے میں بولے۔

''رہنے دیں بہو ہے۔'' وہ تڑخ کر بولیں ''میں نہیں مانتی بہو وہو دوبارہ مت کہیے گا کہ بہو ہے۔ یہ بس میرے لیے مصیبت ہے اور کچھ نہیں۔'' انہوں نے ہاتھ کے واضح اشارے سے انہیں چپ کروا دیا۔
''بھئی حد کرتی ہو۔'' وہ غصے سے بولے اور اندر چلے گئے۔
''ہونہہ بڑے آئے بہو ہے۔'' وہ ہنکاری اور تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

☆......☆......☆

آج اس نے فون کیا تو دل تھا کہ فون ودعیہ ہی اٹھائے جب سے آیا تھا اس نے آواز ہی نہیں سنی تھی اس کی۔ یہاں پر آنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ ودعیہ کے لیے اس کے جذبات اب عام نہیں رہے تھے نہ ہمدردی ہے اور نہ پچھتاوا بلکہ وہ ودعیہ کو چاہنے لگا ہے اسے سب سے زیادہ یاد ودعیہ کی ہی آتی تھی اکثر وہ بے خیالی میں اپنے کسی کام کے لیے ودعیہ کو ہی پکارتا تھا شاید اس کی یہ عادت بہت پختہ ہو گئی تھی۔ اپنی ہر ضرورت کے لیے اسے پکارنے کی۔
ہیلو ودعیہ کی میٹھی آواز اس کی سماعتوں پر گونجی۔
وہ چند لمحے کچھ بولا نہیں۔
ہیلو......ہیلو کون ہے وہ مسلسل بول رہی تھی۔
''میں ہوں۔'' بھاری آواز آئی۔
عالی بھائی وہ بے ساختہ بول پڑی۔
نہیں صرف عالی۔ ''بھائی'' کچھ زیادہ ہی برا لگا اس لیے شوخی رفو چکر ہو گئی۔
''جی میں وہ بس۔'' وہ پھر شرمندہ ہوئی بھائی کہنے پر۔
کیسی ہو......؟ موڈ بحال ہوا۔
''ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟''
میں اداس ہوں آواز میں واقعی اداسی لگ رہی

تھی۔

''تمہیں میری یاد آتی ہے ودعیہ۔'' وہ ایک دم بول پڑا۔

اچانک ایسے سوال پر وہ گڑ بڑا گئی۔

جی! وہ ناسمجھی سے بولی مگر عالی نے اپنا ہی مطلب اخذ کیا۔

''واقعی میری یاد آتی ہے تمہیں۔'' وہ خوش ہوگیا۔

انہیں کیا ہوگیا ہے یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں وہ ریسیور کو گھور کر بولی۔

''کس کا فون ہے؟'' مامی کمرے سے نکلیں تو اسے فون پر جھکے دیکھ کر بولیں۔

''وہ...... مامی عالی کا فون ہے۔'' اب کے وہ بھائی نہیں بولی۔

''اچھا دو مجھے۔'' انہوں نے فون تھاما۔

''ہیلو عالی کیسے ہو تم۔'' وہ بولیں۔

بہت اچھا ہوں امی۔'' آج وہ واقعی خوش تھا۔

☆......☆......☆

''آ گئے تم لوگ کیا کہا ڈاکٹر نے۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے شائلہ اور ولی سے بولیں۔

''جی کہا ہے سب ٹھیک ہے۔'' ولی نے کہا اور فروٹس ٹیبل پر رکھ دیے۔

''ہوں اللہ کا شکر ہے جاؤ شائلہ تم آرام کرو۔'' انہوں نے شائلہ کو جانے کو کہا۔

''میں بھی چینج کرلوں۔'' ولی بھی اٹھ گیا۔

''یہ پھل کون لایا ہے جو یہاں ٹیبل پر پڑے ہیں۔'' وقار صاحب مغرب کی نماز پڑھ کر آئے تو ٹیبل پر پھل دیکھ کر بولے۔

''یہ ولی لایا ہے ودعیہ او کدھر ہے تو آ اور یہ پھل لے کے جا اور ہاں کل عالی کی پسند کی چیزیں بنانا وہ آ رہا ہے۔'' انہوں نے حکم صادر کیا۔

''کل آ رہا ہے؟'' وقار صاحب خبریں لگا کر بولے۔

''ہاں کہہ رہا تھا کہ شام تک آ جاؤں گا۔'' وہ بھی خبروں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''کل آ رہے ہیں وہ۔'' ودعیہ کو عجیب سا احساس ہوا جسے وہ نام نہ دے سکی۔ ایک دم خوشی ہوئی اور پھر وہ ازلی بے زاری جو عالی سے منسوب رہی تھی۔

☆......☆......☆

آج سارا دن وہ عالی پسند کی چیزیں بناتی رہی تھی۔ عالی کے آنے سے پہلے ہی نائلہ اور رضوان آ گئے۔

''چلو جی۔'' انہیں دیکھ کر ودعیہ بولی۔ ان کا آنا تو جیسے فرض ہی ہے۔ آج نائلہ کی تیاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بالوں کی تازہ تازہ اسٹریکنگ کرائی گئی تھی۔ منہ بھی کچھ صاف لگ رہا تھا۔

فل فٹنگ کے کپڑے تھے اور شوخ رنگ کی لپ اسٹک اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ سانس کیسے لیتی ہے۔

گاڑی کا ہارن بجا تو اس نے کچن کی کھڑکی سے دیکھا عالی کو نئی گاڑی بمع ڈرائیور دی گئی تھی وہ گاڑی سے نکلا اور سیدھا لاؤنج میں آ گیا۔

سب سے وہ ایسے ملا جیسے کتنے سالوں بعد لوٹا ہو حالانکہ اسے گئے پندرہ دن ہی ہوئے تھے۔

وہ جب سب سے مل چکا تو ودعیہ اس کے لیے جوس لے کر آئی۔ اسے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا جسے نائلہ نے بڑی بے چینی سے محسوس کیا۔

''کیسی ہو تم ودعیہ؟'' وہ مسکرا کر بولا۔ یہ پہلی دفعہ تھا وہ سب کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر اس سے ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

شائلہ اور نائلہ نے ایک دوسرے کو دیکھا جبکہ

رقیہ بیگم کا پارہ بھی چڑھ گیا۔ ان کا خیال تھا کہ عالی
نے صرف یہ بندھن مجبوری میں جوڑا ہوگا جلد ہی ختم
ہو جائے گا مگر یہاں تو کھیر ٹیڑھی لگ رہی تھی۔
''ٹھیک ہوں وہ مختصر بول کر چلی گئی جبکہ عالی
اسے جاتا دیکھتا رہا کھانے کے بعد وہ سب کے لیے
جو گفٹس لایا تھا اس نے وہ نکالیے۔
''ارے اس کی کیا ضرورت تھی بھلا۔'' رقیہ بیگم
نے کہا۔
'امی میں پہلی بار باہر سے آ رہا تھا تو سوچا کچھ
لے چلوں۔'' وہ بیگ سے چیزیں نکال کر بولا۔ مجھے
اندازہ نہیں تھا کہ کچھ بن بلائے مہمان بھی ہوں گے
ورنہ ان کے لیے بھی کچھ لے آتا۔'' وہ نائلہ اور
رضوان پر چوٹ کر گیا۔ نائلہ، رضوان اور شمائلہ نے
پہلو بدلا۔
''اب ہم اتنے بھی غیر نہیں ہیں کہ یوں بن
بلائے ہو جائیں۔
نائلہ چڑ گئی۔
ودعیہ بھی چائے کی ٹرے لے آئی۔
''اب اپ کے لیے کتابیں لایا ہوں اور ولی
بھائی آپ کے لیے شرٹ لایا ہوں وہ چیزیں دیتے
ہوئے بولا۔
عورتوں کی خریداری کا مجھے اندازہ نہیں تھا اس
لیے سوٹ لے آیا ہوں۔'' وہ تین خوبصورت
ایمبرائڈری والے سوٹ نکال کر بولا۔ ایک ہلکے گلابی
رنگ کا سوٹ تھا، ایک بادامی رنگ کا اور ایک کالے
رنگ کا سوٹ تھا کالے رنگ کا وہ خاص طور پر ودعیہ
کے لیے لایا تھا کیونکہ یہ اس کا پسندیدہ رنگ تھا۔
''ہائے اللہ کتنے خوبصورت سوٹ ہیں
خالہ۔'' نائلہ للچائی نظروں سے بولی۔
شمائلہ نے گلابی والا سوٹ اٹھایا اور رقیہ بیگم نے
بادامی رنگ کا سوٹ لے لیا۔ نائلہ نے فٹ سے
کالے والا سوٹ اٹھالیا۔
''خالہ میں یہ لے لوں مجھے یہ رنگ بڑا پسند
ہے۔'' وہ نہایت معصومیت سے بولی اور میرے پاس
اس رنگ کا ایک بھی جوڑا نہیں ہے وہ نہایت چالاکی
سے وہ سوٹ ہتھیانا چاہتی تھی وہ جانتی تھی کہ وہ سوٹ
وہ ودعیہ کے لیے لایا ہے۔
مگر یہ تو...... وقار صاحب نے مداخلت کی۔''
ہاں ہاں تم لے لو یہ یہ تمہارے لیے ہی تو لایا ہے
عالی۔'' رقیہ بیگم نے بات کاٹ کر جلدی سے بولی
شکریہ خالہ بہت ہی اچھا سوٹ ہے عالی۔
ودعیہ کی آنکھوں کی لو بجھ گئی۔ عالی بھی غصے سے
اٹھ گیا وقار صاحب بھی کتابیں لے کر ناگواری سے
چلے گئے۔
نائلہ نے اپنی کامیابی پر رشک سے شمائلہ کو دیکھا
تو وہ بھی مسکرا دی۔
''تم نے برتن نہیں سمیٹے کیا۔'' شمائلہ ودعیہ کو دیکھ
کر بولی جو خاموشی سے ایک طرف کھڑی تھی۔
وہ برتن لے کر کچن میں چلی گئی آج وہ کافی تھکی
ہوئی تھی بستر پر گرتے ہی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو
گئی۔
عالی اس کے کمرے میں رات گئے آیا مگر اسے
سوتا دیکھ کر وہ پلٹ گیا صبح بھی اسے موقع نا ملا اور وہ
لوٹ گیا۔

☆......☆......☆

ذکیہ خالہ کافی عرصے بعد آئیں تھیں دونوں
بہنیں پھر سے مل بیٹھیں۔
''ہائے آپا تم تو کہہ رہیں تھیں کہ تم اسے منحوس کو
نکلنے نہیں دو گی مگر 6 مہینے ہونے کو آئیں ہیں اور یہ
یہیں ہیں۔''
''ہاں ذکیہ منحوس کو اتنا کچھ سناتی ہوں مگر گونگی
بہری بنی سنتی رہتی ہے گھر کا سارا کام اس اکیلی سے

کراتی ہوں مگر مجال ہے جو اف تک کر جائے پتہ نہیں اللہ نے کس مٹی سے بنایا ہے اسے ہائے میری بڑی خواہش تھی کہ نائلہ میری بہو بنے مگر عالی کے ابو نے اپنی بھانجی تھوپ دی میرے لال پر وہ تاسف سے بولیں۔

''ہائے آپا تو نے میرے دل کی بات کر دی۔'' قسم لے لو آپا میری بھی یہ خواہش تھی کہ میری دونوں بیٹیاں تیرے گھر کی بہو بنیں میری نائلہ بھلا کسی سے کم ہے کیا اور وہ عالی کو بھی پسند کرتی ہے۔''

ذکیہ بیگم کی باچھیں یہاں سے وہاں تک کھل گئیں۔

''واقعی ذکیہ!' رقیہ بیگم بھی خوش ہوئیں۔

''تو اور کیا آپا بھلا عالی سے بہتر لڑکا کہاں ملے گا اور یہ بات حقیقت تھی۔

''بس آنے دو عالی کو کہوں گی میں اس کی شادی نائلہ سے کرنا چاہتی ہوں۔

''یہ تو ٹھیک ہے مگر ایک بات کہہ دیتی ہوں وہ اسے کلموہی کو طلاق دے گا تو ہی نائلہ کو بھیجوں گی ہاں۔'' وہ بولیں۔

''ارے تو فکر نہ کر عالی میری بات نہیں ٹالے گا۔'' وہ ان کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

اس دفعہ عالی آیا تو انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا عالی کا دماغ ہی گھوم گیا اس نے صاف الفاظ میں نائلہ سے شادی سے انکار کر دیا اور لوٹ گیا۔

رقیہ بیگم نے ذکیہ بیگم کے گوش گزار کیا۔ ارے ایسے کیسے ہوگا بس اب دیکھو آپا کہ عالی کیسے نہیں مانے گا۔ جب ودعیہ خود ہی اسے چھوڑ جائے گی تم فکر نہ کرو ان کا شیطانی دماغ چلنا شروع ہوا۔

اب تو ودعیہ پر زندگی اور بھی تنگ کر دی گئی آتے جاتے طعنے تشنے تو روز کا معمول بن گیا مامی کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ اسے جان سے ہی مار دیں عالی کا جب فون آتا تو مامی ودعیہ کو آس پاس بھی نہ بھٹکنے دیتیں۔

ودعیہ کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔ اس کا جیسے دماغ ہی ماؤف ہو گیا ہو۔ کبھی دل میں آتا کہ ماموں سے کہے پھر یہ سوچ کر رک جاتی کہ ماموں مامی سے کہیں گے اور سارا نزلہ اس پر ہی گرے گا۔ کھانا پینا بھی کم ہو گیا تھا بس سر جھکائے وہ خود کو گھر کے کاموں میں مصروف رکھتی تھی۔

آج پھر نائلہ بیگم تشریف فرما تھیں وہ سیڑھیوں کو صاف کر رہی تھی کہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہاں تو اور کیا عالی وہاں سے روزانہ مجھے فون کرتا ہے میں گھنٹوں اس سے باتیں کرتی ہوں۔'' وہ مالٹے کھاتے ہوئے شمائلہ کو بتا رہی تھی درحقیقت وہ ودعیہ کو سنانا چاہتی تھی۔

''اچھا کیا کہتا ہے وہ۔ یہاں پر تو بڑا گھنا بنا پھرتا ہے۔

شمائلہ نے مزے لیتے ہوئے اس سے پوچھا اور ایک نظر ودعیہ کے سست پڑے ہاتھوں پر ڈالی۔

''کہنا کیا ہے بس یہ ہی وہ مجھے سب سے زیادہ مس کرتا ہے۔ کہہ رہا تھا اب آؤں گا تو پھر گھومنے چلیں گے اور اس نے وعدہ بھی کیا ہے کہ مجھے شاپنگ کرائے گا۔'' نائلہ نے فخریہ انداز میں بتایا۔

ودعیہ جلدی سے سیڑھیوں سے اتری اور کچن میں گھس گئی۔ اس کے اندر عجیب اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا آنکھوں میں لبالب آنسو آ گئے۔

نائلہ نے شمائلہ کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔

''کیوں پھر مزا آیا۔'' شمائلہ بولی۔

زبردست مزا آیا۔'' شمائلہ بولی۔

ودعیہ نے خود کو کچن کے کام میں مصروف کرنے

کی کوشش کی مگر دل اچانک اچاٹ ہو گیا۔

''مجھے کیوں برا لگنے لگا وہ جس کو مرضی فون کریں۔'' وہ ڈسٹنگ والا کپڑا سیلف پر پھینک کر بولی۔

''کیوں برا نہ لگے شوہر ہیں میرے یا نائلہ کے مجھ سے تو کبھی بات نہیں کی اور اس سے گھنٹوں فون پر باتیں۔'' ساتھ ہی بیوی عالی از لی زبان عود آئی۔

وہ خود بھی اپنی حالت سے جنگ کر رہی تھی۔ جو پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہو رہی تھی۔ کبھی غصہ آتا کہ عالی نے اسے تو اہمیت نہیں دی اور نائلہ کو دی اور کبھی بالکل ہی لاتعلق بننے کو دل کرتا۔

نہیں میں لاتعلق نہیں رہ سکتی۔ مجھے خود اپنے حق پر ڈٹا رہنا چاہیے شوہر ہیں عالی اب میرے، اس نے فیصلہ کیا۔

☆......☆......☆

عالی نے غصے کی وجہ سے اگلی بار لاہور آنے کا فیصلہ ملتوی کر دیا اوپر سے اسے ودعیہ کی بے رخی پر غصہ تھا اس نے کتنی بار فون کیا اور ایک بار بھی ودعیہ سے بات نہیں ہوئی تھی ہر بار امی سے بات ہوتی یا پھر شمائلہ سے۔

امی کی ایک ہی ضد، نائلہ سے شادی اور ودعیہ کو طلاق اور ایسا کرنا کم از کم اب اس کے بس میں نہیں تھا۔

کیونکہ اب معاملہ دل کا تھا اور وہ دل، وہ ودعیہ سے لگا چکا تھا۔

رات کو وہ لان میں ٹہل رہا تھا اس نے موبائل نکالا اور گھر کا نمبر ملایا۔ ساتھ ہی ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی ابھی تو جاگ رہے ہوں گے اس نے خود سے کہا۔

''ہیلو السلام وعلیکم بھائی کیا حال ہے؟'' ولی کے فون اٹھاتے ہی وہ بولا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں بس گھر یاد آ رہا ہے۔ اکیلے رہ رہ کر بور ہو گیا ہوں یہاں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''امی جان رہی ہیں؟''

''ہاں تو بات کرو۔'' اور ولی نے فون ماں کو تھما دیا۔

''السلام وعیکم امی۔'' کیا حال ہے۔

''میں ٹھیک ہوں تم سناؤ اس بار آئے ہی نہیں تمہیں گھر یاد نہیں آتا کیا؟'' رقیہ بیگم ناراضگی سے بولیں۔

''آتا ہے امی بہت یاد آتا ہے مگر آپ کی ضد پوری کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔''

''میں نے کون سا تم سے خزانہ مانگ لیا ہے بس اپنی خواہش کا اظہار ہی کیا ہے۔'' وہ بدستور ناراض تھیں۔

امی آپ کی خواہش بالکل بھی جائز نہیں ہے۔ میری زندگی کا سوال ہے اور میں اپنی زندگی کسی بھی صورت نائلہ جیسی لڑکی کے ساتھ ضائع نہیں کر سکتا آپ یہ ضد چھوڑ دیں۔'' اس نے سر پکڑ لیا اپنا۔

''ہاں اس کلموہی کے ساتھ گنوا سکتے ہو جو تم سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ کتنی بار میں نے کہا بات کر لو اور اس میم صاحبہ کا مزاج ہی نہیں ملتا صاف انکار کر دیتی ہے۔ انہوں نے ذکیہ کے پلان پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔

''کیا آپ نے اس سے کہا اور اس نے انکار کر دیا؟'' عالی کو یقین ہی نہیں آیا کہ ودعیہ نے بات کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

''ہا......ں ہاں تو اور کیا۔'' جھوٹ بولتے ہوئے زبان لڑکھڑا گئی تھی۔

''اچھا......!'' عالی کی مردہ سی آواز آئی۔ ''میں بعد میں فون کروں گا اللہ حافظ۔'' اس نے لائن کاٹ

دی۔دل جو بجھ گیا تھا۔

''ارے ای ودعیہ سے بات کرادیتی آپ۔'' دلی نے ریسیور رکھتے دیکھا تو بولا۔

''کہا تھا کہ بات کرلو مگر بولا مجھے اس سے کوئی بات وات نہیں کرنی۔'' زبردستی کے رشتے مجھ سے نہیں نبھائے جاتے۔وہ ودعیہ کو دیکھ کر بولیں۔

ودعیہ کی آنکھوں میں جوت ایک دم بجھ گئی۔اور ذہن ''زبردستی کے رشتوں میں الجھ گیا'' یعنی عالی نے شادی زبردستی کی تھی۔آنکھوں کے کٹورے پھر بھرنے کو بے تاب ہوگئے۔

☆......☆......☆

آج اس کے تایا کا فون آیا تھا اسے انجانی خوشی ہوئی تھی۔

انہوں نے اسے وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔

''باجی پتہ ہے کل عالی کا فون آیا تھا کہہ رہا تھا کہ اگر خالو زبردستی نہ کرتے تو میں کبھی اس سے شادی نہ کرتا۔

نائلہ صوفے پر براجمان تھی وہ شائلہ کو بتارہی تھی جبکہ ذکیہ اور رقیہ بیگم بھی پاس ہی بیٹھیں تھیں۔

ودعیہ چائے کی ٹرے لارہی تھی جب یہ الفاظ اس کے دل پر بم بن کر گرے۔

''ہاں تو اور کیا مجھ سے بھی کہہ رہا تھا یہ ہے ہی منحوس میرے بیٹے کی خوشیاں ہڑپ کرگئی ہے۔'' رقیہ بیگم نے نفرت سے کہا۔

ودعیہ چپ کرکے ٹرے رکھ کر نکل گئی اور ٹیرس کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

''ہمیشہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے مجھے ہی خوشیاں نصیب کیوں نہیں ہوتیں زندگی میں پہلی دفعہ میں نے کسی چیز پر کسی رشتے پر اپنا حق جانا اور وہ بھی زبردستی کا لکلا اب آئیں گے عالی تو کہہ دوں گی کہ آپ اس زبردستی کے رشتے کو ختم کرکے نائلہ سے شادی کرلیں۔'' وہ چپ چاپ آنسو بہارہی تھی جب اپنے ساتھ کسی کے وجود کا احساس ہوا تو ذرا کے ذرا سر اٹھایا۔

''رو کیوں رہی ہے رانی؟'' رضوان نے دانت نکوسے۔

''توں رونہ۔'' وہ ہمدردی کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھنا چاہ رہا تھا مگر ودعیہ تھوڑے پرے سرک گئی۔

''اگر آج تو میری بیوی ہوتی ناں تو رانیوں کی طرح تجھے رکھتا خوب عیش کراتا میری رانی۔'' وہ خلائیں گھورتے ہوئے بولا۔

ودعیہ نے منہ موڑ لیا۔اچانک گیٹ کھلا اور عالی اندر داخل ہوا دونوں کو بیٹھا دیکھ کر وہ ایک دم ٹھٹھک گیا جبکہ رضوان کے تو طوطے ہی اڑ گئے۔وہ تیزی سے اٹھا اور اندر چلا گیا۔

قدموں کی چاپ پر ودعیہ نے سر اٹھا کر دیکھا اسے لگا شاید اس کا وہم ہے کہ عالی کھڑا ہے۔ آنکھوں میں پانی کی وجہ سے وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

عالی سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ ودعیہ سے ملے گا تو ٹھیک طرح سے کلاس لے گا مگر اسے دیکھ کر اس کا سارا غصہ ہوا ہوگیا وہ سرخ آنکھیں جس میں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ کر رخساروں کو نم کرگئی تھی قاتل جان لگ رہی تھیں۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو۔'' لہجہ انتہائی نرم تھا۔

اوہ......واقعی عالی ہے وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہوئی کچھ بولنے کے لیے اس نے لب کھولے ہی تھے کہ الفاظ زبردستی کا رشتہ دماغ میں گونجنے لگے وہ چپ چاپ اندر کی طرف بڑھ گی اور عالی اس کی کیفیت پر قیاس آرائی کرتا ہی رہ گیا۔

''یقیناً کچھ ایسا ہوا ہے جو نارمل نہیں ہے عالی کا

دماغ تیزی سے چلنے لگا اور اندر آ کر جب خالہ کی پوری فیملی کو دیکھا تو اپنے خیال کی تصدیق ہوتے ہوئے محسوس ہوئی۔

رقیہ بیگم نے عالی کو بڑھ کر چوم لیا ماں کی یاد نہیں آتی تجھے وہ گلہ کر رہی تھیں۔ خالہ بھی گرم جوشی سے ملی۔ ودعیہ پانی لاؤ' مامی نے حکم صادر کیا۔

ودعیہ پانی کا گلاس لائی اور آگے بڑھایا۔ عالی نے اس کے چہرے کو دیکھا تو وہ نظریں چرا گئی۔

ودعیہ کی نظر اچانک ہی نائلہ پر پڑی۔ رخسار پر مسکراہٹ اور شرم سے ایسی دوہری ہو رہی تھی کہ خود عالی بھی پریشان ہو گیا کہ اچانک اسے کیا ہوا ہے جو یوں لال ہو رہی ہے۔''

اس کا ارادہ ودعیہ سے باز پرس کرنے کا تھا جو فون پر اس سے بات کرنے سے انکاری تھی مگر وہ ہاتھ ہی نہیں آ رہی تھی ایک واضح گریز تھا جہاں وہ عالی سے ٹکراتی وہیں سے کترا کر نکل جاتی۔

وہ اس سے کسی بھی موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

پہلے تو نائلہ کا ارادہ صرف خالہ کے ہاں دورے کا تھا مگر اب چونکہ عالی کی آمد ہو گئی تھی لہٰذا اس نے رات رکنا اس کے فرض کے عین تھا۔

رات وہ اپنے کمرے میں آیا تو پیچھے امی بھی آ گئیں۔

''عالی سونے لگے ہو کیا؟'' انہوں نے دروازے سے ہی پوچھا۔

وہ جو لیٹنے لگا تھا اٹھ بیٹھا۔ ''نہیں تو آئیں ناں آپ'' وہ بیڈ پر کراؤن سے ٹک لگا کر بیٹھ گیا۔

''بیٹا تم نے میری خواہش پر کچھ سوچا ہے وہ اس کے پاس بیٹھتے ہی بولیں وہ جلد از جلد اسے منا لینا چاہتیں تھیں ایک بار وہ خود مان جاتا تو وقار صاحب کا منہ خود بخود بند ہو جاتا۔

عالی کی شکل پر واضح بیزاری عود آئی۔

''بیٹا تم اپنی زندگی کیوں برباد کر رہے ہو میری جان؟'' وہ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

''امی میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں آپ کیوں نہیں سمجھتیں۔''

وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

''کہاں خوش ہو تم دیکھو اپنا چہرہ کیسے مرجھا گیا ہے کمزور لگنے لگے ہو تم۔'' یہ خوشی کی علامت ہے یا بوجھ ڈھونے کی۔ وہ ناراض، ناراض سی گویا ہوئیں۔

عالی کے چہرے پر تبسم بکھر گیا۔ ''آپ ماں کی عینک لگا کر دیکھ رہیں ہیں ناں اس لیے ایسا لگ رہا ہے آپ کو میں بالکل ٹھیک ہوں امی بس آپ فکر مند نہ ہوں۔'' وہ انہیں اطمینان دلانے لگا۔

''بیٹا میری بات مان لے اس منحوس سے پیچھا چھڑا میرے بچے اس کے سبز قدم سے مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔'' وہ متفکر تھیں۔

''امی کون سے زمانے میں رہ رہی ہیں آپ ایسا کچھ نہیں ہوتا یہ سب تو فالتو کی بکواس ہے پچھلے 4 ماہ سے وہ میری زندگی میں شامل ہے امی۔'' وہ تنگ آ کر بولا۔

''اور ایک بات امی میں کم از کم آپ کی یہ خواہش پوری کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا میں ایک بے قصور لڑکی کی زندگی خراب نہیں کر سکتا۔ اور نائلہ اور اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔'' اس نے بحث کو ایک ہی جست میں سمیٹ ڈالا۔

رقیہ بیگم اس کا منہ چند ثانیے تکتی رہیں کہ وہی ہے جس نے ان کی کوئی بات رد نہیں کی ایک مان تھا انہیں عالی پر مگر اب وہ ضد پر اڑ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھیں کیونکہ اس وقت اس سے بحث بیکار تھی۔

مامی کے حکم کے مطابق اس نے دودھ گرم کر دیا تھا وہ نائلہ کو دیکھ رہی تھی کہ آئے اور عالی کو دے

آئے مگر وہ ندارد تھی۔
آخر وہ خود ہی اوپر کی طرف بڑھی اس کا دل تو نہیں کر رہا تھا مگر دودھ ٹھنڈا ہو جاتا اور اس کا دوبارہ گرم کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ سو چاروناچار اسے خود ہی جانا پڑا۔
امی کے جانے کے 5 منٹ بعد ہی نائلہ آ گئی۔ ابھی اسے پہلے ہی غصہ تھا اوپر سے اس کی آمد۔
''یادحشت ایک یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔'' اس نے وہی سوٹ پہنا ہوا تھا جو وہ خاص کر ودعیہ کے لیے لایا تھا۔
بال کھولے ہوئے، ریڈ کلر کی لپ اسٹک میں وہ عجیب ہونق لگ رہی تھی کم از کم عالی کو تو ایسا ہی لگا اس نے ایک نظر گھڑی پر گیارہ بجاتی سوئی اور پھر اس کی تیاری کو دیکھا۔
سستا سا پرفیوم تھا شاید اس کی بو (خوشبو کہنا غلط ہوگا) سے اس کا دماغ گھومنے لگا اوپر سے سوٹ کو دیکھ کر عالی کا پارا اوپر چڑھنے لگا۔
''کیسی لگ رہی ہوں میں؟'' وہ لہرا کر بولی جو تم سوٹ لائے تھے ناں دیکھو مجھ پر کیسا لگ رہا ہے۔
عالی نے صرف اسے گھورا تھا وہ خود ہی بے تکلفی سے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ شیشے میں ابھرتے ودعیہ کے عکس کو دیکھا تو چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ آ گئی وہ باہر دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھی دروازہ پوری طرح وا نہیں تھا اسی لیے عالی کی نظر ودعیہ پر نہیں پڑی تھی۔
''پتا ہے عالی جب تم نے فون کیا تھا ناں مجھے اتنی خوشی ہوئی تھی۔'' وہ مزے لے کر بول رہی تھی اس کی پوری کوشش تھی اسے اپنی طرف متوجہ کر سکے۔
وہ بے تکلفی سے تھوڑا اور قریب ہوئی عالی چپ کر کے اس کی حرکات وسکنات نوٹ کر رہا تھا۔ ودعیہ جو کہ اندر آنے کا ارادہ کر رہی تھی اس کے قدم خود ہی تھم گئے۔
واپس پلٹنے کا حوصلہ بھی ختم ہو چکا تھا وہ وہیں جم گئی۔
عالی کی خاموشی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ نائلہ جو کہہ رہی ہے وہ درست ہے۔
''پتہ ہے میں تمہیں کتنا مس کرتی ہوں عالی تم مجھے اتنے یاد آتے ہو کہ کیا بتاؤں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم بھی مجھے مس کرتے ہو گے ہیں ناں۔'' وہ خود تصدیق کرنے لگی۔
''پتہ ہے خالہ بھی یہ ہی چاہتیں ہیں جو ہم دونوں چاہتے ہیں۔''
وہ پرجوش لہجے میں بتا رہی تھی اور عالی صرف گھور رہا تھا۔
ودعیہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اس سے زیادہ سننے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی سو چپ چاپ پلٹ گئی۔
''مجھے پتہ ہے عالی جتنی محبت میں تم سے کرتی ہوں اتنی ہی تم مجھ سے بھی کرتے ہو۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔
''بس! اپنی بکواس بند کرو۔'' عالی کا صبر کا پیمانہ آخر کو لبریز ہوا۔
''کیا بکواس کر رہی ہو تم......؟ جو منہ میں آ رہا ہے بکے جا رہی ہو۔'' وہ بیڈ سے کھڑا ہوا۔
''پہلی بات یہ سوٹ میں تمہارے لیے نہیں بلکہ اپنی بیوی ودعیہ کے لیے لایا تھا۔ وہ دھاڑا۔
نائلہ کے حواس مشتعل ہو گئے اس نے فوراً آئینے میں جھانکا وہ وہاں نہیں تھی اسے تھوڑی تسلی ہوئی مگر عالی کے لہجے سے اسے ڈر محسوس ہونے لگا۔
''دوسری بات مجھے کوئی شوق نہیں ہے تم سے باتیں کرنے کا امی نے کہا کہ خالو کی طبیعت ٹھیک نہیں

ہے تو ان کی خیریت پتہ کرنے کے لیے میں نے فون کیا تھا اور مجھے کسی پاگل کتے نے نہیں کاٹا کہ میں تمہیں یاد کروں اور یہ بات اپنے دماغ سے نکال دو کہ میں کبھی تم سے محبت کرتا ہوں یا کروں گا ایسا ہونا ناممکن ہے سمجھیں تم۔'' وہ شعلہ برساتی آنکھوں سے اسے گھور کر بولا۔ نائلہ کو اس طرح کے ری ایکشن کی امید نہیں تھی اس کا حلق خشک ہو گیا۔

''میں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہوں بہت چاہتا ہوں اسے اور ایک بات دماغ میں بٹھالو کہ آئندہ بھول کر بھی میرے کمرے میں قدم نہ رکھنا سمجھیں تم وہ اس کے قریب آ کر دھاڑا۔ اب نکلو یہاں سے اور آئندہ دماغ میں رکھنا میری بات۔'' اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ نائلہ ایسے نکلی جیسے پیچھے آگ لگی ہو۔

اس نے نیچے پہنچ کر سانس لیا۔

''اللہ توبہ کتنے غصے والا ہے یہ تو۔ میں نے اتنے پیار سے بات کی تھی اور وہ کاٹ کھانے کو دوڑا شکر ہے کہ اس ودعیہ نے کچھ نہیں سنا ورنہ سب کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

ودعیہ کے شک پر آج یقین کی مہر لگی تھی آج اسے پکا یقین ہو چلا تھا کہ عالی نے واقعی زبردستی شادی کی ہے اب کیا کرنا ہے؟ یہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس نے آنکھوں کو رگڑ کر صاف کر ڈالا۔ یہ جومنٹ منٹ پر پانی نکل آتا ہے ناں یہ بھی مصیبت ہے۔'' وہ بار بار آنکھیں رگڑ رہی تھی مگر آنسو تھے کہ بہے جا رہے تھے۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس بات کا اسے اتنا دکھ کیوں ہے کہ یہ رشتہ محض دباؤ ہے نہ سمجھوتہ ہے اور نہ دلی ہے اسے کبھی بھی عالی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی پھر اب کیوں اسے اتنا برا لگ رہا تھا۔

عالی مسلسل اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا ایک امی کی باتیں دوسرا نائلہ کے بے باک رویہ تیسرا ودعیہ کا کترانا اس کا تو دماغ ہی شل ہو گیا تھا وہ مسلسل اپنے پوروں سے سر کو سہلا رہا تھا رگیں درد سے پھٹیں جا رہی تھیں۔

بہت ہو گیا اب یہ معاملہ ابو کے پاس ہی لے کر جانا پڑے گا۔ اب فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ اب یہ معاملہ نمٹا کر ہی واپس جاؤں گا۔ اس نے پختہ ارادہ کیا۔

صبح جو نہا کر نکلا اس کا ارادہ ناشتے کی میز پر ہی قصہ ختم کرنے کا تھا وہ تولیے سے بال رگڑ رہا تھا کہ موبائل بج اٹھا۔

فون آفس سے تھا اسے میٹنگ کے لیے بلایا گیا تھا۔ ملکی حالات کو لے کر I.G صاحب نے پھر میٹنگ بلائی تھی۔ ملک میں ہر طرف افراتفری کا عالم تھا ایک طرف قدرتی آفات کا زور تھا تو دوسری طرف دہشت گردوں نے بازار گرم کر رکھا تھا۔ آئندہ کے لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے I.G صاحب نے سب آفیسرز کو بلایا تھا میٹنگ چونکہ 11 بجے شروع ہونی تھی لہذا اسے فوراً نکلنا پڑا کیونکہ 10:30 ہو رہے تھے اس نے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور آفس کے لیے نکل پڑا۔

☆......☆......☆

رات پھر ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی اسی وجہ سے آنکھیں دکھ رہیں تھیں مگر بستر چھوڑنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا وہ اٹھ گئی۔ ابھی وہ کچن میں آئی تھی اور توا چولہے پر رکھ کر فریج سے آٹا نکال رہی تھی کہ سب کے لیے پراٹھے بنائے باہر عالی کی گاڑی کی آواز آئی اس نے کھڑکی سے جھانکا وہ گاڑی لے کر نکل رہا تھا۔ رات کی باتیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔

اب یہ سب اذیت دینے لگا تھا وہ خود بھی معاملات نمٹا لینا چاہتی تھی وہ۔ انتظار کی سولی اب تکلیف دہ بنتی جارہی تھی۔ کہیں تو کسی تو کنارے پر لگنا ہے نا اس نے سوچا اور پھر سر جھٹک کر مصروف ہوگئی۔

''عالی کو بلاؤ بیٹا۔'' وقار صاحب نے میز پر اسے نہ پایا تو ودعیہ سے کہا۔

نائلہ کا نوالہ حلق میں اٹک گیا اس نے کن اکھیوں سے شمائلہ کو دیکھا۔ اس کا حال بھی زیادہ الگ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عالی حساب کتاب سنبھالنے والوں میں سے نہیں ہے وہ کبھی بھی کچھ کر سکتا ہے۔ اور رات والے انداز سے نائلہ کو بخوبی اندازہ ہوگیا تھا۔

''وہ تو چلے گئے ہیں ماموں۔'' ودعیہ نے دھیرے سے کہا۔

''ہیں صبح ہی چلا گیا نہ آنے کا بتاتا ہے اور نہ جانے کی خبر۔''

رقیہ بیگم نے اس کے یوں چلے جانے پر خفا ہو گئیں۔

''کہاں گیا ہے وہ بیٹا تمہیں بتا کر گیا ہوگا۔ ماموں نے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں مجھے تو کچھ نہیں کہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کچن میں واپس چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ کچھ اور پوچھیں خود ہی نکل جاؤں۔

☆......☆......☆

شام کو مامی کا موڈ پھر گرم تھا۔ ذکیہ بیگم جب نائلہ کو لینے آئیں تو ذکر ہوا۔ نائلہ نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں عالی کی ناگواری کا ذکر کیا۔

''اللہ کیا کروں میں اس کا۔ میرا تو بس نہیں چلتا رات کو میں نے بھی بات کی تھی مگر وہ ہے کہ مان ہی نہیں رہا ہے ان سے بھی میں نے کچھ نہیں کہا ہے اگر عالی کے ابو کو بھنک بھی پڑ گئی ناں تو طوفان آجائے گا میں نے تو پوری کوشش کر لی ہے مگر وہ ہے کہ بس انکار پر انکار کیے جارہا ہے۔'' انہوں نے سر پکڑ لیا۔

''تم نے ٹھیک سے دباؤ ہی نہیں ڈالا ہوگا آپا ورنہ تو پہلے تو بڑی فرمانبرداری کرتا تھا وہ اب کون سا عشق سوار ہوگیا ہے۔

پہلے تو نظر بھر کر دیکھنا گوارا نہیں تھا اس کلموہی کو۔ اب چھوڑ نہیں رہا۔ برا نہ ماننا آپ مجھے تو لگتا ہے کہ کوئی جادو ٹونا کرایا ہوگا اس لڑکی نے عالی پر......''

''ہاں مجھے بھی یہ ہی لگتا ہے۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولیں۔

ودعیہ نے ابھی سیڑھیوں پر قدم رکھا ہی تھا کہ مامی نے اسے سنانا شروع کر دیا۔

''نہ جانے کیا کھلا دیا ہے میرے بچے کو کہ میری بات ہی نہیں مان رہا منحوس لڑکی، بدلحاظ، بدچلن نہ ہو تو۔'' ان کے منہ سے غصے میں انگارے نکل رہے تھے۔ ''نہ جانے تیرے ماں باپ نے کون سے گناہ کیے تھے کہ تیری جیسی سبز قدم لڑکی پیدا ہوئی۔

پہلے انہیں کھا گئی کہ پھر اپنی نانی کو بھی نہیں بخشا اب میرے بیٹے کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ جان چھوڑ دے اس کی لڑکی۔ ایسے کیا کھڑی ہے تو وہاں۔ انہوں نے سر جھکائے ودعیہ کو دیکھا۔

اس نے سر اٹھایا تو ضبط سے آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

''دیکھ ذکیہ کیسی گھنی میسنی ہے یہ کیسی بھولی شکل ہے اس کی۔ لوگوں کو رجھانے عالی ساری ادائیں ہیں اس میں اسی لیے تو نجانے کس کے ساتھ دو راتیں گزار کر منہ کالا کر کے آئی ہے۔

اس کی ماں بھی ایسی ہی گھنی میسنی تھی۔ اے بی بی یہ ادائیں ناں گھر سے باہر دکھایا کروا اپنے گھر کے مردوں کو تو بخش دو یہ ہی ادائیں دکھا کر تو نے ہتھیا لیا

ہے میرا بیٹا۔'' ان کا سانس پھولنے لگا تھا مگر غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

''جا نائلہ پانی لا تو۔'' دیکھ تیری خالہ کا سانس پھول رہا ہے۔

انہوں نے فوراً ہمدردی کی۔

''اور تو جا یہاں سے میری بہن کی بھی جان لے گی چل دفع ہو جا۔''

انہوں نے ودعیہ کو کہا۔

وہ مرے قدموں سے چلنے لگی۔

''خالہ تم پانی پیو دفعہ کرو اس منحوس کو آج نہیں تو کل عالی اسے چھوڑ دے گا بس تم فکر نہ کرو مجھے اپنی محبت پر پورا یقین ہے۔ نائلہ نے بھی اپنا مہرا چلایا۔

آخر کو اس کا حساب تو چکتا ہو گیا تھا رات کو عالی نے اس کی وجہ سے اسے بے عزت کیا تھا تو بھلا وہ کیسے پیچھے رہتی۔ حساب بے باک کرنا بھی تو ضروری تھا۔ خالہ اندر جائیں آرام کریں۔'' شمائلہ نے بھی ان کی حالت دیکھ کر کہا۔

ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو میں اب آرام کروں گی۔ وہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

''مزہ آ گیا امی اب کہیں جا کر چین ملا ہے میرے دل کو۔ بڑا بول رہا تھا نا میری بیوی ودعیہ...... اب اس کی ودعیہ آٹھ آٹھ آنسو روئے گی۔'' نائلہ اپنے ناخنوں کو گھورتے ہوئے بولی۔

''ہاں تو اور کیا بس یہ بلا جائے تو نیاز دوں گی۔'' ذکیہ بیگم نے اسے غائبانہ صلواتیں سنائیں۔

''فکر نہ کرو اماں بس تھوڑا انتظار اور پھر ہم ہی راج کریں گے اس گھر پہ شمائلہ نے ماں کے کندھے پر تسلی بھرا ہاتھ رکھا۔ تینوں ہی ہنس دیے۔

آج تو ودعیہ کو سانس لینا بھی محال لگ رہا تھا پتہ نہیں کیوں سارے اس کے پیچھے پڑے تھے آج تو ماں نے اس کے والدین کو بھی نہیں چھوڑا تھا وہ تکیے میں منہ دے کر رو رہی تھی۔

''مجھے نہیں رہنا یہاں میں چلی جاؤں گی یہاں سے بس۔''

اللہ جی کوئی راستہ نکالیں مجھے نکالیں اس جیل سے یہاں کوئی میرا اپنا نہیں ہے کوئی بھی نہیں۔'' وہ زور زور سے رونے لگی آج اس کا دل بہت بھاری ہو رہا تھا لگ رہا تھا کسی نے پہاڑ اٹھا کر رکھ دیا ہو۔ اسے اپنی سانسیں رکی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''اے اللہ میں نے ہر ظلم ہر زیادتی برداشت کی ہے مگر آج تک کبھی اپنی موت نہیں مانگی مگر آج میں اپنی موت کی دعا کر رہی ہوں مجھے موت دے دے مجھے اس زندگی سے آزاد کر دے میری روح اور جسم کا تعلق ختم کر دے میرے مالک۔''

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی موت کی دعا کرنے لگی۔ آج اس کا دل بری طرح ٹوٹا تھا اور اس کا درد وہ پورے وجود میں محسوس کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دو دنوں تک وہ روتی رہی کھانا پکا کر نکلی تو ڈور بیل بجی۔ رہنے دو میں دیکھتی ہوں شمائلہ اسے منع کر کے آگے بڑھی۔

وہ لاؤنج میں آ کر چیزیں سمیٹنے لگی وقار صاحب اپنے عزیزوں سے ملنے گئے تھے اور ولی بھی آفس میں تھے۔'' جاؤ ودعیہ تمہارے رشتے دار آئیں ہیں۔'' شمائلہ کہہ کر کچن میں چلی گئی۔

''میرے رشتے دار......؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ اور سر پر دوپٹہ درست کر کے چل پڑی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا وہ اندر داخل ہوئی۔ اندر ایک ادھیڑ عمر بزرگ سی عورت اور ان کے ساتھ ایک ضعیف سے آدمی تھے۔

السلام وعلیکم اس نے دھیرے سے سوال کیا۔

''وعلیکم السلام دھیے آ اید رآ۔'' عورت نے

اسے گلے لگایا۔ اس کے لیے چہرے شناسا سا لگ رہے تھے مگر رشتہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
مرد نے بھی سر پر ہاتھ رکھا۔ ارے لگتا ہے تو نے پہچانا نہیں میں تیرا تایا ہوں اور یہ تیری تائی۔ انہوں نے اس کی مشکل آسان کی۔''
''اوہ......'' اس کے چہرے پر تبسم بکھر گیا وہ بمشکل ایک دفعہ ہی تو ملی تھی رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔
ویسے بھی اس کا اب یہاں دل نہیں لگ رہا تھا۔ ماحول میں پچھلے کچھ دنوں سے کافی کشید گی تھی اسے لگا جیسے خدا نے اس کی سن لی ہو۔
وہ بلاتر دو مان گئی۔ میں مامی کو بتا دوں؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں ہاں بیٹا ضرور بتا۔'' عورت نے پیار سے کہا وہ اٹھ کر مامی کے کمرے میں چلی آئی۔
مامی وہ تایا، تائی آئیں ہیں اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
''تو کیا کروں؟'' خدمتیں کروں کہ بیگم صاحبہ کے رشتے دار آئیں ہیں۔'' وہ کاٹ کھانے کو تھیں ان کا اشتعال کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ اور اس کی ایک بڑی وجہ عالی کا بغیر ملے چلے جانا اور پھر رابطہ بھی نہ کرنا تھا اور قصوروار ودعیہ بھی گردانی گئی۔
''وہ...... وہ مجھے لینے آئیں ہیں میں جاؤں......؟'' اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے جسم ہولے ہولے کانپنے لگا مامی کے سخت رویے سے۔
''ہائے ہمارے ایسے نصیب کہاں۔'' انہوں نے ایک اور وار کیا۔
وہ چپ چاپ کھڑی رہی مامی کے ہاں یا ناں کا انتظار تھا۔
''تمہاری مرضی بی بی جانا ہے جاؤ اور نہیں تو تمہاری مرضی مگر کل کلاں یہ مت کہنا کہ مامی نے دھکے مار کر نکالا ہے۔'' انہوں نے اجازت بھی دی تو کانٹوں میں لپیٹ کر۔
''جی!'' وہ کہہ کر نکل گئی کمرے میں آئی اپنا ضروری سامان پیک کیا اتنے میں اسے پندرہ منٹ لگ گئے۔ وہ دونوں بیچارے اکیلے ہوں گے اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلایا۔ اس کے عزیز تھے تو انہیں کس نے پوچھنا تھا۔ وہ ان کے ساتھ گاؤں کے لیے روانہ ہوئی دل اداس تھا مگر محبتوں کی شدت حاوی رہی، تایا تائی کا رویہ ان کی شفقت نے دل پر پھایا رکھا تھا۔
گاؤں میں ان کا استقبال بس واجبی سا تھا نہ تو گرم جوشی تھی اور نا ہی بالکل ٹھنڈا رویہ بس سلام دعا ہی ہوئی جیسے اجنبیوں سے ہوتی ہے۔
گھر کافی کشادہ تھا درمیان میں بڑا صحن تھا مکان پختہ بنا تھا مگر صحن میں مٹی تھی۔ کافی پودے اور درخت تھے یہ ایک چھوٹی حویلی نما گھر تھا۔ کمرے بھی بڑے بڑے اور کشادہ تھے۔
بڑے تایا اور تائی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹا اور بیٹی شادی شدہ تھے اور بال بچوں والے تھے دوسرے تایا کے بھی تین بیٹے تھے جو شادی شدہ تھیں حالانکہ دونوں ہی اس سے چھوٹی تھیں مگر وہاں بیٹیوں کی جلدی شادی کا رواج تھا بڑی عالی کی تو خود ایک بیٹی تھی جبکہ دوسری کی ابھی شادی کو چند ماہ ہی ہوئے تھے۔
گھر کے حصے بنے تھے بڑی تائی نے اسے اپنے حصے میں ٹھہرا لیا اور کوئی اس کی خاطر مدارت کے موڈ میں نہیں تھا۔

☆......☆......☆

وقار صاحب لوٹے تو ودعیہ کو نہ پا کر انہوں نے رقیہ بیگم سے پوچھا۔
''اوہ...... وہ تو اپنے ددھیال گئی ہے اس کے تایا

تائی لینے آئے تھے ان کے ساتھ گئی ہے وہ۔"
"اور تم نے جانے دیا جبکہ میں نے منع بھی کیا تھا کہ اگر کبھی اس کے ددھیال سے کوئی لینے آیا تو اسے نہ بھیجنا۔" انہیں غصہ چڑھ گیا۔
شمائلہ نے بھی کچن سے جھانکا اور دلی بھی ابو کی آواز سن کر آ گیا۔
"لو میں بھلا منع کیوں کرتیں ہیں پھر بری بھی میں بنتی کہ کہیں جانے نہیں دیتی اسے گھر میں قید کر رکھا ہے آپ نا بندوق میرے کندھے پر رکھ کر چلایا کریں۔" وہ الٹا ان پر ناراض ہوئیں۔
"تم...... تم۔" انہوں نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں اور اٹھ گئے۔
"ہونہہ۔" رقیہ بیگم نے ہنکار بھرا۔
انہوں نے باہر آ کر عالی کو فون ملایا۔
"کیا حال ہے بیٹا تیرا......؟" انہوں نے آواز کو خوش گوار بنایا حالانکہ ودعیہ کے وہاں جانے سے انہیں کافی پریشانی ہوئی تھی وکیل صاحب نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اسے وہاں کم از کم اکیلے نہ بھیجیں۔
"ابو آپ پریشان ہیں؟" عالی نے آواز سے اندازہ لگایا۔
"نہیں بیٹا ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔" انہوں نے تحمل سے کہا۔
"اچھا یہ بتاؤ کہ تم آؤ گے کب تک؟"
"نہیں ابو کوئی بات ہے آپ مجھے بتا نہیں رہے گھر میں سب خیریت ہے ناں وہ تشویش سے بولا۔
"ہاں ہاں اللہ کا کرم ہے سب خیریت ہے بس بیٹا وہ ودعیہ ہے ناں۔
"کیا ہوا ہے اسے وہ ٹھیک تو ہے ناں ابو۔" عالی نے بے تابی سے بات کاٹ کر بولا۔
"ہاں وہ ٹھیک ہے اپنے تایا کے ساتھ چلی گئی ہے۔"
"کیا! کس سے پوچھ کر گئی ہے۔" وہ حیران ہوا۔ اور آپ نے جانے بھی دیا۔
اسے حالانکہ آپ تمام حالات سے بخوبی واقف ہیں ابو۔ وہ ناراض ہوا۔
"بیٹا میں بھی گھر پر نہیں تھا ورنہ ہرگز اسے جانے نہ دیتا مگر خیر تم کب تک آؤ گے پھر اسے اکٹھے لینے چلیں گے مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا اس طرح اس کا جانا وہاں۔" وہ پریشان تھے۔
"ہوں ٹھیک کہہ رہے ہیں آج جمعرات ہے میں ہفتے کو آؤں گا۔ انشاءاللہ وہ بولا۔
"ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا اور فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے اللہ خیر کرے گا اچھا او کے اللہ حافظ۔" انہوں نے اسے دعائیں دے کر فون رکھ دیا۔ اپنی طرف سے تو وہ کسی حد تک پرسکون ہو گئے تھے مگر ادھر عالی کا بے چینی سے برا حال تھا۔
"بھلا اسے وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی بے وقوف لڑکی ہمیشہ کچھ الٹا ہی کرتی ہے۔ خاص کر میرے معاملے میں تو اسے خاص بیر ہے۔" کچھ وہ اسے کوسنے لگا۔

☆......☆......☆

آج یہاں آئے اسے چوتھا دن تھا۔ تائی اسے کوئی کام کرنے نہیں دیتی تھیں۔ ان کی بہو اور چند ایک ملازم کام کرتے تھے۔
انہوں نے اسے خاص تاکید کی تھی کہ وہ آرام کرے اور کسی کام کو ہاتھ نہ لگائے سارا دن فارغ رہ کر وہ بور ہو گئی تھی۔ T.V دیکھنے کی اسے عادت نہ تھی اور کوئی کام کرنے کو نہیں تھا یہاں پر اسے آرام تھا مگر پھر بھی ایک عجیب بے چینی سی تھی۔ جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔
تایا کے بڑے بیٹے اصغر سے اس کا سامنا دو بار ہوا تھا۔ اور اسے دیکھ کر اسے عجیب سا ڈر محسوس ہوتا

تھا اونچا لمبا قد، سانولا رنگ، اور بڑی بڑی مونچھیں جیسے ہر وقت وہ تاؤ دیتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی بھاری بھر کم عورت تھی۔ دونوں کا رویہ بس واجبی سا تھا۔

ٹھیک سے بات نہیں کرتے تھے اس نے کوشش کی تھی بات کرنے کی مگر آگے سے اتنی سرد مہری کا مظاہرہ کیا کہ وہ چپ ہو گئی۔

اب تک وہ تایا کے دوسرے بیٹے سے نہیں ملی تھی سننے میں آیا تھا کہ وہ ڈیرے پر ہوتا ہے زیادہ تر۔

اس کا دل اندر سے گھبرانے لگا لائٹ نہیں آ رہی تھی اسی لیے وہ باہر صحن میں آ گئی۔

چھوٹی تائی باہر چارپائی پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں ان کے ساتھ ان کی منجھلی بہو بیٹھی تھی۔ بڑے سے صحن میں ان کی سب سے بڑی بہو ہاتھ سے کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ چلتی ہوئی چارپائی کے کنارے پر ٹک گئی۔

''آج کیا پکا رہی ہیں تائی امی؟'' اس نے پیار سے پوچھا۔

''آلو مٹر گوشت بنا رہی ہوں پتر۔ وہ پچکاری۔ ''دادی تھوڑے مٹر ہی دے دو۔'' ان کی 12 سالہ پوتی نے آ کر ہاتھ پھیلایا۔

''چل جا اب تیسری دفعہ آئی ہے مٹر لینے۔'' اس کی چاچی نے اسے ڈانٹ دیا۔

''ایف چاچی ابھی تو میں نے پہلی دفعہ ہی مانگے ہیں۔ وہ تو کومل لے گئی ہو گی۔ اس نے اپنی جڑواں بہن کا نام لیا۔

''چل دے بھی دے اب چھیمو کوئی گل نہیں۔'' اس کی دادی نے حمایت کی۔ وہ مٹر لے کر دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ ودعیہ یہ دیکھ کر مسکرا دی۔

ساتھ ہی گھر میں مٹی میں لتھڑے بچے شور مچاتے داخل ہوئے۔

''ہائے اللہ اتنے گندے ہو کر کتھوں آئے ہو تسی؟'' چھیدو بھی باہر نکلی۔

''وہ تائی ہم میدان میں کھیلنے گئے تھے ناں بڑا مزہ آیا۔'' بچوں میں سے ایک بولا۔

''رکو تسی سارے دے سارے ہون دسی آں توانوں میں۔ کپڑے دھوتی نسیمو ہاتھ میں کپڑے دھونے والا ڈنڈا اٹھا کر ان کی طرف بڑھی اپنی ماں کے تیور دیکھ کر وہ سب نو دو گیارہ ہو گئے۔

ودعیہ ہنسنے لگی۔ پھر وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

نسیمو نے جاتے جاتے چھیدو سے پوچھا۔

''انوں کیوں لائے ہو؟ پہلے تے کدی منہ نہیں لگایا انہوں، ہن گھار لے آئیں نے۔ گل کی اے۔''

''بھابھی مجھے تو لگتا ہے یقیناً کوئی کھچڑی پک رہی ہے اس اصغر بھا کے دماغ میں ارتی اڑتی خبر ہے کہ وہ اس کی شادی ندیم سے کرنا چاہتے ہیں۔'' چھیدو نے اپنی طرف سے بڑی رازدرانہ بات کی۔

''ہیں اے اصغر بغیر فائدے تو کوئی کم نہیں کردا ماں پیو تے بیچارے بس چپ کر کے ویکھن لئے نے۔'' چھوٹی تائی نے تاسف سے کہا۔

''ماں جی مینوں تے لگدا ہے اے اینوں اوایندی جائیداد دے چکر وچ لے آیا ہوئے گا۔'' نسیمو نے مٹر والی ٹوکری اٹھائی۔

''اللہ بھلا کرے اس بچی دا۔ بڑی چنگی کڑی لگدی اے۔'' انہوں نے دعا دی۔

☆......☆......☆

شائلہ کا گھر کا کام کر کے برا حال ہو گیا تھا اس کی اپنی حالت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اب خالہ سے بھی زیادہ کام نہیں ہوتا تھا وہ کھانا بنا رہی تھی کہ فون بج گیا۔

''ہیلو کون ہے؟'' وہ بے زاری سے بولی۔

'ارے آپا تجھے کیا ہوا ہے مجھے تو لگ رہا ہے کہ موجیں ہوں گی تیری۔'' وہ حیرانی سے بولی۔

''ارے کہاں ...... میرے نصیب میں موجیں کہاں وہ تو ہو ہی کیا گئی سارے گھر کا کام میرے سر پہ آ گیا، انہوں نے تو ہاتھ کھینچ لیے ہیں کہ جی میرے جوڑوں میں بڑا درد ہے بس بڑھیا کو آرام کرنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا ہے، ہونہہ نائلہ میری بہن تو ہی آ جا میرے پاس رہنے کے لیے۔' وہ بڑے پیار سے بولی۔

''ہائے آپا ضرور آتی اگر مجھے بخار نہ ہوتا ہاں آ رہی ہوں امی۔'' اچھا آپا رکھتی ہوں اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔

تہمینہ نے حیرانی سے فون کو دیکھا۔ خود غرض مطلبی جب کام تھا تو آپا، آپا اور اب دیکھو صاف دامن بچا لیا، آپا بخار ہے ہونہہ۔'' وہ منہ چڑا کر بولی۔

ودعیہ نہا کر نکلی اور دوپٹہ ٹھیک کیا، وہ بال سکھانے کو باہر دھوپ میں ڈالنے جا رہی تھی کہ اچانک کسی سے بری طرح ٹکرا گئی لمبا اونچا سا وہ آدمی تھا۔ دیکھ کر نہیں چل سکتے آپ؟'' وہ ناگواری سے بولی۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ اس کی شکل اصغر بھائی سے بہت ملتی جلتی تھی وہ بڑی محویت سے ودعیہ کو گھور رہا تھا۔

ایسے الجھن ہونے لگی وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

ارے دیمو میرے پتر آ گیا تو، ڈیرے ہے۔

ماں صدقے جائے۔''

تائی اس کے پیچھے سے نکل کر آئیں اور سامنے کھڑے آدمی کو چوم لیا۔

''دو دنوں بعد تو نے شکل دکھائی ہے اپنی ماں کو۔'' وہ اسے چوم رہی تھیں جبکہ اس کی نظریں ودعیہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں انہوں نے اس کی نظروں کا زاویہ دیکھا تو مسکرا کر بولیں۔

دیمو یہ تیرے چاچا کی کڑی ہے ودعیہ۔ اور ودعیہ پتر یہ میرا دوجا پتر ہے دیمو۔'' انہوں نے تعارف کرایا۔

ودعیہ اس کی مسلسل گھورتی نظروں سے کچھ ڈسٹرب ہو گئی اسی وجہ سے وہ کتراتی ہوئی نکل گئی آ جا پتر کچھ کھا لے آ جا۔'' ماں صدقے جائے ودیمو کو لے کر آگے بڑھیں۔

☆......☆......☆

ودعیہ کو لے کر وہ بہت پریشان تھا اس نے رابطہ نہیں کیا تھا اور اتفاق سے وہاں کا نمبر ان کے پاس نہیں تھا وہ ہفتے کے بجائے جمعہ کو ہی آ گیا تھا رقیہ بیگم اسے اچانک دیکھ کر نہال ہو گئیں تھیں۔

''ارے عالی بیٹا تم اتنی جلدی آ گئے آ جا میرے بیٹے۔'' انہوں نے اسے سفری بیگ کے ہمراہ دیکھا تو بولیں اور بانہیں پھیلائیں۔

''جی امی اس بار آنا پڑا مجھے۔ آپ نے ودعیہ کو کیوں جانے دیا جبکہ آپ نے نہ مجھ سے پوچھا اور نہ ابو کو بتایا۔ وہ بلا کسی تمہید کے بولا۔ ودعیہ کا نام سن کر ان کا چہرہ کرخت ہو گیا۔

''نہ جانے دیتی تو مصیبت نہ جانے دیتی تو اور بری بنتی۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

امی ابھی میں بہت تھک گیا ہوں بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''پر بیٹا کھانا۔''

''امی مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔ جبکہ وہ حیران و پریشان اسے دیکھتی رہیں ہیں اس بھلا کب سے اس کی اتنی فکر ہونے لگی۔

وقار صاحب اپنے دوست کے ہاں سے واپس آئے تو عالی بھی سو کر اٹھ گیا وہ بھی نیچے آ گیا۔

السلام وعلیکم ابو جی! وہ بشاش سا نیچے اترا۔

(اس دلچسپ ناولٹ کی اگلی قسط پڑھنا مت بھولیے گا)

گوشت پر بھی مکھیاں بیٹھی ہیں، ان کی بھی کوئی پروا نہیں کرتا۔ برسات کے موسم میں جب مکھیاں بڑھ جاتی ہیں تو سب مل کر یہاں یلغار کر دیتی ہیں۔ سرخ گوشت مکھیوں سے ڈھک جاتا ہے اور دور سے کالا نظر آتا ہے۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے دکاندار خوش ہو جاتا ہے کیونکہ......

جناب آپ سب نے شاپنگ تو کی ہوگی، مگر آج ذرا میرے ساتھ شاپنگ کو چلیے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ شاپنگ کرنا کام بھی ہے اور تفریح بھی، لیکن ہوتا یہ ہے کہ لوگ کام کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور تفریح کو کم۔ اصل میں لوگوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ تفریح کر سکیں۔ واقعی کام پہلے ہونا چاہیے اور تفریح بعد میں لیکن اگر کام کے ساتھ ساتھ ذرا تفریح بھی ہو جائے تو کیا برا ہے۔ آیئے آج ہم کام کے ساتھ ساتھ تفریح بھی کرتے ہیں، شاپنگ بھی ہو جائے گی اور لطف بھی آئے گا۔

لیجیے صاحب یہ ایک گوشت والے کی دکان ہے۔ باہر آٹھ دس رانیں لٹک رہی ہیں۔ کمر اور سینے کے حصے سامنے رکھے ہیں۔ گوشت بیچنے والا دھوتی اور بنیان پہنے، چھرا ہاتھ میں لیے بیٹھا ہے۔ کلّے میں ڈبل پتی کا پان ٹھنسا ہوا ہے۔ اندر کی جانب قیمہ نکالنے والی مشین رکھی ہے۔ وہیں ایک لڑکا بھی بیٹھا ہے۔ اس کے منہ میں پان یا پھر گٹکا ہے۔ اس لڑکے کا کام گوشت کی بوٹیاں اور قیمہ بنانا ہے۔ وہیں ایک کونے میں ایک موٹی تازی بلی بیٹھی گوشت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ یہ موٹی بلی چھیچھڑوں کو منہ تک نہیں لگاتی۔ اول تو اس کا دل چھیچھڑے کھا کھا کر بھر گیا ہے۔ دوم یہ کہ دکاندار نے پہلے ہی سے تمام چھیچھڑوں کو مشین میں ڈال کر قیمہ کی شکل دیکھ رہی ہے۔ دکان کے چبوترے کے نیچے ایک کتا بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں، جن کی اسے ذرا پروا نہیں۔

گوشت پر بھی مکھیاں بیٹھی ہیں، ان کی بھی کوئی پروا نہیں کرتا۔ برسات کے موسم میں جب مکھیاں بڑھ جاتی ہیں تو سب مل کر یہاں یلغار کر دیتی ہیں۔ سرخ گوشت مکھیوں سے ڈھک جاتا ہے اور دور سے کالا نظر آتا ہے۔ جب بھی ایسا ہوتا ہے دکاندار خوش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب قیمہ بنتا ہے تو ایک کلو پر ایک پاؤ وزن بڑھ جاتا ہے۔ گوشت کی دکان پر ایک گاہک پہلے سے کھڑا ہے۔ آیئے ہم ان کی گفتگو سنتے ہیں۔

خریدار: ''اماں شیخ صاحب! کیا شہر میں بلوہ

کرواؤ گے؟ ارے میاں ایسی خوبصورت رانیں کھلی لٹکا رکھی ہیں۔''

دکاندار (شرماتے ہوئے): ''حاجی صاحب! یہ تو گائے کی رانیں ہیں۔ ان پر بھلا کیا بلوہ ہوگا۔ ویسے بھی اب اس قسم کی باتوں کا عوام پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بلوہ کرنے کے اور بھی بامقصد بہانے ہیں۔ بے چاری گائے کی ران کی اوقات ہی کیا ہے؟''

خریدار: ''شیخ صاحب! قسم سے کہو، یہ واقعی گائے کی رانیں ہیں؟''

دکاندار: (گھبراتے ہوئے) ''حاجی صاحب! جب آپ کو معلوم ہے کہ یہ کٹے کی رانیں ہیں تو آپ خوانخواہ پوچھتے کیوں ہو؟''

خریدار: ''یار تم لوگ کبھی گائے بھی کاٹتے ہو یا گائے کے نام پر بھینس کا گوشت ہی کھلاتے ہو؟''

دکاندار: ''حاجی صاحب! بھینس ہو یا گائے کم از کم حلال تو کھلاتے ہیں، مردار تو نہیں کھلاتے؟''

خریدار: ''اور یہ جو آئے دن خبریں آتی ہیں کہ مردہ اور حرام جانور کا گوشت بیچنے کے جرم میں لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ یہ سب پھر کیا ہے؟''

دکاندار: (اپنی ہتھیلی کو آگے کی طرف پھیلا کر) ''کیا ہاتھ کی ساری انگلیاں برابر ہوتی ہیں؟''

خریدار: (پھیلی ہوئی ہتھیلی کو غور سے یوں دیکھتا ہے۔ جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ پھر فیصلہ کن انداز میں کہتا ہے) ''نہیں...... ساری انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔''

دکاندار: ''بس تو پھر اسی طرح سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ قصائی بھی مسلمان ہوتا ہے۔ چاہے نشے میں ہی کیوں نہ ہو، مردار ہرگز نہیں کاٹے گا۔ آخر حلال حرام بھی کوئی شے ہے۔''

خریدار: (حیرت سے) ''تو کیا وہ نشے کو حلال سمجھتا ہے؟''

دکاندار: ''حاجی صاحب! آپ بھی ذری ذری سی بات پکڑتے ہیں۔ یہ تو میں مثال کے طور پر کہہ رہا ہوں۔''

خریدار: ''میاں! مثال کی خوب کہی، سچ بتاؤ، تم نشہ نہیں کرتے؟''

دکاندار: (شرمندہ ہوکر) ''بس جی! عادت ہی پڑ گئی ہے۔ چھٹتی نہیں منہ سے کافر لگی ہوئی۔''

خریدار: ''کافر کو منہ لگاتے ہی کیوں ہو؟''

دکاندار: ''اب کیا کریں، ہمارے دھندے میں منافع بہت ہے۔ جب روپیہ زیادہ آتا ہے تو ذرا موج مستی کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

خریدار: ''ظاہر ہے، جب گائے کے نام پر بھینس کا گوشت بیچو گے تو نفع زیادہ ہی ہوگا۔''

دکاندار: ''حاجی صاحب! صرف بھینس کا گوشت نہیں بیچتا۔ گائے کے ساتھ میل چلا دیتا ہوں۔ دو گائے، تین چار بھینسوں کے ساتھ، بس یہی تو کرتا ہوں ورنہ شہر میں تو لوگ اونٹ کا گوشت بھی کھلا رہے ہیں۔''

خریدار: (حیرت سے تقریباً چیختے ہوئے) ''اونٹ! اماں شیخ صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اونٹ کا گوشت۔''

دکاندار: ''جی! اونٹ کا گوشت، یہ جو آپ دہلی کی مشہور نہاری، چٹخارے لے لے کر کھاتے ہیں ان میں اونٹ کا گوشت ہی تو ہوتا ہے۔ یہ جو آپ ہوٹلوں میں قیمہ فرائی کھاتے ہیں تو آپ کو پتا ہے یہ قیمہ کیسا ہوتا ہے؟ جناب یہ پھیپھڑوں اور تلی کا آمیزہ ہوتا ہے۔ آپ بڑے مزے سے قیمہ فرائی، قیمہ گوٹالہ اور قیمہ اسپیشل کھاتے ہیں، تب یہ سب چلتا ہے؟''

خریدار: (منہ بگاڑ کر) ''لاحول ولا، اماں شیخ جی! یہ تم کیا قصہ لے بیٹھے۔ قسم اللہ پاک کی، اگلے پچھلے سب کھائے پیے کی اجتماعی قے کرواؤ گے۔ میاں، خاک ڈالو اس پر، یہ بتاؤ، گائے کہاں کی اچھی ہوتی ہے۔ سندھ کی یا پنجاب کی؟''

دکاندار: (لمبی سانس بھر کر) ''سندھ کی گائے تو آج کل بالکل دبلی پتلی اور سوکھی سی آرہی ہے جب دریائے سندھ ہی سوکھ گیا ہے تو گائے کا حال اچھا کیسے ہوسکتا ہے۔ ہاں، پنجاب سے اچھا مال آرہا ہے۔ موٹی اور تندرست گائے دیکھو تو لگتا ہے ہماری فلموں کی ہیروئن ٹھمکتی چلی آرہی ہے۔ لسی پی کر ایسی بدمست ہوتی ہے کہ یکبارگی دل پر کٹاری چل جاتی ہے۔''

خریدار: (انتہائی شوق سے) ''اور سرحد کی گائے؟''

دکاندار: ''ہوتی تو بے حد حسین ہے۔ مگر وہ لوگ پردہ اس قدر کرواتے ہیں کہ سارا حسن غارت ہوجاتا ہے۔''

خریدار: ''اچھا یہ تو بتاؤ یار! سب سے اچھی گائے کہاں کی ہوتی ہے؟''

''دکاندار: ''واہ حاجی صاحب! آپ بھی فری ہوگئے۔ شیخ صاحب سے فوراً یار پر اتر آئے۔''

خریدار: ''معاف کرنا شیخ صاحب! گفتگو اس قدر دلچسپ ہورہی ہے کہ خیال ہی نہیں رہا۔ ذکر جب اس پری وش کا ہو تو ہوش کب ٹھکانے رہ سکتے ہیں۔''

دکاندار (آنکھ مارتے ہوئے) ''لگتا ہے حاجی صاحب' مزاج آپ کا بھی رنگین رہا ہے۔ جوانی میں بڑے پرپرزے نکالے ہوں گے؟''

خریدار (ٹھنڈی سانس بھر کر) ''بس رہنے دو پرانی باتوں کو۔ تم نے بتایا نہیں کہ گائے کہاں کی اچھی ہوتی ہے۔''

دکاندار: ''گائے تو آسٹریلیا کی قیامت ہوتی ہے۔''

خریدار: (حیرت سے) ''آسٹریلیا کی گائے؟''

دکاندار: ''ہاں صاحب! آسٹریلیا کی، کیا زبردست شے ہوتی ہے۔ بے حجاب اور بے باک، آپ نے کبھی بے واچ نہیں دیکھا۔''

لیجیے صاحبان، لگتا ہے یہ دونوں صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہمارا اخلاق بھی خراب ہو، بہتر ہے، یہاں سے نکل چلیں۔ آیئے آگے چلتے ہیں سبزی اور فروٹ کے ٹھیلوں پر وہاں شاپنگ کریں گے۔

ارے واہ، یہ آلو اور پیاز کا ٹھیلا ہے۔ کیا گول مٹول سے آلو ہیں، دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ بھائی ٹھیلے والے، آلو کیا حساب سے دیے؟

''کیا! ارے آلو اور اتنے مہنگے، بھائی اتنے مہنگے آلو کون کھائے گا۔ غریب لوگ عید تہوار کو چھوڑ کر آلو اور غم ہی تو کھاتے ہیں۔ اچھا، آلو اس لیے مہنگے ہیں کہ غیر ملکی ریستوران والے خرید کر لے جاتے ہیں۔ مگر وہ لوگ تو دعوے کرتے ہیں کہ ان کے آلو میکسیکو سے آتے ہیں۔ ذرا سے چپس کے پچاس ساٹھ روپے اینٹھ لیتے ہیں۔

''اچھا! پروپیگنڈہ ہے یہ سب...... دیسی آلو ہی ہوتے ہیں۔ خیر یہ بتاؤ پھر پیاز کیوں مہنگی ہے؟''

''بھائی ٹھیلے والے یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ بھلا پیاز اور خواتین میں کیا مشابہت؟

''اچھا...... اچھا...... یہ دونوں رلاتی ہیں۔ ہاں یہ تو سچ ہے۔ لیکن ایک کو کاٹو تو آنسو نکلتے ہیں۔ دوسری کاٹ کھائے تو رونا آتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ دونوں کی ذات پرت در پرت ہوتی

ہے۔ پرتیں ہٹاتے جاؤ، آخر میں کچھ نہیں نکلتا۔

چلیے صاحبان! رونا ہی ہے تو پیاز لے کر کیوں روئیں، گھر جا کر ارمان نکال لیں گے۔ یہ دیکھیے صاحب! یہ ٹھیلے والا گلا پھاڑ کر کیا چلا رہا ہے۔ 'لے لو مجنوں کی پسلیاں، لیلیٰ کی انگلیاں' ہائیں، یہ کم بخت ککڑیاں بیچ رہا ہے یا انسانی اعضاء کے اسپیئر پارٹس کی دکان کھول رکھی ہے۔ جس لیلیٰ کی انگلیاں ککڑی کی طرح ہوں گی۔ اس کے نامراد عاشق مجنوں کی پسلیاں ایسی نہ ہوں گی تو پھر کیسی ہوں گی؟ اور یہ بجائے دکانداری کرنے کے عشق و محبت کی داستانیں کیوں سنا رہا ہے۔ بھئی مال بیچنا ہے تو شوق سے بیچے۔ قوم کی اخلاقی حالت تو نہ بگاڑے۔ چلیے صاحب! ہم کوئی لیڈر تھوڑی ہیں کہ آدم خوری کریں۔

واہ! کیا ٹماٹر ہیں۔ سارے ہی گلے سڑے ہیں اور دام آسمان کو چھو رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی بھی بہت مانگ ہے۔ لوگ اسٹیج ڈرامے دیکھنے جاتے ہیں تو تھیلا بھر کر لے جاتے ہیں۔ اگر ڈرامے میں ذرجن بھر، ہیجان خیز رقص نہ ہوں تو یہی ٹماٹر فن کاروں پر برسائے جاتے ہیں۔ برساتے کیا ہیں صاحب تاک تاک کر مارتے ہیں کہ فن کاروں کے کپڑے ٹماٹروں کے جوس سے لال بھبھوکا ہو جاتے ہیں۔ بقول شاعر

بہت آرزو تھی گلی کی تیری
سویاں سے لہو میں نہا کر چلے

لیجیے صاحب! سبزی ترکاری کو رکھیے ایک طرف۔ آگے ایک دودھ کی دکان پر وہی حاجی صاحب جا رہے ہیں، جو کچھ دیر قبل گوشت والے سے کچھ ناگفتنی ناشنیدنی قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ ہم چل کر دیکھتے ہیں کہ وہ وہاں کیا گل کھلاتے ہیں۔

''حاجی صاحب! السلام وعلیکم! بھائی دودھ والے کیا حال ہیں؟ کیسے ہو؟''

دودھ والا: ''شکر ہے پاک پروردگار کا...... دودھوں نہا رہا ہوں، پوتوں پھل رہا ہوں۔ آپ سنائیں حاجی صاحب! آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کیا حال ہے؟''

حاجی صاحب: ''اپنی تو وہی ہڈی ہے، وہی کھال ہے۔''

دودھ والا: ''دودھ لینے آئے ہیں؟''

حاجی صاحب: ''ظاہر ہے بھیا، دودھ کی دکان پر بندہ دودھ لینے ہی آتا ہے، چیک کیش کروانے تو نہیں آتا۔ لیکن بھیا، سنا ہے دودھ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔''

دودھ والا: (تعجب سے) ''صاحب یہ تو بچے بچے کو پتا ہوتا ہے کہ دودھ سفید رنگ کا ہوتا ہے، بالکل سیاسی لیڈروں کے خون کی طرح، سچ بتائیں آپ نے کبھی دودھ نہیں دیکھا؟''

حاجی صاحب: ''دیکھا ہے بھئی، بہت دیکھا ہے۔ خیر سے اپنی ماں سے دودھ بھی بخشوا چکے ہیں۔ عرصہ دراز ہوا دودھ کے دانت بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ اب جو دانتوں کا پکا سیٹ ہے، اس میں سے بھی دو چار داغِ مفارقت دے چکے ہیں۔ کچھ ہل رہے ہیں۔ ہمارا ڈینٹیسٹ روز ہمیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ ہم نے تو دودھ کی نہریں تک بہتی دیکھی ہیں۔ مگر یہ پرانے وقتوں کی بات ہے، جب مہنگائی کا دیو قابو میں تھا۔ لیکن بھیا! سچ سچ بتاؤ۔ دودھ کیا واقعی سفید رنگ کا ہوتا ہے؟''

دودھ والا: ''جی ہاں، سفید ہوتا ہے۔ مگر آپ بار بار یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

حاجی صاحب: ''وہ اس لیے کہ تمہارا دودھ ذرا مٹیالا سا دکھائی دے رہا ہے۔''

دودھ والا: ''یہ تو مٹی، دھول، گرد و غبار کی وجہ

سے مٹیالا ہو رہا ہے۔ ورنہ ہے یہ سفید رنگ کا ہی۔''
حاجی صاحب: ''بھیا، تم دودھ کو ڈھک کر کیوں نہیں رکھتے۔ بلدیہ والے نوٹس نہیں لیتے۔''
دودھ والا: ''بلدیہ والوں کی بھی آپ نے خوب کہی۔ انہیں فرصت ہی کب ہے کہ وہ اس طرف دھیان دیں۔''
حاجی صاحب: ''اچھا! میاں یہ تمہارے دودھ کے اوپر کالی کالی شے کیا تیر رہی ہیں؟ کشمش ہیں شاید۔''
دودھ والا: (شرما کر) ''کشمش نہیں حاجی صاحب، یہ مکھیاں ہیں۔ بار بار نکالتا ہوں جیسے مطلب نکل جانے کے بعد لوگوں کو نکال دیا جاتا ہے۔ کم بخت پھر آ کر گر جاتی ہیں۔''
حاجی صاحب: ''جب ہی تو کہتا ہو کہ جالی سے ڈھلک کر دودھ رکھا کرو۔ کچھ صفائی ستھرائی بھی رکھنی چاہیے۔''
دودھ والا: ''سارے کام ہم ہی کریں۔ بلدیہ والے کچھ نہ کریں۔ جب شہر میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر یونہی پڑے رہیں گے تو مکھی، مچھر پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ تو سراسر کارپوریشن والوں کی لاپرواہی اور غفلت ہے۔''
حاجی صاحب: ''واہ، صاحب! بندر کی بلا طویلے کے سر!''
دودھ والا: ''یہ آپ نے بندر کس کو کہا؟''
حاجی صاحب: ''بھائی، محاورہ ہے۔ ورنہ میں تو بندروں تک کو بندر نہیں کہتا۔''
دودھ والا: ''تو پھر آپ انہیں کیا کہتے ہیں؟''
حاجی صاحب: ''انہیں میں فلمی ہیرو کہتا ہوں۔ لیکن چھوڑو اس بحث کو، یہ بتاؤ کہ یہ دودھ میں پڑی مکھیوں سے تمہیں گھن نہیں آتی؟''
دودھ والا: ''صاحب، یہ تو صرف ٹریلر ہے۔ اصل پھر تو آپ نے دیکھی ہی نہیں۔''
حاجی صاحب: ''اچھا! اصل فلم بھی ہے، وہ کیا بھلا؟''
دودھ والا: ''جب منڈی سے دودھ آتا ہے تو ہر کنستر میں یہی کوئی آدھا کلو کے قریب مکھیاں ہوتی ہیں۔ ہم کپڑے سے چھان کر، اچھی طرح نچوڑ کر مکھیاں پھینکتے ہیں۔''
حاجی صاحب: ''سنا ہے کہ مکھیوں کے علاوہ دودھ میں سے زندہ مینڈک اور مچھلیاں بھی نکل آتی ہیں۔''
دودھ والا: ''یہ اناڑی لوگوں کا کام ہے۔ بجائے نلکے کا پانی استعمال کرنے کے یہ تالاب یا جوہڑ سے ہی پانی بھر لیتے ہیں۔''
حاجی صاحب (حیرت سے) ''اچھا نلکے کا پانی ملانے سے دودھ میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔''
دودھ والا: ''جی نہیں، بلکہ دودھ میں ہلکی سی مٹھاس آ جاتی ہے۔''
حاجی صاحب: ''لیکن پچھلے دنوں دودھ میں کچھ کھارا پن تھا۔''
دکاندار: ''اصل میں نلکے کا پانی بند تھا۔ ہم لوگ بورے کا پانی چلا رہے تھے، لیکن اب کوئی مسئلہ نہیں، نلکے کا پانی آ رہا ہے۔''
اس گفتگو کے بعد حاجی صاحب تو دودھ لیے بغیر ہی چلے گئے۔ میرا خیال ہے ہمیں بھی چلنا چاہیے کہ ایسا دودھ پینے سے بہتر ہے کہ بندہ سادہ پانی پر ہی گزارہ کر لے۔ چھوڑیے صاحب! کھانے پینے کی اشیاء کو، وہ آگے ایک جوتے کی دکان نظر آ رہی ہے۔ نئے جوتے ہی لے لیتے ہیں۔
''السلام وعلیکم!''
''وعلیکم السلام، جی صاحب، کیا چاہیے؟''
''دو چائے کڑک، دودھ زیادہ پانی کم، ملائی

مار کے۔''

''جی!''

''ارے جناب! جوتے کی دکان ہے، یہاں لوگ جوتا لینے ہی آتے ہیں۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں، کیا چاہیے۔''

''اچھا.....! اچھا.....! جوتے لینے آئے ہیں۔ آئیے، بیٹھیے، بلکہ تشریف رکھیے۔ فرمائیے، کس قسم کا جوتا چاہیے؟''

''بھائی، پہننے والا جوتا چاہیے۔ کوئی نئی ورائٹی ہو تو دکھائیں۔''

''نئی ورائٹی بہت، فرمائیے کس قسم کا جوتا دکھاؤں، نوک والا یا دال والا۔''

''دال والا! بھائی یہ جوتا کیسا ہوتا ہے؟''

''صاحب، بڑا زبردست ہوتا ہے۔ مضبوط اور واٹر پروف، ذرا بھی لیک نہیں ہوتا۔ وی آئی پی آئٹم ہے۔ ہاتھوں ہاتھ بکتا ہے۔ ایڈوانس بکنگ تک چلتی ہے۔ اسمبلیوں میں اس کی خاص کھپت ہے۔ اس میں دال بٹتی ہے۔''

''اور یہ نوک والا جوتا کیا ہوتا ہے؟''

اس کی نوک بے حد باریک ہوتی ہے۔ چبھتی بھی بہت ہے۔ ٹی وی اور فلموں کی اداکارائیں بطورِ خاص خریدتی ہیں۔''

''وہ کیوں بھلا؟''

''تاکہ ایک دوسری کو اپنی جوتی کی نوک پر بٹھا سکیں۔''

''ارے نہیں میاں، رہنے دو۔ ہم نہ فلم اسٹار ہیں نہ ٹی وی اسٹار۔ کوئی اور ورائٹی ہو تو دکھاؤ۔''

''تو پھر آپ چلنے والا جوتا لے لیں۔''

''میاں! جوتے پہن کر ہی تو چلتے ہیں۔ گنوار تھوڑی ہیں کہ ننگے پیروں چلیں۔''

''میرا مطلب یہ نہیں، میں چلنے والے جوتے کی بات کر رہا ہوں۔''

''واہ میاں سائنس کی کیا بات ہے۔ کرشاتی انگوٹھی پہن کر سنگدل محبوب کو قدموں میں گرا سکتے ہیں۔ تو چلنے والے جوتے بھی ایجاد ہو سکتے ہیں۔ جوتے پہنے، خود کھڑے رہے، جوتے خود بخود چل کر منزل تک پہنچا دیں گے۔'' واہ صاحب! کمال ہے۔''

''ناں صاحب! آپ اب بھی غلط سمجھے۔ یہ ایسے نہیں چلتے، جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ جوتا جلسے، جلوسوں میں چلتا ہے۔ شادی بیاہ کے مواقع پر چلتا ہے۔ اسمبلی ہالوں میں چلتا ہے۔ اسٹیج ڈراموں میں چلتا ہے۔''

''نہیں بھئی ایسا جوتا نہیں چاہیے۔''

''پھر آپ ری سیل والا جوتا لے لیں۔''

''ری سیل والا جوتا؟ یہ کیا ہوتا ہے۔''

''آپ کبھی نماز پڑھنے مسجد جاتے ہیں؟''

''ہاں بھئی، مسلمان ہوں۔ جمعہ اور عید کو چلا جاتا ہوں۔''

''جوتا پہن کر جاتے ہیں یا ننگے پیر؟''

''جوتے پہن کر جاتا ہوں۔ بھئی، یہ آپ کیسے سوال پوچھ رہے ہیں؟''

''کبھی ایسا ہوا کہ جو گئے تو جوتے پہن کر اور واپس آئے ننگے پیر......''

''ہاں......ایک دو بار ایسا ہوا تو ہے۔''

''بس وہی جوتے ری سیل میں برائے فروخت ہیں؟''

''اچھا بھائی، میں تو چلا۔''

''نہیں میاں، رہنے دیں۔ میں خود مسجد چلا جاتا ہوں۔''

''لیجیے صاحب! شاپنگ ختم، پیسہ ہضم......''

☆☆......☆☆

مار کے۔''

''جی!''

''ارے جناب! جوتے کی دکان ہے، یہاں لوگ جوتا لینے ہی آتے ہیں۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں، کیا چاہیے۔''

''اچھا......! اچھا......! جوتے لینے آئے ہیں۔ آیئے، بیٹھیے، بلکہ تشریف رکھیے۔ فرمایئے، کس قسم کا جوتا چاہیے؟''

''بھائی، پہننے والا جوتا چاہیے۔ کوئی نئی ورائٹی ہوتو دکھائیں۔''

''نئی ورائٹی بہت، فرمایئے کس قسم کا جوتا دکھاؤں، نوک والا یا دال والا۔''

''دال والا! بھائی یہ جوتا کیسا ہوتا ہے؟''

''صاحب، بڑا زبردست ہوتا ہے۔ مضبوط اور واٹر پروف، ذرا بھی لیک نہیں ہوتا۔ وی آئی پی آئٹم ہے۔ ہاتھوں ہاتھ بکتا ہے۔ ایڈوانس بکنگ تک چلتی ہے۔ اسمبلیوں میں اس کی خاص کھپت ہے۔ اس میں دال بٹتی ہے۔''

''اور یہ نوک والا جوتا کیا ہوتا ہے؟''

اس کی نوک بے حد باریک ہوتی ہے۔ چبھتی بھی بہت ہے۔ ٹی وی اور فلموں کی اداکارائیں بطورِ خاص خریدتی ہیں۔''

''وہ کیوں بھلا؟''

''تاکہ ایک دوسری کو اپنی جوتی کی نوک پر بٹھاسکیں۔''

''ارے نہیں میاں، رہنے دو۔ ہم نہ فلم اسٹار ہیں نہ ٹی وی اسٹار۔ کوئی اور ورائٹی ہوتو دکھاؤ۔''

''تو پھر آپ چلنے والا جوتا لے لیں۔''

''میاں! جوتے پہن کر ہی تو چلتے ہیں۔ گنوار تھوڑی ہیں کہ ننگے پیروں چلیں۔''

''میرا مطلب یہ نہیں، میں چلنے والے جوتے کی بات کررہا ہوں۔''

''واہ میاں سائنس کی کیا بات ہے۔ کرشماتی انگوٹھی پہن کر سنگدل محبوب کو قدموں میں گرا سکتے ہیں۔ تو چلنے والے جوتے بھی ایجاد ہوسکتے ہیں۔ جوتے پہنے، خود کھڑے رہے، جوتے خود بخود چل کر منزل تک پہنچادیں گے۔'' واہ صاحب! کمال ہے۔''

''ناں صاحب! آپ اب بھی غلط سمجھے۔ یہ ایسے نہیں چلتے، جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ یہ جوتا جلسے، جلوسوں میں چلتا ہے۔ شادی بیاہ کے مواقع پر چلتا ہے۔ اسمبلی ہالوں میں چلتا ہے۔ اسٹیج ڈراموں میں چلتا ہے۔''

''نہیں بھئی ایسا جوتا نہیں چاہیے۔''

''پھر آپ ری سیل والا جوتا لے لیں۔''

''ری سیل والا جوتا؟ یہ کیا ہوتا ہے۔''

''آپ کبھی نماز پڑھنے مسجد جاتے ہیں؟''

''ہاں بھئی، مسلمان ہوں۔ جمعہ اور عید کو چلا جاتا ہوں۔''

''جوتا پہن کر جاتے ہیں یا ننگے پیر؟''

''جوتے پہن کر جاتا ہوں۔ بھئی، یہ آپ کیسے سوال پوچھ رہے ہیں؟''

''کبھی ایسا ہوا کہ جو گئے تو جوتے پہن کر اور واپس آئے ننگے پیر......''

''ہاں...... ایک دو بار ایسا ہوا تو ہے۔''

''بس وہی جوتے ری سیل میں برائے فروخت ہیں؟''

''اچھا بھائی، میں تو چلا۔''

''نہیں میاں، رہنے دیں۔ میں خود مسجد چلا جاتا ہوں۔''

''لیجیے صاحب! شاپنگ ختم، پیسہ ہضم......''

☆☆......☆☆

اسماء اعوان

''وہی تو میرا اللہ ہے''

جسے میں نے حالت مرض میں پکارا تو شفا دے دی۔
بھوک میں پکارا تو غذا دے دی
پیاس میں پکارا تو پانی پلا دیا
ذلت میں پکارا تو عزت دی
راہ میں بھٹک گیا تو راستہ دکھایا
غربت میں پکارا تو غنی کر دیا
اے اللہ تو معاف کرنے والا اور معافی کو پسند کرنے والا ہے ہم سب کو معاف فرما اور بخش دے (آمین)
فردوس۔ اسلام آباد

رسول اللہؐ نے فرمایا

جب اندھیرا چھانے لگے یا رات تاریک ہونے لگے تو اپنے بچوں کو باہر جانے سے روک دو کیونکہ اُس وقت شیاطین پھیل جاتے ہیں۔ جب عشاء کی پہلی ساعت گزر جائے تو انہیں چھوڑ دو اور اللہ کا نام لے کر گھر کا دروازہ بند کر دو اور اللہ کا نام لے کر چراغ بجھا دو اور اللہ کا نام لے کر برتنوں کو ڈھانپ دو۔

افشاں۔ U.K

آنکھ

آنکھ جب لڑتی ہے تو دنیا کی ہر چیز بھلا دیتی ہے۔
آنکھ جب پھرتی ہے تو تمام رشتے ناطے توڑ دیتی ہے۔
آنکھ جب دیکھتی ہے تو سمندر کی گہرائیوں سے موتی نکال لیتی ہے۔
آنکھ جب روتی ہے تو عرش الٰہی کو ہلا دیتی ہے
اور آنکھ جب بند ہوتی ہے تو دنیا کو رُلا دیتی ہے۔
نائلہ۔ کراچی

نشان سجدہ

نشان سجدہ سجا کر بہت غرور نہ کر
وہ نیتوں سے نتیجے نکال لیتا ہے

......*......*......

زندگی کیا ہے

زندگی فقط سفر ہے اس اذان سے لے کر جس کی نماز نہیں ہوتی، اس نماز تک جس کی اذان نہیں ہوتی۔

......*......*......

حساب کیسا

ہے میرا مقصد تیری عبادت
عذاب کیسا ثواب کیسا
گنوں میں کیوں تسبیح کے دانے
یہ محبتوں میں حساب کیسا

ظل ہما۔ لاہور

سچائیاں

اگر کوئی شخص چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کرے اس کا مطلب ہے کہ وہ محبت کا بھوکا ہے۔
اگر کوئی شخص بلاوجہ بہت ہنسے اس کا مطلب ہے کہ وہ تنہا ہے۔
اگر کوئی شخص بہت زیادہ کھانا کھائے تو وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔
اگر کوئی شخص چھوٹی چھوٹی باتوں پر روئے تو وہ بہت معصوم اور خوف زدہ ہے۔
اگر کوئی شخص آنسوؤں کے معاملے میں قلاش ہے تو درحقیقت وہ بہت کمزور ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص بہت زیادہ سوتا ہو تو وہ درحقیقت غمزدہ ہوتا ہے۔

سلمیٰ۔ بحرین

نفرتوں کا اثر دیکھو

جانوروں کا بٹوارہ ہوگیا
گائے ہندو ہوگئی
بکرا مسلمان ہوگیا
سوکھے میوے بھی یہ دیکھ کر حیران ہوگئے
نا جانے کب کھجور مسلمان
اور ناریل ہندو ہوگیا

جس طرح سے مذہب کے نام پر ہم رنگوں کو بانٹ رہے ہیں کہ ہرا مسلم اور لال ہندو رنگ ہے تو وہ دن دور نہیں جب ساری ہری سبزیاں مسلمانوں کی ہو جائیں گی اور ہندوؤں کے حصے میں ٹماٹر اور گاجریں ہی آئیں گی اب یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ تربوز کہاں جائے گا۔

سیمار ضا روا۔ کراچی

بلی

ایک پٹھان اپنے گھر کی بلی سے تنگ آ کر اُسے کہیں چھوڑ آیا۔ گھر آیا تو بلی اس سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ وہ بلی کو پھر کہیں بہت دور چھوڑ آیا اور فون کر کے بیوی سے پوچھا ''بلی پہنچ گئی یا نہیں۔'' بیوی نے کہا۔

''پہنچ گئی ہے۔''

پٹھان بولا: ''اس کمینی سے کہو مجھے آ کر لے جائے میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔''

غزالہ رشید۔ کراچی

مدد

جب ہم کسی ضرورت مند کی مدد کرتے ہیں تب ہم اس کے لیے دنیا میں آسانیاں پیدا کرتے ہیں اور وہ ہمارے لیے آخرت میں آسانیاں پیدا کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا دل کھول کر ضرورت مندوں کی امداد کریں۔

تبسم۔ پنڈی

زندگی پھر سے ایک بار

جب بچپن تھا تو جوانی ایک خواب تھا۔ جب جوان ہوئے تو بچپن اک زمانہ تھا جب دیس میں تھے تو پردیس اچھا لگتا تھا اور اب پردیس میں گھر جانا اچھا لگتا ہے۔ کبھی ہوٹل میں جا کر کھانا اچھا لگتا تھا مگر اب ماں کے ہاتھ کا کھانا سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ کبھی اسکول میں جن کے ساتھ لڑتے تھے آج اُن کو ہی فیس بک پر تلاش کرتے ہیں۔ خوشی اس میں ہے آج پتہ چلا بچپن کیا ہے آج احساس ہوا۔ کاش بدل سکتے زندگی کے وہ سال کاش جی سکتے زندگی پھر سے ایک بار......

ریحانہ مجاہد۔ کراچی

پانی

ہمارا جسم پانی کا مرکب ہے۔ مگر جب جسم کو چوٹ لگتی ہے تو خون کی شکل میں نکلتا ہے اور وہ دل

جو سارے جسم کو خون پہنچاتا ہے چوٹ لگنے پر آنسوؤں کی صورت میں پانی باہر نکال دیتا ہے۔ شان ہے اللہ کی۔

طاہر خان۔ پشاور

سوئے طیبہ

یہ قافلہ جو سوئے طیبہ جارہا ہے
میرا دل بھی اپنے ساتھ لیے جارہا ہے
دیکھ رہا ہوں اشک بھری آنکھوں سے
شاید کوئی میرا بھی بلاوا لارہا ہے

راز عدن۔ بحرین

عورت

مرد عورت کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ عورت ہی اسے پروان چڑھاتی ہے عورت سے ہی محبت کرتا ہے اور عورت سے ہی شادی کرتا ہے۔ مگر میں حیران ہوکر پھر بھی عورت کی عزت نہیں کرتا۔

ذرینہ۔ لاہور

16 بچے

پٹھان اپنے 16 بچوں کے ساتھ اپنے دوست کے گھر کھانے پر گیا۔
دوست نے اتنا بڑا خاندان دیکھ کر کہا۔
''خان صاحب حیا نہیں آئی۔''
پٹھان بولا: ''نہیں...... اُس کا بیپر ہے۔''

......*......*......

پیرا سائٹ

سائنسی زبان میں پیرا سائٹ اس جاندار کو کہتے ہیں جو آپ کا خون بھی چوسے اور آپ کے پاس بھی رہے۔ پاکستان میں ایسے جاندار کو ''بیوی'' کہتے ہیں۔

رضوان اللہ۔ سیالکوٹ

لڑکے

بھائی بہن: ''سے کیوں رو رہی ہو؟''
بہن: ''میرے مارکس بہت کم آئے ہیں۔''
بھائی: ''کتنے آئے ہیں؟''
بہن: ''89%''
بھائی: ''خدا کا خوف کرو اتنے میں تو دو لڑکے پاس ہوجاتے ہیں۔''

تابش حسن۔ چکوال

خوبصورت شعر

جن کی آنکھیں آنسوؤں سے نم نہیں
کیا سمجھتے ہو اسے کوئی غم نہیں
تم تڑپ کر رو دیے تو کیا ہوا
غم چھپا کر ہنسنے والے بھی کم نہیں

فریدہ۔ شیخوپورہ

لطیفہ

شوہر بیوی سے: ''میری امی آرہی ہیں کچھ بنالو۔''
''بیوی نے منہ بنالیا۔''
کچھ دن بعد بیوی کی امی بھی آگئیں۔
بیوی شوہر سے: ''پلیز امی کے لیے کچھ باہر سے لے آئیں۔''
''شوہر باہر جاکر رکشہ لے آیا۔''

عمرانہ۔ حیدرآباد

غرور کس بات کا

''کسی نے برف سے پوچھا تم ہر وقت اتنی ٹھنڈی کیسے رہ لیتی ہو؟''
برف نے جواب دیا: ''میرا ماضی بھی پانی اور مستقبل بھی، تو گرمی کس بات کی۔ اس طرح انسان کا ماضی بھی مٹی اور مستقبل بھی مٹی پھر غرور کس بات کا۔

فرزانہ۔ حیدرآباد

بہترین معافی

بہترین معافی وہ ہے جو اس یقین سے مانگی جائے کہ غلطی کو دوبارہ نہیں دہرایا جائے گا۔

فزا۔ کراچی

اک پل

تجھے بھولنے کو اک پل چاہیے
وہ پل کہ جسے موت کہتے ہیں لوگ
اب تو شاید ہی مجھ سے محبت کرے کوئی
میری آنکھوں میں تم صاف نظر آتے ہو

نغمہ۔ لاہور

کامیابی کی کنجی

چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اگر دل و دماغ اور روح کی گہرائی سے کی جائیں تو کوئی شک نہیں کہ بڑی بڑی کامیابیاں نصیب ہوتی ہیں۔

آمنہ۔ ڈہرکی

چاند

کتنی دیر تک
املتاس کے پیڑ کے نیچے
بیٹھ کے ہم نے باتیں کیں
کچھ یاد نہیں
بس اتنا اندازہ ہے
چاند ہماری پشت سے ہو کر
آنکھوں تک آ پہنچا

روزینہ۔ ملتان

اس ماہ کی خوبصورت بات

بڑے بڑے لوگوں کی بڑی بڑی خدمت کرنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ضرورت پوری کر دیا کریں اُن کی زبان سے نکلی ہوئی دعا سے آپ کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

......*......*......

شعر

بغیر مطلب کے دلاسے بھی نہیں ملتے
یہاں لوگ دل میں بھی دماغ لیے پھرتے ہیں

......*......*......

انسان

اے نادان انسان! ساری دنیا کے لوگ تجھے اپنے فائدے کے لیے چاہتے ہیں۔ ایک اللہ ہی ہے جو تجھے تیرے فائدے کے لیے چاہتا ہے۔

......*......*......

درود پاک لکھنے کی فضیلت

فرمان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ”جو شخص کتاب میں مجھ پر درود پاک لکھے تو جب تک اس کتاب میں میرا نام رہے گا فرشتے اس شخص کے لیے مسلسل بخشش مانگتے رہیں گے۔“

(المعجم الاوسط، الحدیث 1835 ج 7 ص 90)

......*......*......

محبت

محبت سے غم اور اُداسی ضرور پیدا ہوگی، وہ محبت ہی نہیں جو اُداس نہ کرے۔

(اشفاق احمد 'بابا صاحب' صفحہ 439)

......*......*......

تلخ حقیقت

مرد اگر ہاتھ چھڑا کر جانا چاہے تو ہاتھ بڑھا کر روک لو، ہوسکتا ہے وہ رُک جائے۔
لیکن اگر عورت ہاتھ چھڑا کر جانا چاہے تو کبھی مت روکنا کیونکہ وہ ہاتھ چھڑانے سے پہلے جا چکی ہوتی ہے۔

ریما نور رضوان۔ کراچی

☆☆......☆☆

نئے لہجے نئی آوازیں

نیند بھاگ جائے

میرے گھر کی چھت پر
امیدوں کی طرح
ایک ٹوٹی سیڑھی پڑی ہے
ساتھ کچھ رنگوں کے ڈبے
نشان سوکھے لیے پڑے ہیں خالی
کہ جیسے جذبات سے عاری آنکھیں
کسی کے چہرے پہ
اداسیوں کے رنگ چھوڑ جائیں
ایک بالٹی زنگ لگی سی
اولین محبت کے روٹھ جانے
کا زخم کھائے ہوئے دل کے جیسی
پڑی ہے چھت پر
زرد پتے ودھول، مٹی
کاغذ کے پرزے مڑے تڑے سے
ہوا کے جھونکوں سے لڑتے لڑتے
شور کرتے اِدھر اُدھر
بھاگتے ہیں پھرتے
کہ جیسے سوچ میں
خوابوں کے ٹوٹے ریزے
لا حاصل خواہشوں کے خشک پتے
یاد کی جب ہوا چلے تو
کبھی شور اس قدر مچائیں
کہ آنکھیں سو نہ پائیں
اور نیند بھی اُن کے سنگ
کہیں بھاگ جائے!

شاعرہ: خولہ عرفان۔ کراچی

ہم تم

اک ندی کنارے ہم تم بیٹھے ہوں
اور شام کے پنچھے اُس وقت گھرے ہوں
تم میری آنکھوں میں یوں دیکھو
جیسے اِن میں کچھ کھوج کے بیٹھے ہو
پھر میرا ہاتھ پیار سے تھام کے
چہرے کو چھو کے یہ بولے ہو
کیا میرا ساتھ تم کو ہے منظور
تم اِک آس سے میری طرف دیکھے ہو
میں تمہارے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھے
اُسی آس سے تمہاری طرف دیکھ کے بولی ہوں
سنو جاناں مجھے ہے منظور تمہارا ساتھ
یہ سُن کے تمہاری آنکھوں میں بہت سے دیپ جلے ہوں
ہم ساری زندگی سنگ رہنے کی باتیں کریں
اور پیار کے پنچھی ہمیں دیکھ کے ہنسے ہوں
اِک ندی کنارے ہم تم بیٹھے ہوں
اور شام کے پنچھے اُس وقت گھرے ہوں

شاعرہ: ماریہ یاسر۔ کراچی

عشق کا صدمہ

بچپن کی تصویر کو پا کر روئی ہوں
نینوں سے میں نیر بہا کر روئی ہوں
میرے عشق کا صدمہ کتنا گہرا تھا
ہر اک کو میں حال سنا کر روئی ہوں
کتنا ظلم کیا ہے مجھ پر حاکم نے
عدل کی زنجیر ہلا کر روئی ہوں
صحراؤں میں سسّی بن کر آئی تھی

پتوں کے کچھ خواب سجا کر روئی ہوں
کل پھر اُس نے لوٹ کر گھر کو آنا تھا
کمرے میں کچھ پھول سجا کر روئی ہوں
لوٹ کر آنے کا تو اک بہانہ تھا
گھر کا ہر دیپ بجھا کر روئی ہوں
شاعرہ: فریدہ فری۔ لاہور

غزل

میری زندگی وہی شام تھی
محبتوں کے جو نام تھی
تیرے بن اے میرے ہمقدم
میری زندگی ناکام تھی
تیری خوشبوؤں سے پتا چلا
وہ نہ مشک عنبر عام تھی
جو تیرے لبوں سے سنی غزل
وہ محبتوں کا کلام تھی
نشہ کیوں نہ ہو مجھے عاشی
نظر اُس کی مہ کا جام تھی
شاعرہ: عائشہ شفقت۔ کراچی

غزل

آج مدہوش ہونے کو جی چاہتا ہے
تیری آنکھوں سے پینے کو جی چاہتا ہے
تیری خوشبو سے مہکوں جی چاہتا ہے
تیری مسکراہٹ چراؤں جی چاہتا ہے
تیری راہوں میں پلکیں بچھاؤں جی چاہتا ہے
تیرے عشق میں یوں کھو جاؤں جی چاہتا ہے
تجھے اپنے سامنے دیکھوں جی چاہتا ہے
تجھے چھو کر محسوس کروں جی چاہتا ہے
شاعرہ: رازِ عدن۔ بحرین

اب یہ تم پہ ہے...

جاؤ میری دنیا سے دور چلے جاؤ تم
بہت رُلایا ہے اب اور نہ رلاؤ تم
تمہیں دیکھنے کی خواہش بھی دم توڑ چکی
اب تو چاہتے ہیں کہ نظر بھی نہ آؤ تم
ہر دفعہ ہم ہی کیوں تمہیں بلاتے رہیں
اب یہ تم پہ ہے کہ آؤ یا نہ آؤ تم
شاعرہ: شمسہ قمر۔ کراچی

میں اور میرا ساجن

کل شب جب سب تارے فلک پہ نکلے تھے
میں بھی اک جگنو کی صورت تجھ کو ڈھونڈنے نکلی تھی
سیاہ چُنری پہ، تری یاد کے موتی چمک رہے تھے
ہر سُو تیری یاد کے پھول مہک رہے تھے
چلتے چلتے میں بھی ساحل تک پہنچی تھی
اک سیپی جب میرے پیر تلے آئی تھی
ایسا لگا جیسے تیری یاد نے دی دہائی تھی
میں نے بڑھ کر سیپی کو جب تھاما تھا
سیپی میں سے اک آواز سی آئی تھی
کیوں تم یاد میں میری پاگل ہو بیٹھی ہو
بس جب یاد میری آئے تو
اپنے دل پہ ہاتھ ذرا سا رکھ لینا تم
میں نے اپنے دل پہ ہاتھ اک دم سے رکھا تھا
ایسا لگا جیسے تُو میرے ساتھ یہیں ہے
میری تلاش کا اُسی سے بس انت ہوا تھا
میری سیاہ چُنری پہ تیری یاد کے پھول جھوم اٹھے تھے
اُس دن سے تُو یاد مجھے نا آیا ہے
کیونکہ...... ساجن تُو تو ہر پل میرے دل میں سمایا ہے
اب مرے من میں موسم بہاراں چھایا ہے
شاعرہ: شازلی سعید مغل۔ کراچی

مینی اسکرین

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

ناظرین نے ARY ڈیجیٹل نیٹ ورک کے پروگراموں کو ہمیشہ قدر کی نظر سے دیکھا جس کے ہم مشکور ہیں۔ ہماری کوششیں ہوتی ہیں کہ آپ کو اچھے ڈرامے اور پروگرام تخلیق کر کے دیں۔ ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ آپ ہمارے تیار کردہ پروگراموں کو بہت شوق و ذوق سے دیکھتے ہیں اور ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ دنیا کی اُلجھنوں سے دور بہت دور رہنے کے لیے ذہن کو اچھے پروگراموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کی چاہتوں کے ناطے ہمارے بشتر پروگراموں کو بین الاقوامی سطح پر شہرت ملی۔ اُس کی واحد وجہ یہ ہے کہ اس چینل کو ہر عمر کے لوگ دیکھتے ہیں۔ جب نوجوان چاہتے ہیں تو وہ دی میوزک کے پروگراموں سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ جو انگریزی پر عبور رکھتے ہیں وہ H.B.O چینل کی توسط سے اچھی اور معیاری انگریزی فلموں سے انجوائے کرتے ہیں۔ خواتین ڈراموں، سٹ کام، سوپ اور دیگر پروگراموں کی منتظر رہتی ہیں۔ اسلامی روایات سے جڑے لوگ باقاعدگی سے کیو ٹی وی دیکھتے ہیں۔ بچوں کے لیے NICK سے خوبصورت کارٹون آن ایئر کئے جاتے ہیں۔ سیاسی مزاج رکھنے والے رات کو نشر ہونے والے اینکرز کے پروگرام دیکھتے ہیں جبکہ ہماری ARY ویب کو دیکھنے والوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی تعداد روزانہ کی بنیاد پر 4 سے 5 لاکھ افراد پر مبنی ہے کیونکہ ہماری ویب پر زندگی کے شعبے سے وابستہ ہر میدان کی خبریں قارئین کے دلوں کی پہچان بن گئی ہیں۔ آیئے ناظرین اب چلتے ہیں ARY کے پروگراموں کی طرف جو آپ کی چاہتوں کے منتظر ہیں۔ ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جانے والی سیریل ''دل لگی'' یہ کہانی ایک ایسے شخص کی ہے جس کے نام سے دنیا ڈرتی ہے پلاٹوں پر سے قبضہ چھڑانا ایک ایسے نوجوان کو یہ کام پیسے دے کر کراتے ہیں جو اپنے جاہ وجلال کے بارے میں مشہور ہے اور ایک لڑکی انمول جو غصے کی اتنی تیز ہے کہ بیان سے باہر، ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی ایک بیوہ ماں اور ایک چھوٹی بہن کے ہمراہ رہتی ہے۔ اس کے چچا اس کے مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور یہ کام وہ موحد سے کرانا چاہتے ہیں اور موحد سچائی سے بے خبر ہے اُن سامان اٹھوا کر باہر پھنکوا دیتا ہے اور تب اس کا سامنا ہوتا ہے انمول سے، کیا انمول جو غصے کی بہت تیز ہے اور کسی سے نہیں ڈرتی وہ موحد جیسے بدمعاش سے نمٹنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اس کا جواب ہر ہفتہ کی رات 8 بجے ڈیجیٹل سے دکھائی جانے والی سیریل ''دل لگی'' دیکھنے کے بعد ہی ملے

گا۔ اسے تحریر کیا ہے فائزہ افتخار نے جبکہ ہدایت ندیم بیگ کی ہیں۔ فنکاروں میں ہمایوں سعید، صبا حمید، مہوش حیات، عظمیٰ احسن اور مریم انصاری شامل ہیں۔ ARY زندگی سے سیریل ''دل ہاری'' مقدس ایک اکلوتی لڑکی ہے مگر اس کا اکلوتا ہونا اس کے لیے کسی سزا سے کم نہیں کیونکہ اس کے ساتھ پیدا ہونے والا بھائی مر گیا اس کے چند دن بعد اس کے والد کریم کا گودام جل گیا اور وہیں سے کریم کی غربت کا دور شروع ہوا کریم کا کہنا ہے کہ بیٹیاں صرف اور صرف شرمندگی کا باعث بنتی ہیں۔ چاہے وہ عزت سے بیاہ بھی دی جائیں۔ پھر بھی ان کی وجہ سے انسان کا سر

اشرف، اریج فاطمہ، کامران جیلانی، سیمی پاشا اور ایاز سمو قابل ذکر ہیں۔ اسے تحریر کیا ہے شہزاد جاوید نے ہدایت عبداللہ بدینی کی ہیں۔ یہ سیریل ARY زندگی سے ہر پیر کی رات 8 بجے دکھائی جائے گی۔ ہدایت کار عاصم علی اور تحریر کردہ سمیا شیخ کی سیریل ''بابا کی رانی'' انشال کے گرد گھومتی ہے۔ دو بڑے بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے اس گھر میں دو بھابیاں بھی ہیں اور دونوں بیٹے باپ سے بہت ڈرتے ہیں اس کی وجہ ان کے باپ فیروز صدیقی جو ایک بارعب شخصیت کے مالک ہیں۔ انشال MSC کرنا چاہتی ہے حمزہ خود پسند نوجوان ہے اور انشال کا کزن

ARY زندگی کی سیریل ''انتقام'' میں اعجاز اسلم، اریج فاطمہ اور فرقان قریشی

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جھکا دیتا ہے۔ مقدس کو صرف اس کی ماں کی چاہت ملتی ہے۔ مقدس کا بھائی جبران بھی مقدس سے دور رہتا ہے ادھر مقدس احسن سے پیار کرتی ہے۔ دونوں یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتے ہیں۔ مقدس جو بدقسمت تصور کی جاتی ہے وہ اُن سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب تو ڈرامہ سیریل ''دل ہاری'' دیکھنے کے بعد ہی مل سکتا ہے۔ اس کے فنکاروں میں عابد علی، روبینہ

ہے انشال اسے پسند کرتی ہے جبکہ حمزہ کے والد شوکت مفاد پرست انسان ہیں۔ لالچی طبیعت کے مالک ہیں انشال کے والد فیروز صدیقی معاشی طور پر بہت خوشحال شخص ہیں۔ اُن کی دولت سے متاثر ہو کر شوکت انشال کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ جسے حمزہ جو انشال کا کزن بھی ہے انکار کر دیتا ہے۔ یہاں شوکت اور بیٹے حمزہ میں اختلافات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوتا ہے یہ تو سیریل ''بابا کی

رانی'' سے ہی پتہ چلے گا اس کے فنکاروں میں عمار عرفانی' منور سعید' سعادیہ غفار' محمود اختر اور زیبا علی

قابل ذکر ہیں۔ یہ سیریل ہر منگل کی رات 8 بجے ARY زندگی سے دیکھائی جائے گی۔ سیریل ''بے در و دیوار گھر'' لڑکی گوہر کی کہانی ہے جس کی شادی سرمد سے ہوجاتی ہے اور خوشیاں ہر وقت اُس کے قدموں میں بکھرتی پھرتی ہیں اور پھر سرمد ایک دن انجانی گولی کا شکار بن جاتا ہے اور اس کے بعد گوہر کی زندگی میں وحشت اور سناٹوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ بوڑھی ساس گوہر کو بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے مشورہ دیتی ہے کہ سرمد کے عزیز محسن سے شادی کرلے۔ بس یہاں سے گوہر اور بوڑھی ساس میں سوچ کی جنگ شروع ہوتی ہے اس کے فنکاروں میں فیصل رحمان' جگن کاظم' میکال اور ذوالفقار شامل ہیں۔ اس کی ہدایت عثمان پیرزادہ نے جبکہ تحریر ثمینہ اعجاز کی ہیں۔ سیریل 'بے در و دیوار گھر' ہر بدھ کی رات 8 بجے دکھائی جائے گی۔ سیریل ''سوچا نہ تھا''

شفق ایک زندہ دل اور ہمت کا سامنا کرنے والی لڑکی ہے اور شفق اپنے کزن مرتضیٰ سے محبت کرتی ہے۔ مرتضیٰ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے جبکہ وہ اپنی بہنیں ذرا اور ندا سے بہت محبت کرتا ہے ندا شادی شدہ اور دو بیٹوں کی ماں ہے لیکن حالات کچھ اس طرح کروٹ بدلتے ہیں کہ ندا کے شوہر کا انتقال ہوجاتا ہے۔ یہاں سے کہانی کا رُخ بدل جاتا ہے اور کہانی کو اونچ نیچ کے بے شمار سامنے کرنے پڑھتے ہیں سیریل کو تحریر کیا ہے ثروت نذیر نے جبکہ ہدایت علی حسن کی ہیں۔ اس کے فنکاروں میں نور حسن' اقرا عزیز' اسد صدیقی' خالد انعم' صائمہ قریشی' سلمیٰ حسن شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر جمعرات کی رات 8 بجے ARY زندگی سے دکھائی جائے گی۔ سیریل ''انتقام'' کے فنکاروں میں اریج فاطمہ' وسیم عباس' حمیرا ظہیر' ندا خان' اعجاز اسلم' فرقان قریشی' گلاب چانڈیو' بشیر جان' اور نوید رضا شامل ہیں۔ سیریل ''انتقام'' کو تحریر کیا ہے محمد دلاور خان نے جبکہ ہدایت محسن مرزا کی ہیں۔ اس کی کہانی عائزہ کے گرد گھومتی ہے جو اپنے کلاس فیلو رمیز سے محبت کرتی ہے۔ رمیز کا تعلق سندھ کے ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ عائزہ کا باپ عثمان قدامت پسند اور مذہبی خیالات کا حامل آدمی ہے۔ اور وہ اپنے ایک رشتے دار کے بیٹے صارم سے عائزہ کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ رمیز کو جب یہ پتہ چلتا ہے تو وہ عثمان سے عائزہ کے رشتے کے سلسلے میں اُس سے ملاقات کرکے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ عثمان اُسے انکار کردیتا ہے یہاں سے عائزہ کی زندگی کے کڑوے دنوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اب مسائل عائزہ' صارم' عثمان اور رمیز کے درمیان گھومتے ہیں۔ سیریل ''انتقام'' ہر اتوار کی رات 8 بجے ARY زندگی سے دکھائی جائے گی۔

☆☆......☆☆

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

کوا چلا ہنس کی چال

پریانکا چوپڑا کے بعد اب جیکولین فرنینڈس بھی جلد امریکن Rapper پٹ بل کے گانے میں نظر آئیں گی وہ اس گانے کو لے کر بہت

ایکسائٹڈ بھی ہیں۔ اب جیکولین کو بھارت میں فلمیں تو مل نہیں رہیں۔ آئٹم سونگ سے گزارا ذرا مشکل ہے۔ لہٰذا West کے گانوں میں کام کرنے کا فیصلہ بہتر ہے شاید اس بہانے کوئی شو بھی مل جائے۔ شاید اسی کو کہتے ہیں کوا چلا ہنس کی چال......

خانوں کے خان

عامر خان کو پچھلے دنوں شیوسینا کی شدید مخالفت کا سامنا رہا تھا اور سلسلہ اب بھی جاری ہے مگر اس شدت سے نہیں۔ انڈیا میں عدم

برداشت بڑھ رہی ہے۔ اس بیان پر بیشتر ہندو چراغ پا ہو گئے تھے چاہے ان کا تعلق شیوسینا سے ہو یا بالی وڈ سے مگر کرینہ کپور عامر خان کی سپورٹ میں اس وقت بھی کھڑی تھیں اور اب بھی ان کا ساتھ دیتی نظر آتی ہیں اچھی بات ہے کرینہ، لیکن کہیں اس ساتھ کی وجہ آپ کے نام سے جڑا خان تو نہیں۔

چٹپٹی دپیکا

دپیکا پڈوکون آج کل امریکہ میں اپنی فلم کی

شوٹنگ میں مصروف ہیں۔ عام انسانوں کی طرح فلمی ستاروں کی بھی پسند اور ناپسند ہوتی ہے۔ اسی

طرح دپیکا کو بھی دیسی کھانا بہت پسند ہے اور اپنا پسندیدہ کھانا نہ ملنے کی وجہ سے ڈمپل ڈول بہت پریشان ہے۔ یقینا جلد ہی یہ خبر سننے کو ملے گی کہ دپیکا کے کسی فین نے بھارت سے دیسی کھانوں کی بڑی شپ منٹ بھجوادی۔

نازیہ حسن روشن ستارہ

اچھی خبر ہے کہ بالی وڈ کے مشہور ڈائریکٹر بہت جلد نازیہ اور زوہیب حسن کی زندگی پر فلم

بنانے والے ہیں۔ زوہیب حسن نے اس خبر کی تصدیق کی ہے مگر فلم کا نام اور بنانے والے کا نام راز میں رکھا ہے۔ اس فلم کی خاص بات نازیہ حسن کی زندگی کے وہ حقائق سامنے لانا ہیں جو اب تک ایک راز ہیں مگر نازیہ حسن کے چاہنے والے آج بھی منتظر ہیں کہ اس روشن ستارے کے بارے میں سب کچھ جان لیں جو وہ نہیں جانتے...... دکھ کی بات ہے مگر سچ ہے کہ نازیہ جیسی خوبرو اور خوش فکر انسان کی زندگی کے آخری چند سال بہت تکلیف دہ تھے۔ سب کی طرح ہماری بھی خواہش ہے کہ نوے کی دہائی کی اس بہترین سنگر پر بننے والی فلم جلد منظر عام پر آئے۔

شاباش عاطف اسلم

آج کل عاطف اپنے ایک میگا کنسرٹ کے سلسلے میں بھارت گئے ہوئے ہیں۔ صورت حال اس وقت انتہائی مضحکہ خیز ہوگئی جب پریس

کانفرنس میں آئے صحافیوں نے سنگر سے گانے کے بجائے سیاسی سوالات شروع کر دیے۔ یہ رویے بھارت میں عدم برداشت کو بہت بڑھاوا دے رہے ہیں مگر شاباش ہے ہمارے جوان پر

جس نے نہایت برداشت اور تحمل سے جوابات دیے اور بھارتی سنائی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہوٹل

میرا جی کی ڈائریکشن میں بننے والی فلم ''ہوٹل'' اگلے ماہ پردے پر نظر آئے گی۔ فلم بہت حساس موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ مگر کہانی ابھی

راز میں ہے۔ خیر بڑی خبر تو یہ ہے کہ میرا جی کیسے اس ذمہ داری کو نبھائیں گی۔

مالک

دھواں فیم عاشر عظیم کی تحریر کردہ اور پروڈکشن میں بننے والی فلم 'مالک' جلد ریلیز ہونے والی

ہے۔ عاشر جیسے ذہین انسان سے غیر معمولی اور تہلکہ خیز فلم کی امید ہے۔ فلم کا موضوع نہایت خوبصورت اور حب الوطنی سے سرشار ہے اور اس میں نام پاکستانی کے قد کو بہت اونچا کیا گیا ہے۔

عمران اور کرن جوہر

عمران عباس اپنی دو بالی وڈ فلموں کی ناکامی کے بعد اب پھر ٹی وی ڈراموں پر توجہ دے رہے ہیں مگر دل میں اب بھی بالی وڈ ہی ہے جبھی تو وہ کرن جوہر کی نئی آنے والی فلم میں ایک اور ربان اداکار انٹری دے رہے ہیں مگر ساتھ ساتھ وہ عائزہ خان کے ساتھ ایک نئی سیریل میں بھی مصروف ہیں۔

فواد خان کی کامیابیاں

پاکستانی سپر اسٹار فواد خان بالی وڈ کے آسمان پر پوری شان سے چمک رہے ہیں۔ اب انہوں نے ایک اور فلم سائن کر لی ہے جس میں ان کی

ہیروئن سونم کپور ہی ہوں گی۔ یہ فلم سونم کی بڑی بہن ریا کپور بنا رہی ہیں۔ مگر بولڈ سینز کی وجہ سے فواد نے پہلے انکار کر دیا تھا۔ سنا ہے اب وہ تمام سینز ہٹا دیے گئے ہیں۔ فواد اس کے علاوہ بھی کئی بالی وڈ فلمیں سائن کر چکے ہیں۔

روشنیاں

جاوید شیخ کی صاحبزادی مومل شیخ بھی آج کل بالی وڈ فلم ''ہیپی بھاگ جائے گی'' کی شوٹنگ میں مصروف ہیں۔ ان کے ہیرو ابھے دیول ہیں۔ کون کہتا ہے کہ بیٹیاں باپ کا نام روشن نہیں کرتیں۔ مومل تو جاوید شیخ کے راستے پر چل کر خوب روشنیاں بکھیر رہی ہیں۔

☆☆......☆☆

نادیہ طارق

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

تندوری ڈرم اسٹک

اجزاء

چکن ڈرم اسٹک	5 عدد
دہی	4 کھانے کے چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	3 کھانے کے چمچ
نمک	2 چائے کے چمچ
زیرہ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
کالی مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
ادرک لہسن پیسٹ	ڈیڑھ کھانے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا کھانے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
لال فوڈ کلر	حسب ضرورت
لیموں کا رس	2 کھانے کے چمچ
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چمچ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

سب سے پہلے چکن ڈرم اسٹکس کو اچھی طرح دھولیں اور اس پر چھری کی مدد سے کٹ لگالیں۔ ان چکن ڈرم اسٹکس کو ایک باؤل میں ڈال کر ان پر دو کھانے کے چمچ سرخ مرچ پاؤڈر، نمک، لیموں کا رس ڈال کر ان پر اچھی طرح لگائیں۔ اب دوسرے پیالے میں 4 کھانے کے چمچ دہی میں ایک کھانے کا چمچ سرخ مرچ پاؤڈر، کالی مرچ پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر، گرم مسالا، ہلدی پاؤڈر، لال فوڈ کلر، لیموں کا رس اور تھوڑا سا تیل ڈال کر مکس کریں اور چکن ڈرم اسٹکس پر لگا کر پوری رات یا 4 گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اوون کو 400 ڈگری پر پری ہیٹ کریں۔ ڈرم اسٹکس کو 20 سے 25 منٹ کے لیے اس میں رکھ دیں۔ جب ایک حصہ گل جائے تو دوسری طرف پلٹ دیں اور پکنے دیں یا پھر کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں چکن ڈرم اسٹک کو تل لیں۔ براؤن ہونے پر نکال لیں، تندوری چکن ڈرم اسٹکس تیار ہے۔ اگر اوون نہیں ہے تو چکن کو فرائی کرنے کے بعد گرل پین پر 10 منٹ کے لیے رکھ دیں یا اس کے لیے فرائنگ پین کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔

بیکڈ بریڈ کپ

اجزاء

ڈبل روٹی	6 سلائسز
بھٹے کے دانے	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
آلو درمیانہ	ایک عدد (چھوٹے ٹکڑے کرلیں)
ہری شملہ مرچ	آدھا چاپ کرلیں

لال شملہ مرچ	آدھا چاپ کرلیں
پیاز	ایک عدد
لہسن	دو جوے (کدوکش کرلیں)
سرخ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
ٹماٹو کیچپ	2 کھانے کے چمچ
نمک	حسب ضرورت
مکھن	حسب ضرورت
چیڈر چیز سلائسز	دو عدد

ترکیب:

اوون کو 180 ڈگری پر پری ہیٹ کرلیں۔ کپ کیک کی ٹرے کو مکھن لگا کر گریس کرلیں، ایک فرائنگ پین میں پیاز ڈالیں اسے فرائی کرنے کے بعد ہری اور لال شملہ مرچ ڈالیں جب یہ چیزیں گل جائیں تو اس میں لہسن، بھٹے اور چاپ کیے ہوئے آلو ڈال دیں، تیز آنچ پر فرائی کریں دو منٹ بعد سرخ مرچ پاؤڈر ٹماٹو کیمپ ڈال کر مکس کریں، پھر چولہے سے اُتار کر ٹھنڈا کریں۔ ڈبل روٹی کے سلائسز کے کناروں کو کاٹ دیں، پھر ان کو گریس کیے ہوئے کپ کیک کے پین میں رکھ دیں۔ اس طرح کہ کپ کی شکل میں ہو۔ اس پر تیل کا اسپرے کریں۔ ایک چمچ تیار فلنگ ان کپ میں بھر دیں، آخر میں چیڈر چیز کے سلائسز کو اپنی مرضی کے شیپ میں کاٹ کر بریڈ کپ کے اوپر پھیلا دیں۔ ان بریڈ کپس کو پری ہیٹ اوون میں دس منٹ کے لیے رکھ دیں، جب ڈبل روٹی سخت اور چیز پگھل جائے تو اوون سے نکال لیں۔ ان بیکڈ بریڈ کپ کو چائے کے ساتھ نوش کریں۔

کھجور املی کی چٹنی

اجزاء

املی	ایک کپ
کھجور	25 عدد
کشمش	3 کھانے کے چمچ
ادرک	دو کھانے کے چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچ
زیرہ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
کالا نمک	ایک کا چمچ
نمک	ایک چائے کا چمچ
چینی	ایک چوتھائی کپ

ترکیب:

املی اور کھجور میں سے گٹھلیاں الگ کرلیں۔ املی کو ایک کپ پانی میں آدھے گھنٹے کے لیے بھگو دیں۔ جب وہ نرم ہو جائے تو دیگچی میں کھجور اور املی کو دو کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر چڑھا دیں۔ جب تقریباً آدھا پانی خشک ہو جائے تو چولہے سے ہٹا دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو ہاتھ والے بلینڈرز یا پھر کانٹے کی مدد سے اس پیسٹ کو اچھی طرح میش کرلیں، پھر اسے چھلنی سے گزاریں۔ اس پیسٹ میں کشمش اور ادرک ڈالیں اور پھر ہاتھ والے بلبلینڈر سے بیٹ کریں، ساتھ ہی چینی، نمک، سرخ مرچ پاؤڈر زیرہ اور گرم مسالا پاؤڈر اور کالا نمک ڈال کر مکس کریں۔ اگر چٹنی گاڑھی ہے تو اس میں ایک کپ پانی ڈال لیں۔ مزیدار کھجور املی کی چٹنی تیار ہے۔

بیف چلی ویجیٹیبل

اجزاء

گائے کا گوشت (بغیر ہڈی)	ایک پاؤ
پیسا ہوا لہسن ادرک	دو چائے کے چمچ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچ
کُٹی ہوئی لال مرچ	ایک چائے کا چمچ

ثابت لال مرچیں	پانچ عدد
سفید مرچیں (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچ
پیاز	ایک عدد
شملہ مرچ	دو عدد
ہری مرچیں	تین عدد
کارن فلور	دو کھانے کے چمچ
انڈہ	ایک عدد
یخنی	ایک پیالی
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	حسبِ ضرورت

ترکیب:

پیالے میں ایک کھانے کا چمچہ کارن فلور، انڈہ، نمک اور سفید مرچ کا آمیزہ تیار کرلیں۔ اس آمیزے میں گوشت کے پارچے ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے اس میں گوشت کے ٹکڑے ایک ایک کر کے ڈالیں اور سنہری ہونے پر نکالتے جائیں۔ شملہ مرچ، ہری مرچیں اور پیاز ایک جیسے سائز میں پتلی پتلی کاٹ لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے اس میں پسا ہوا لہسن ادرک شامل کر کے بھونیں۔ لہسن ادرک بھن جائے تو اس میں تلا ہوا گوشت، کٹی ہوئی سبزیاں، کُٹی ہوئی لال مرچ، ثابت لال مرچیں اور سویا ساس ڈال دیں۔ دیگچی میں یخنی شامل کریں اور جب اُبال آنے لگے تو پون پیالی پانی میں ایک کھانے کا چمچہ کارن فلور گھول کر اس میں شامل کر دیں۔ کارن فلور کا آمیزہ ڈالنے کے دوران چمچہ چلاتے رہیں، جب سالن گاڑھا ہو جائے تو ڈش میں نکال لیں اور گرم گرم پیش کریں۔

تلا ہوا مایو مرغی

اجزاء:

مرغی کا سینہ	دو عدد
مایونیز	چار کھانے کے چمچے
پسا ہوا لہسن	دو کھانے کے چمچ
انڈے	پانچ عدد
ڈبل روٹی کا چورا	دو پیالی
کارن فلور	تین کھانے کے چمچے
میدہ	تین کھانے کے چمچے
نمک	حسبِ ذائقہ
کُٹی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی کالی مرچ	آدھا کھانے کا چمچ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

مرغی کے سینے کے دو حصے بنالیں۔ یہ ٹکڑے موٹے ہونے چاہئیں۔ انہیں درمیان سے کاٹ کر کھول لیں۔ ایک پیالے میں نمک، پسا ہوا لہسن، کُٹی ہوئی لال مرچ، پسی ہوئی کالی مرچ اور دو انڈے ڈال کر اچھی طرح سے ملائیں۔ اس آمیزے کو اچھی طرح سے مرغی کے ٹکڑوں پر لپیٹیں۔ اس میں میدہ اور کارن فلور ڈال کر اچھی طرح سے ملالیں۔ ایک پلیٹ میں ڈبل روٹی کا چورا لے لیں اور تین انڈے ایک پیالے میں پھینٹ لیں۔ مرغی کے ہر ٹکڑے کو کھول کر اس کے درمیان میں ایک کھانے کا چمچہ مایونیز بھریں۔ اس ٹکڑے کو ڈبل روٹی کے چورے میں لپیٹیں پھر اسے انڈے میں لپیٹیں اور ایک بار پھر ڈبل روٹی کے چورے میں لپیٹیں۔ ایک پین میں تیل گرم کر کے مرغی کے ٹکڑے اس میں ڈالیں۔ چولہے کی آنچ درمیانی کر کے ڈھکن ڈھانک دیں۔ جب مرغی کے ٹکڑے بادامی رنگ کے ہو جائیں تو انہیں ڈش میں نکال لیں، درمیان سے کاٹ کر پیش کریں۔

☆☆......☆☆